خوددار
مرزا امجد بیگ
(ایڈووکیٹ)

قانونی پیچیدگیاں، عدالتی کارروائی کے اہم رموز و نکات

زن، زر اور زمین کے تنازعوں سے جنم لینے والے مقدمات

خوددار

راوی: مرزا امجد بیگ (ایڈووکیٹ)

تحریر: حسام بٹ

القریش پبلی کیشنز

ملک جلال دین (وقف) ہسپتال بلڈنگ، سرکلر روڈ، چوک اردو بازار۔ لاہور۔ فون: 7668958

معیاری اور خوبصورت کتابیں
باہتمام........محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

باراوّل ———— 2008ء
مطبع ———— نیراسد پریس
ڈیزائن ———— ذاکر
کمپوزنگ ———— کلائمکس گرافکس
قیمت ———— -/120 روپے

ترتیب

ایک بٹا دو ———————— 5

آتش بدن ———————— 65

خود دار ———————— 124

حساب برابر ———————— 181

ایک بٹا دو

جس طرح بعض لوگ اسم بامسمیٰ ہوتے ہیں ویسے ہی میں نے اس کی شکل دیکھی تو ذہن میں اس کے لئے ''احمق الاحمقین'' کے الفاظ چمک اٹھے۔ بعد ازاں وہ میرے اندازے پر صد فی صد پورا بھی اُترا۔ بہرحال میں نے پیشہ وارانہ مسکراہٹ سے آنے والے کا استقبال کیا اور خوش اخلاقی سے اسے بیٹھنے کو کہا۔

وہ میری میز کے سامنے رکھی کرسیوں میں سے ایک کو کھینچ کر ہچکچاہٹ آمیز انداز میں اس پر براجمان ہو گیا۔ اس چھوٹے سے کام کے لئے اس نے اتنی احتیاط کا مظاہرہ کیا جیسے وہ چوبی کرسی نہ ہو بلکہ ایٹم بم ہو جو اس کے تشریف رکھتے ہی ایک خوفناک دھماکے سے پھٹ جائے گا۔

میں اس کے اسٹائل پر دل ہی دل میں مسکرا اٹھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور اس کی آمد کی غرض و غایت دریافت کی۔ جواب دینے کی بجائے وہ بے یقین سے لہجے میں مستفسر ہوا۔

''وکیل صاحب آپ ہی ہیں نا؟''

اس کی صورت تفریح کی دعوتِ عام تھی۔ میری زبان بھی تھوڑی سی پھسل گئی۔ میں نے گہری سنجیدگی کی اداکاری کرتے ہوئے پوچھا۔

''کون سے وکیل صاحب؟''

''وہ ــــــ وہ جن کا یہ دفتر ہے؟'' اس نے اپنے تئیں وضاحت کی۔

میں نے کہا۔ ''یہ دفتر تو میرا ہی ہے اور میں ایک وکیل بھی ہوں۔''

''اچھا، اچھا۔'' اس نے بڑی شدت سے اثبات میں گردن کو متعدد جھٹکے دے ڈالے پھر بولا۔ ''اس کا مطلب میں آپ ہی سے ملنے آیا ہوں۔''

''جی ہاں۔'' میں نے گہری نظر سے اسے دیکھا۔ ''مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے۔''

''آپ کا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''میں نے دفتر کے باہر آپ کے نام کی تختی تو دیکھی تھی لیکن ذہن سے نکل گیا ــــــ'' بات کو ادھورا چھوڑ کر اس نے اپنے سر کو دونوں

ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیا۔

انداز ایسا ہی تھا جیسے اس کے ذہن سے میرا نام نہ نکلا ہو بلکہ کھوپڑی میں سے ذہن نکل جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہو ـــــ اور ذہن کے مفرور ہونے سے پہلے ہی اس نے بڑی حفاظت کے ساتھ اپنے سر کو تھام لیا ہو۔ میں نے اس شخص پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے۔ اگر انسان کے ذہن میں بہت زیادہ غیر متعلق چیزیں بھری ہوئی ہوں تو ذہن اس قسم کی بغاوت کر جاتا ہے۔'' میں نے دانستہ ''فضول'' کے بجائے ''غیر متعلق'' کے الفاظ استعمال کئے تھے۔ ''بہر حال ـــــ میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔''

''آپ نے نام بھی تو اتنا لمبا چوڑا رکھا ہوا ہے نا۔'' وہ آنکھیں سکوڑ کر اور زیر لب مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''نام میری طرح کا ہونا چاہئے ـــــ امین!''

میں نے نام کے مختصر یا طویل ہونے کے سلسلے میں اس سے کوئی بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔ ''امین صاحب! بتائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

جملہ مکمل کرتے ہی میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا۔

مدعا بیان کرنے کی بجائے وہ تنقیدی نظر سے میرا اور میرے چیمبر کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے انداز سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے کسی خاص شے کی تلاش ہو یا پھر وہ کسی حوالے سے اپنی تسلی کرنا چاہتا ہو۔ میں صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی حرکات کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔ ایک ڈیڑھ منٹ میں اس کی تشفی ہو گئی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

''میں مطمئن ہو گیا ہوں۔ مجھے یقین ہو گیا ہے، آپ میرا مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔''

اس کا یہ فیصلہ کن جملہ ایسا بے سروپا تھا کہ میں جھنجلاہٹ میں مبتلا ہو گیا۔ قدرے بیزاری سے میں نے کہا۔

''امین صاحب! اب آپ اپنا مسئلہ بھی بیان کر ہی دیں تو مہربانی ہو گی۔''

''مسئلہ فرزانہ کا ہے۔'' اس نے پراسرار انداز میں بتایا۔

''فرزانہ ـــــ یہ کون محترمہ ہیں؟''

''فرزانہ میری بیوی ہے مرزا ـــــ؟'' وہ میرے نام کو یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ۔'' میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ مجھے صرف مسٹر بیگ یا بیگ صاحب بھی کہہ سکتے ہیں۔''

''اللہ آپ کا بھلا کرے بیگ صاحب!'' وہ ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''تو میں آپ کو بتا رہا تھا، میری بیوی فرزانہ نے مجھے بڑی مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ میں اس کی وجہ سے سخت پریشان ہوں۔ آپ میرے مسئلے کو حل کر دیں تو آپ کا یہ احسان میں زندگی بھر یاد رکھوں گا۔''

''یہ احسان تو میں اس وقت کر پاؤں گا جب آپ مجھے اس کا موقع دیں گے۔'' میں نے زچ ہوتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''اور ایسا موقع نکلے گا اس وقت جب آپ مجھے اپنے مسئلے سے آگاہ کریں گے۔''

وکالت کے پیشے میں بھانت بھانت کے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے اور ان میں بعض امین جیسے باتونی اور موضوع سے کھسکے ہوئے افراد بھی ہوتے ہیں۔ بہر حال یہ تو اس پیشے کا حصہ ہے۔ ہر شخص کو اس کے لیول پر برداشت کرنا پڑتا ہے ____ سو، اس وقت میں یہی کر رہا تھا۔

امین نامی اس شخص کی عمر پچپن کے اریب قریب رہی ہوگی۔ قد درمیانہ اور جسمانی صحت انتہائی مخدوش۔ ذہنی صحت کا اندازہ اس کی بات چیت سے بہ خوبی ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی عمر کو چھپانے کے لئے سر اور مونچھوں کے بالوں کو کسی گھٹیا خضاب میں رنگ رکھا تھا لیکن یہ کوشش بری طرح ناکام نظر آتی تھی کیونکہ اول تو اس غیر معیاری اور سستے خضاب نے اپنے غیر فطری رنگ کے باعث اس چوری کی قلعی کھول دی تھی۔ دوم، ایک دن کے شیو نے سونے پر سہاگہ والا کام کر دکھایا تھا۔ چہرے پر شیو کی جگہ ایک دن عمر کے جو بال نمودار ہو چکے تھے وہ سر کے بالوں کے مقابلے میں ''اندھیرا اُجالا'' کی سی کیفیت پیدا کر رہے تھے۔ ایسے لوگوں کو روزانہ نہایت پابندی کے ساتھ داڑھی مونڈنا چاہئے یا پھر منافقت سے باز آ جانا چاہئے، بصورت دیگر دورنگی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ اس بلیک اینڈ وہائٹ موی کو برداشت کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے ____ کم از کم میرے سامنے بیٹھا ہوا امین نامی وہ شخص ایسا دل گردے والا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

''مسئلہ بہت سیدھا سا ہے بیگ صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''لیکن محلے والوں نے اسے ٹیڑھا بنا دیا ہے۔''

میں نے محسوس کیا، وہ ایک مرتبہ پھر پٹڑی سے اُترنے جا رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اسے سنبھالا دیا اور ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔

''ایک منٹ امین صاحب! آپ مجھے اپنی بیوی فرزانہ کا مسئلہ بتانے والے تھے۔ بیچ میں

یہ محلے والے کہاں سے ٹپک پڑے؟ پلیز! آپ اپنی بیوی فرزانہ کی بات کریں تو آپ کا اور میرا قیمتی وقت محفوظ رہے گا۔"

"محلے والوں کا ذکر کئے بغیر فرزانہ کے مسئلے کی وضاحت نہیں ہوسکتی بیگ صاحب!" وہ کسی ڈبیٹر کے سے انداز میں بولا۔"ان نامراد محلے والوں نے ہی ہمارا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ یہ لوگ میری بیوی کو بہت تنگ کرتے ہیں۔ جب فرزانہ پریشان ہوتی ہے تو لامحالہ مجھے بھی پریشان ہونا پڑتا ہے۔ آپ میرے مسئلے کو حل کر دیں تو ہم دونوں میاں بیوی آپ کو بہت دعائیں دیں گے۔"

بات ختم کرتے ہوئے اس کے لہجے میں زمانے بھر کی یتیمیت اور مسکینیت شامل ہوگئی۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ امین سے ہونے والی اب تک کی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ تو بہ خوبی ہو گیا تھا، ان تلوں میں تیل کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے۔ وہ میرے لئے کسی "کیس" کی صورت اختیار نہیں کرسکتا۔ لیکن یہ سوچتے ہوئے کہ جہاں پندرہ بیس منٹ برباد کئے ہیں، مزید دس منٹ نکال کر اگر میں اس شخص کی بپتا سن لوں تو ممکن ہے، اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے!

میں نے امین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"میں آپ کی بات پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔ آپ اپنا مسئلہ بیان کر ڈالیں۔"

وہ شخص صورت سے جیسا دکھائی دیتا تھا، اپنا مسئلہ بیان کرتے ہوئے اُس نے خود کو ویسا ثابت بھی کر دکھایا۔ اس نے بڑے سنجیدہ الفاظ میں مجھے بتایا کہ اس کے محلے دار اس کی بیوی فرزانہ کو مذاق کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ ایک ساتھ باہر نکلیں یا فرزانہ اکیلی کہیں جائے، وہ لوگ انہیں چھیڑنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ طرح طرح کے جملے اور آوازے کستے ہیں۔ اس صورتِ حال نے ان کا جینا دوبھر کر رکھا ہے ــــــ وغیرہ۔

اس کا مسئلہ سن کر مجھے غصہ بھی آیا اور اس کی حالت پر سخت افسوس بھی ہوا اور اس حوالے سے اس کی عقل پر ماتم کرنے کو بھی جی چاہا کہ وہ ایک معمولی سے معاشرتی مسئلے کے لئے بطور وکیل میری خدمات حاصل کرنے میرے دفتر پہنچ گیا تھا۔ اس مسئلے کو باہمی افہام وتفہیم یا محلے کے کسی "بڑے" کی مدد سے بہ آسانی حل کیا جا سکتا تھا۔ اس حوالے سے میں نے جب اس سے استفسار کیا تو بڑے مجبور سے لہجے میں بولا۔

"میں نے ایسی کوشش کی تھی لیکن کوئی میری بات سننے کو تیار نہیں۔"

میں نے برسبیل تذکرہ پوچھ لیا۔"تمہاری رہائش کراچی کے کس علاقے میں ہے؟"

اس نے نیو کراچی کے ایک ایریا کا نام بتایا۔

''اور تم کرتے کیا ہو ـــــ میرا مطلب ہے تمہارا ذریعہ معاش کیا ہے؟''

''میں ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازم ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس کمپنی کا دفتر میکلوڈ روڈ پر ہے۔''

نیو کراچی اور میکلوڈ روڈ (آئی آئی چندریگر روڈ) میں میلوں کا فاصلہ حائل ہے۔ میں نے سوچا، جب وہ دفتر میں ہوتا ہوگا تو محلے والے اس کی بیوی کو کچھ زیادہ ہی چھیڑتے ہوں گے۔ اسی تناظر میں، میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''تم دونوں میاں بیوی کے علاوہ گھر میں اور کتنے افراد ہیں؟''

''کوئی بھی نہیں۔'' وہ مایوسی سے بولا۔ ''ہماری شادی کو ابھی ایک سال ہوا ہے۔ اولاد وغیرہ کی طرف سے بھی کوئی خوش امیدی نظر نہیں آتی۔''

اس کی شادی کے عرصے کا سن کر مجھے شدید حیرت ہوئی۔ وہ پچپن اور ساٹھ کے درمیان تھا۔ میری شدید حیرت کا اصل سبب اس کی عمر سے زیادہ اس کی مخدوش صحت تھی۔ کوئی بھی معقول آدمی اس قسم کی ''صورتِ حال'' میں شادی بیاہ کے بارے میں سوچنے کی حماقت نہیں کرتا۔ پھر میرے ذہن میں آیا کہ ممکن ہے، اس نے اپنی ہی عمر کی کسی بڑی بی سے بیاہ رچالیا ہو۔ اپنی تسلی اور تصدیق کے لئے میں نے وضاحت ضروری جانی اور امین سے پوچھ لیا۔

''آپ کو اس عمر میں شادی کی کیا سوجھی؟''

''اس عمر میں ـــــ کیا مطلب؟'' وہ بھڑک اٹھا۔ ''آپ کے خیال میں میری عمر اس وقت کتنی ہوگی؟'' الٹا اس نے مجھ ہی سے سوال کر ڈالا۔

میں نے محتاط روی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہی کوئی پچاس، باون سال۔''

میری احتیاط اس کے بھڑکنے کے سبب تھی۔ میں خوامخواہ اس کے جذبات کو مجروح نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس نے میرے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ میری محنت رائیگاں گئی۔

اس نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔

''وکیل صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں ـــــ کیا میں آپ کو پچاس سال کا نظر آتا ہوں؟''

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے جو نظر آرہا ہے وہی بیان کیا ہے۔ اگر آپ کو میرا بیان ناگوار گزرا ہو تو مجھے افسوس ہے۔''

''کوئی بات نہیں ـــــ'' وہ بے پروائی سے بولا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے بڑی فراخ دلی سے

اس نے مجھے معاف کر دیا ہو۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔ ''میں بتاتا ہوں آپ کو۔ دراصل میری عمر اس وقت پینتالیس سال ہے۔ لیکن میں پینتیس سے زیادہ کا نہیں لگتا۔''

بات ختم کرتے ہی وہ داد طلب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس خوش فہم شخص کو بڑی چٹخارے دار پیش کرنے کو جی تو بہت چاہا لیکن میں نے اپنی خواہش کو دبا دیا۔ اس کے لئے شروع میں میرے دل میں جو ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے تھے وہ اب رفتہ رفتہ کوفت میں بدلتے جا رہے تھے۔ مجھے اس کی سوچ نارمل نہیں لگی۔ وہ کسی نفسیاتی عارضے میں مبتلا تھا۔ میں نے جلے کٹے انداز میں پوچھا۔

''اور ـــــ جس بیوی کی وجہ سے آپ پریشان ہیں اس کی عمر بھی بتا دیں؟''

میں اسے اپنے دفتر سے رخصت کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا، اس پچپن ساٹھ سالہ شخص نے ایک سال پہلے جس عورت سے شادی کی ہے وہ اپنی زندگی کی کس منزل پر کھڑی ہے تا کہ یہ اندازہ قائم کیا جاسکے کہ کس کے کرم سے کس کے نصیب پھوٹے ہیں۔

اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''فرزانہ تیس اور پینتیس کے درمیان ہے'' پھر سینہ نما ہڈیوں کے ایک ضعیف سے پنجر کو بڑے فخریہ انداز میں پھلاتے ہوئے بولا۔ ''بیوی کو شوہر سے کم از کم دس سال ضرور چھوٹا ہونا چاہئے۔ اس طرح وہ رعب میں رہتی ہے۔''

اس کے فلسفے کو زیر بحث لانا تو دور کی بات ہے، میں اس پر لمحاتی غور کو بھی وقت کا زیاں سمجھ رہا تھا۔ اس شخص نے اپنی احمقانہ موشگافیوں سے جس قدر میرا وقت برباد کر دیا تھا وہی کافی تھا لہٰذا میں نے جان چھڑانے کی غرض سے کہہ دیا۔

''ٹھیک ہے امین صاحب! میں نے آپ کی پریشانی کی کہانی تو سن لی۔ اب یہ بھی فرمائیں کہ اس سلسلے میں، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''یہ فیصلہ تو آپ کریں گے۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''قانون کی ساری کتابیں تو آپ نے پڑھ رکھی ہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ کوئی ایسا قانونی چکر چلائیں کہ محلے والے ایک دم بندے دے پُتر بن جائیں۔ تا کہ ہم بھی سُکھ کا سانس لے سکیں۔''

''آپ نے فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا ہے تو پھر توجہ سے میری بات سنیں ـــــ'' میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ اپنے مسئلے کے حل کے لئے بالکل غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔''

''جی ـــــ'' اُس نے بے یقینی سے آنکھیں سکوڑ کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا ہوں بیگ صاحب!''

میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''آپ کو کسی وکیل کے پاس آنے کی بجائے سیدھا اپنے علاقے کے پولیس اسٹیشن جانا چاہئے۔ وہی لوگ آپ کے مسئلے کو ٹھیک کر سکتے ہیں۔''

''میں وہاں بھی گیا تھا۔'' اس نے سٹپٹائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ ہی کے جیسے کسی شریف آدمی نے مجھے تھانے جانے کا مشورہ دیا تھا۔'' وہ لمحہ بھر کو متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میں جا کر تھانہ انچارج سے ملا اور اسے اپنے مسئلے سے آگاہ کیا۔ اس نے بڑی غیر سنجیدگی سے میری بات سنی۔ (میں نے دل میں کہا، تھانے دار نے گویا بڑی سمجھ داری کا ثبوت دیا) مجھے اس کے رویے پر غصہ تو بہت آیا مگر ظاہر ہے میں ایک کمزور سا آدمی تھانہ انچارج کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا اس لئے منت عاجزی سے کام لیا۔ اس کے جواب میں تھانے دار نے کہا ——— ٹھیک ہے، میں نے تمہاری شکایت سن لی ہے۔ میں اپنے کسی بندے کو بھیج کر انکوائری کراؤں گا۔ اگر تمہارا بیان درست نکلا تو میں تمہاری شکایت دور کرنے کا بندوبست کر دوں گا۔''

''پھر تھانہ انچارج نے انکوائری کروائی؟'' وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوا تو میں نے استفسار کیا۔

اس نے برا سا منہ بنایا اور زہریلے لہجے میں بولا۔ ''ہاں کروائی ——— بہت ہی واہیات انکوائری کروائی تھی اس نے۔ جس روز میں نے تھانے میں شکایت درج کروائی اسی رات لگ بھگ دس بجے ایک اے ایس آئی معاملے کی تفتیش کرنے کے لئے ہمارے گھر پہنچا۔ اس نے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا کہ وہ ہمارے دروازے پر دستک دینے سے پہلے محلے میں گھوم پھر کر صورتِ حال کا اندازہ لگا چکا ہے اور اس نے چند بے ہودہ افراد کی فہرست بھی تیار کر لی ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد وہ ہمارا مسئلہ حل کر دے گا۔

اس کی بات سن کر مجھے دلی خوشی ہوئی۔ کیونکہ اس نے بڑے مضبوط لہجے میں مجھے یقین دہانی کرائی تھی۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے اس کی باتوں میں دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''ہونا کیا تھا وکیل صاحب!'' وہ زہر خند لہجے میں بولا۔ ''سمجھیں کچھ بھی نہیں ہوا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے گھورا۔

وہ ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا۔

''تھانے دار کا بھیجا ہوا تفتیشی اے ایس آئی روزانہ رات کو ہمارے گھر کے چکر کاٹنے لگا۔ وہ گھنٹہ، آدھا گھنٹہ گھر میں بیٹھتا، کھاتا پیتا اور جلد ہی ہمارے مسئلے کو حل کرنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو جاتا۔ ہم حسب توفیق اس کی ظاہرہ اور خفیہ ''خدمت'' کر رہے تھے۔ اس کا ایک

پھیرا سو پچاس سے کم میں نہیں پڑتا تھا۔ میں کسی بھی طرح اپنا مالی اور اناجی نقصان برداشت کر رہا تھا کہ مجھے پتہ چلا، اس اے ایس آئی نے میری غیر موجودگی میں دن کے وقت بھی گھر میں پھیرا لگانا شروع کر دیا ہے۔ اے ایس آئی کی یہ حرکت بد اخلاقی کے زمرے میں آتی تھی۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ پھر ایک رات میں نے تھانہ انچارج سے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا اور دفتر سے سیدھا تھانے پہنچ گیا۔ میں نے اے ایس آئی کی حرکات کی شکایت کی تو تھانے دار الٹا مجھ پر گرم ہو گیا۔ آنکھیں دکھاتے ہوئے بولا۔

''میاں! تفتیشی افسر نے انکوائری مکمل کرنے کے بعد مجھے رپورٹ دے دی ہے۔ محلے والوں سے زیادہ قصور خود تمہاری بیوی کا ہے۔ میں ایک عورت کی خاطر محلے کے دس، بیس افراد کو گرفتار کر کے حوالات میں بند تو نہیں کر سکتا۔ یہاں تو اتنی گنجائش بھی نہیں ہے۔'' وہ لمحہ بھر کو رکا، تھوڑا سوچا پھر مشورہ دینے والے انداز میں بولا۔

''تمہارے مسئلے کا فی الحال مجھے ایک ہی حل نظر آ رہا ہے۔ میری مانو تو، یا تو تم اس محلے ہی کو چھوڑ دو ــــــ اور یا پھر بیوی کو۔''

''میں منہ کھول کر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے تھانے دار سے ایسے واہیات جواب کی توقع نہیں تھی۔ بہر حال، میں وہاں سے اٹھا اور اپنے گھر آ گیا۔ یہ دو روز پہلے کا واقعہ ہے ــــــ اور اب میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔''

امین نے متعلقہ تھانہ انچارج اور اس کے مقرر کردہ انکوائری آفیسر کے بارے میں جو کچھ مجھے بتایا تھا وہ انتہائی افسوس ناک تھا۔ اگر اے ایس آئی کی تفتیش کسی حد تک درست بھی تھی تو بھی اسے ایسے الفاظ کا استعمال نہیں کرنا چاہئے تھا۔ بات ختم کر کے وہ پُر اُمید نظر سے مجھے دیکھنے لگا تو میں نے پُر خلوص لہجے میں کہا۔

''اگر تم کہو تو میں تمہارے علاقے کے تھانہ انچارج سے بات کرتا ہوں۔''

''کیا بات؟'' اس نے بدکے ہوئے انداز میں استفسار کیا۔

میں نے کہا۔ ''یہی کہ وہ تمہارے مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرے اور ہر صورت میں اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرے۔''

اس نے بڑی بے یقینی اور گھائل نظروں سے مجھے دیکھا لیکن خاموش رہا۔

میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

''اگر میں تھانہ انچارج سے بات کروں گا تو ویسا کچھ نہیں ہو گا جیسا بقول تمہارے، پہلے ہوا ہے۔ اس قسم کے خدشات کو ذہن سے خارج کر دو۔''

چند لمحات تک گہرے تذبذب میں مبتلا رہنے کے بعد اس نے قدرے شکستہ لہجے میں کہا۔

''میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ میرے لئے کچھ نہیں کریں گے؟''

''میں جو کچھ کر سکتا ہوں وہی کر رہا ہوں۔'' میں نے خلوصِ نیت سے کہا۔ ''میرے متحرک ہونے کے بعد تھانہ انچارج ان افراد کے خلاف کارروائی کرنے پر مجبور ہو جائے گا جو تمہاری بیوی کو تنگ کرتے ہیں، اس پر آوازے کستے ہیں اور آتے جاتے سیٹیاں بجاتے ہیں۔''

وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے، آپ پولیس کو اس معاملے میں نہ ہی ڈالیں تو اچھا ہے۔ میں نے سنا تھا، پولیس والے بڑے برے ہوتے ہیں مگر ذاتی تجربے سے میں پہلی مرتبہ گزر رہا ہوں۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر ملتجیانہ انداز میں بولا۔ ''بیگ صاحب! آپ مجھے ٹالنے کی کوشش نہ کریں ـــــ پلیز!''

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔ ''امین صاحب! اپنی بیوی کے بارے میں، آپ کا کیا خیال ہے؟''

یہ سوال کرتے ہوئے میرے ذہن میں کوئی واضح مقصد نہیں تھا۔ پتہ نہیں، اس نے میرے اس استفسار سے کیا مطلب لیا، بڑی سادگی سے بولا۔ اس سادگی میں بے بسی بھی شامل تھی۔

''میں یہ محسوس کرتا ہوں جیسے میں نے کسی مرد سے شادی کر لی ہو۔''

''آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

وہ اپنی ہی رو میں کہتا چلا گیا۔

''فرزانہ میں عورتوں والی کوئی بات ہی نہیں۔ سارے شوق مردوں والے ہیں۔ صفائی ستھرائی، کھانے پکانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہمارے گھر میں اکثر بازار سے کھانا آتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ مجھے آنکھیں دکھانے لگتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں اس کی بیوی ہوں۔ پہلے میری تنخواہ مہینہ بھر چلتی تھی بلکہ تھوڑی بہت رقم میں پس انداز بھی کر لیا کرتا تھا۔ لیکن اس ہوٹل بازی نے میرا ہاتھ بہت تنگ کر دیا ہے۔ پندرہ دن کے بعد جیب خالی ہو جاتی ہے۔ باقی کے دن قرض ادھار کر کے مہینہ پورا کرنا پڑتا ہے۔ میں آپ کو بتاؤں ـــــ''

''تم اپنی بیوی کو ان فضول خرچیوں کے لئے سمجھاتے کیوں نہیں ہو؟'' میں نے دانستہ قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

مجھے سخت اندیشہ تھا کہ اگر میں نے مداخلت کی تو وہ کوئی طولانی قصہ چھیڑ بیٹھے گا۔ حالانکہ میں اس سے یہ بھی پوچھ سکتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے، اس نے میاں بیوی کے مابین عمروں کے

ضروری تفاوت کے سلسلے میں جو فلسفیانہ دعویٰ کیا تھا وہ کیا ہوا؟ اس دعوے کے مطابق تو فرزانہ کو اس سے دب کر، ڈر کر اور سہم کر رہنا چاہئے تھا۔ میں نے اس موضوع کو چھونے کی کوشش بھی نہیں کی اور خاموش رہا۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے کہا۔ ''میں نے بہت سمجھایا ہے اسے ــــــ اور اس نے اس مسئلے کا حل بھی نکال لیا ہے۔'' وہ لمحہ بھر کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''وہ کہتی ہے، اگر میری تنخواہ پوری نہیں پڑ رہی تو وہ جاب کر لیتی ہے۔ مجھے بتائے بغیر وہ ایک دو جگہ انٹرویو بھی دے آئی تھی۔ وہ تو میں ہی اڑ گیا ورنہ جاب تو پکی تھی اس کی ــــــ آپ بتائیں وکیل صاحب! میں یہ کیسے برداشت کر سکتا ہوں کہ وہ دس مردوں کے بیچ بیٹھ کر نوکری کرے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی نا۔''

یہ بہت ہی اچھی بات ہے کہ کسی بھی گھر کا کفیل، کفالت کے سلسلے میں اتنا مضبوط ہو کہ اس گھر کی کسی عورت کو معاشی مجبوری کے تحت ملازمت کی خاطر گھر سے نہ نکلنا پڑے۔ لیکن ہر گھر کے معاشی حالات ایک جیسے نہیں ہوتے۔ جہاں ضرورت، حقیقت بن کر گھر کے در و دیوار کو جھنجھوڑ رہی ہو وہاں گھر کے معاشی ذمے دار کو لنگڑی غیرت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے اپنی کمزوریوں پر غور کرنا چاہئے۔ فی زمانہ، پیسے کے بغیر کسی بھی گھر میں کوئی خوشحالی نہیں آ سکتی ــــــ اور پیسہ کمانے کے لئے گھر سے نکلنا پڑتا ہے۔ گھر کے مرد اگر کسی بھی سبب اس محاذ پر کمزور پڑ رہے ہوں تو عورتوں کو قدم سے قدم ملا کر ان کا ساتھ دینا چاہئے تاکہ زندگی کی گاڑی سبک خرامی سے آگے بڑھتی رہے ــــــ اپنے انہی دو پہیوں پر۔''

میں نے امین سے کہا۔

''آپ نے اپنی بیوی کی جو خوبیاں بیان کی ہیں ان کی روشنی میں تو محلے کے کسی آوارہ، لفنگے کو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں ہونی چاہئے۔ مگر آپ اس کے متضاد کہانی سنا رہے ہیں۔''

''بس جی ــــــ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے، میں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''تم کسی روز اسے میرے پاس لے آؤ۔''

پتہ نہیں کیوں، میرے اندر امین کی بیوی فرزانہ سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ اس عورت سے کوئی معقول اور ڈھنگ کی بات کی جا سکتی ہے اور اس بات چیت کے نتیجے میں مجھے قوی امید تھی کہ اس کے مسئلے کا کوئی مثبت حل بھی نکل آئے گا۔ لیکن امین نامی

وہ گھامڑ میری آسان سی بات کو بھی نہ سمجھ سکا۔

اس نے بڑے پریشان کن انداز میں آنکھیں سکوڑیں اور بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

''جناب! میں ان دس بارہ لفنگوں کو پکڑ کر آپ کے پاس کیسے لا سکتا ہوں؟ وہ کہاں میری بات کو ماننے کے لئے تیار ہوں گے؟''

میں نے خفگی آمیز انداز میں اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا، اپنا وزیٹنگ کارڈ تھمایا اور بہ زور الفاظ دھکیل کر اپنے دفتر سے رخصت کر دیا۔ فی الحال میں یہی کر سکتا تھا۔

❀ ❀ ❀

کسی کے پاس اگر بہت سا فارغ وقت ہو اور وہ ہر لحہ تفریح کے موڈ میں بھی رہتا ہو تو ایسے شخص کے لئے امین ایک ناقابل فراموش شخصیت تھا۔ مگر میں اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات کے باعث ایسی تفریحات افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ آپ اسے میری مجبوری یا بدقسمتی جو دل چاہے، سمجھ لیں۔ چنانچہ جب کافی دنوں تک امین پلٹ کر نہیں آیا تو میری یادداشت نے اُسے فراموش کر دیا۔

اس واقعے کے دو ماہ بعد کا ذکر ہے۔ ایک روز ایک عورت مجھ سے ملنے میرے دفتر آئی۔ وہ خوب صورت نقش و نگار کی مالک ایک دلکش عورت تھی۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ پچیس اور چھبیس کے قریب لگایا۔ جسم قدرے بھرا بھرا مگر ایک مخصوص کینڈے کے اندر۔ اسے فربہ یا مائل بہ فربہی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس کے سراپا کو پُرکشش کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کی صورت میں مجھے ایک معروف اداکارہ کی جھلک نظر آئی لیکن بہرحال مذکورہ عورت نہ وہ اداکارہ تھی اور نہ ہی اس کی کوئی قریبی رشتے دار ـــــــ!

میں نے اسے بیٹھنے کو کہا اور بڑے ہی شائستہ انداز میں اس کی آمد کی غرض و غایت دریافت کی۔ وہ چند لمحات تک متاملانہ انداز میں دیکھتی رہی جیسے یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو کہ اپنی آمد کے مقصد سے مجھے آگاہ کرے یا نہ کرے۔ میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا تو بالآخر وہ کوئی فیصلہ کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔

اس نے اپنا پرس کھولا اور پرس کے اندر سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! یہ کارڈ آپ ہی کا ہے نا؟''

میں کارڈ کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ اس میں کسی شک و شبہے کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ کارڈ میرا ہی تھا۔ میں نے کارڈ کو تھامنے کے لئے اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہاں یہ میرا تعارفی کارڈ ہے۔''

''پھر تو آپ کو یہ بھی یاد ہوگا، یہ کارڈ آپ نے کس کو دیا تھا؟'' اس نے پوچھا۔
اس کا سوال اگرچہ فضول سا تھا لیکن اس سوال کے پیچھے جھلکتی سنجیدگی نے مجھے چونکا دیا۔ وہ یقینی طور پر کسی خاص معاملے کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔ میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

''میں روزانہ درجنوں افراد کو اپنا وزیٹنگ کارڈ پیش کرتا ہوں۔ کارڈ کو دیکھ کر یہ بتانا ناممکن ہے کہ میں نے مذکورہ کارڈ کس شخص کو دیا تھا۔ کیونکہ میرے وزیٹنگ کارڈز ایک جیسے ہیں اور میں افراد کے لحاظ سے ان پر کسی قسم کی مخصوص نشانیاں نہیں لگاتا۔'' میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''بہتر یہ ہوگا کہ آپ اپنا تعارف کرائیں اور بتائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''
وہ کارڈ کو واپس اپنے پرس میں رکھتے ہوئے بولی۔

''کچھ عرصہ پہلے میرا شوہر آپ سے ملنے آیا تھا۔ اس نے اس ملاقات کے بارے میں مجھے بتا دیا تھا۔ رخصت کے وقت آپ نے یہ کارڈ اسے دیا تھا۔ آپ کا وزیٹنگ کارڈ مجھے اس کے سامان میں رکھا ہوا ملا ہے اس لئے ڈھونڈتے ڈھانتے ہوئے میں آپ کے دفتر تک پہنچ گئی ہوں۔ آپ ایک وکیل ہیں اور مجھے اس وقت ایک وکیل ہی کی ضرورت ہے۔ آپ یقین کریں، میں سخت پریشان ہوں۔''

وہ کچھ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ اندرونی پریشانی اس کے چہرے سے مترشح تھی۔ تاہم اس پریشانی نے اس کی دل کشی اور رعنائی کو متاثر نہیں ہونے دیا تھا۔ میں نے کاغذ قلم سنبھالا اور اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے استفسار کیا۔

''آپ کے شوہر کا نام کیا ہے اور وہ کس سلسلے میں مجھ سے ملنے آیا تھا؟''

''امین!'' اس نے جواب دیا۔ وہ محلے والوں کی ایک سنگین شکایت لے کر آپ کے پاس آیا تھا۔ میرا خیال ہے، امین ایسا شخص تو نہیں جسے آسانی سے بھلایا جا سکے۔''

اس نے یاد دلایا تو مجھے یاد آ گیا۔ وہ یقیناً امین نامی اسی احمق کا ذکر کر رہی تھی جو اپنی بیوی کی وجہ سے پریشان تھا اور چاہتا تھا، میں اپنی وکالت کے زور پر کوئی ایسا شعبدہ دکھاؤں کہ اس کے محلے والے ایک دم بندے دے پتر بن جائیں۔ اور میں نے اس کی بے وقوفانہ سوچ کے پیش نظر بڑی خوبصورتی سے اسے ٹرخا دیا تھا۔ وہ پلٹ کر میرے پاس نہیں آیا تو میرے ذہن نے بھی اسے یاد رکھنا ضروری نہ سمجھا۔

''آپ یقیناً فرزانہ ہیں ــــــ!'' میں نے اپنے سامنے بیٹھی خوبصورت مگر پریشان

عورت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ ''جی ہاں ــــــ میرا نام فرزانہ ہی ہے۔''

امین نے مجھے بتایا تھا، اس کی بیوی کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان ہے لیکن فرزانہ کسی بھی طور پچیس سے زیادہ کی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے بہ غور اس کا جائزہ لیا اور کہا۔

''کیا آپ اپنے محلے داروں کی وجہ سے پریشان ہیں؟''

''محلے داروں کو فی الحال ڈالیں جہنم میں۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔ ''میں امین کی وجہ سے سخت پریشان ہوں۔''

''عجیب اتفاق ہے!'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''چند ماہ پہلے وہ آپ کے سبب پریشان تھا اور میرے پاس اپنے مسائل کے حل کے لئے آیا تھا اور آج آپ اس کی وجہ سے پریشان ہو کر یہاں آئی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا، میں آپ لوگوں کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ اگر آپ کے محلے دار ــــــ''

''محلے داروں کو بھول جائیں وکیل صاحب!'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ ''فی الحال مسئلہ امین کا ہے۔ پولیس نے اسے گرفتار کر کے تھانے میں بند کر دیا ہے۔''

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ فرزانہ نے بات ہی ایسی کر دی تھی کہ میرا چونک جانا لازم تھا۔ میں نے سیاق وسباق کی روشنی میں پوچھا۔

''کیا آپ کے شوہر کا کسی محلے دار سے کوئی سنگین نوعیت کا جھگڑا وغیرہ ہو گیا ہے؟''

''وکیل صاحب!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''محلے داروں کا فی الحال کوئی مسئلہ نہیں۔ پولیس نے امین کو پرویز شاہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے جو ادھر حیدری میں رہتا تھا۔''

''اوہ ــــــ!'' میں متاسفانہ انداز میں فرزانہ کو دیکھنے لگا، پھر پوچھا۔ ''حیدری میں رہنے والے کسی پرویز شاہ کا امین سے کیا تعلق ہے؟''

''پرویز شاہ کا تعلق امین سے نہیں بلکہ مجھ سے تھا۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔

میں نے چونک کر حیرت بھری نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔

''کسی پرویز شاہ کا آپ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ اور امین اس پرویز شاہ کو کیوں قتل کرے گا ــــــ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

''میں سمجھاتی ہوں۔'' فرزانہ گلوگیر آواز میں بولی۔ ''مجھے پورا یقین ہے، امین نے پرویز

شاہ کو قتل نہیں کیا۔ وہ اگر اتنا ہی ہمت والا ہوتا تو محلے میں تین چار لفنگوں کی لاشیں گرا چکا ہوتا۔ وہ بہت ہی غصیلا اور بے وقوف شخص ہے۔ اور امین کی انہی خصوصیات نے اسے اس مصیبت میں گرفتار کیا ہے۔ وہ قاتل نہیں لیکن حالات و واقعات اس کے خلاف جارہے ہیں۔ میں اس لئے آپ کے پاس آئی ہوں۔ اب آپ ہی اسے سزا سے بچا سکتے ہیں۔ میں امین کا کیس آپ کے حوالے کرنا چاہتی ہوں۔''

اس نے بے ربط انداز میں جو آدھی ادھوری تفصیل بتائی وہ کسی حتمی نتیجے تک پہنچنے کے لئے ناکافی تھی۔ شاید یہ اس کی پریشانی کے سبب تھا۔ میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی۔ اور جب وہ خاموش ہوئی تو کہا۔

''دیکھو فرزانہ بی بی۔۔۔۔۔۔!'' میرے لہجے میں ہمدردی کا عنصر نمایاں تھا۔ ''اگر تمہارا شوہر بے گناہ ہے تو میں اسے بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔'' میں آپ سے تم پر آیا تو اس نے زیادہ اپنائیت محسوس کی۔ میں نے مزید کہا۔ ''لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ تم مجھے حالات سے بالکل درست آگاہی دو۔ جب تک میں موجودہ صورتِ حال سے واقف نہیں ہو جاؤں گا، تمہارے لئے اور تمہارے شوہر کے لئے کچھ نہیں کرسکوں گا۔'' میں لمحے بھر کو سانس لینے کی غرض سے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''ابھی تک تو تم نے مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ حیدری میں رہنے والے اس پرویز شاہ سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ تمہارے شوہر کو اس کے قتل کے الزام میں کیوں گرفتار کیا گیا ہے؟''

وہ چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اپنے ذہن میں بکھرے ہوئے مختلف خیالات کو مجتمع کرنے کی کوشش کررہی ہو۔ پھر وہ ٹھہر ٹھہر کر مجھے حالات کے بارے میں بتانے لگی۔ اس کے بیان میں ملے جلے واقعات شامل تھے۔ بعض باتیں میرے لئے انکشاف کا درجہ رکھتی تھیں۔ میں نے پوری توجہ سے اس کی بپتا سنی اور اہم نکات کو پیڈ پر نوٹ کرتا چلا گیا۔

یہاں میں فرزانہ سے ہونے والی گفتگو اور اس گفتگو کے نتیجے میں سامنے آنے والے اہم گوشوں کا ذکر کررہا ہوں۔ تاہم میں نے اس کے طولانی بیان میں سے غیر ضروری اور غیر متعلق باتوں کو حذف کردیا ہے۔ اس تفصیل کو آپ کی خدمت میں پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ اس کیس کے پس منظر سے اچھی طرح واقف ہو جائیں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران آپ کا ذہن کسی اُلجھن کا شکار نہ ہو۔

❀ ❀ ❀

امین کی سوچ، انداز اور رویے سے آپ اچھی طرح آگاہ ہو چکے ہوں گے۔اس کو سمجھانے کے لئے زیادہ عقل یا کوشش کی ضرورت پیش نہیں آتی۔اس جیسے افراد کم و بیش ہر خاندان میں پائے جاتے ہیں جو دوسروں کی تفریح طبع کا سامان ثابت ہوتے ہیں اور اپنی "عقل بندانہ" حماقتوں کے باعث ہر وقت نہ صرف اپنے لئے بلکہ خود سے وابستہ دوسرے لوگوں کے لئے بھی پریشانی کا سبب بنتے رہتے ہیں اور اس کیس میں بھی بعین ایسا ہی ہوا تھا۔

امین نے مجھے بتایا تھا، فرزانہ کے اندر بہت ساری مردانہ خصوصیات پائی جاتی ہیں ——— اس کی سوچ میں ایک خاص قسم کی ٹیڑھ پائی جاتی تھی لہٰذا اس کی رائے پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا——— وہ فرزانہ کی اس ضد کو بھی مردانہ وصف سے تعبیر کرتا تھا کہ وہ جاب کرنا چاہتی ہے حالانکہ فرزانہ معاش کی گاڑی کو دھکیلنے کی نیت سے اس کے قدم سے قدم ملا کر چلنا چاہتی تھی۔ اس کی تنخواہ پندرہ بیس دن میں ختم ہو جاتی تھی۔ باقی کا مہینہ قرض اُدھار کے طفیل بسر ہوتا۔امین اس تنگی و ترشی کو فرزانہ کی فضول خرچی کے کھاتے میں ڈال دیتا۔وہ اس بات کے سخت خلاف تھا کہ فرزانہ نوکری کی غرض سے گھر سے نکلے اور کسی دفتر میں، مردوں کے درمیان بیٹھ کر کام کرے۔ حالانکہ وہ خود جس دفتر میں کام کرتا تھا وہاں تین چار لڑکیاں بھی اس کے ساتھ کام کرتی تھیں۔گویا وہ لڑکیوں اور عورتوں کے بیچ بیٹھ کر کام کرتا تھا!

ہر انسان کی سوچ کا اپنا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔عموماً ہم جن چیزوں کی مذمت کر رہے ہوتے ہیں بعض حالات میں انہیں اپنے لئے انتہائی جائز قرار دے دیتے ہیں۔ امین بھی کچھ اسی قسم کے طرزِ عمل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

بہرحال، فرزانہ کے مطابق ایک ماہ قبل اس نے لڑ جھگڑ کر جاب والا معاملہ حل کر لیا۔امین نے راضی خوشی اسے نوکری کی اجازت تو نہ دی البتہ فرزانہ نے اس کی ناراضگی کی پرواہ کئے بغیر ایک جگہ ملازمت کر لی۔ امین چند روز تک رُوٹھا رُوٹھا سا رہا۔ وہ فرزانہ سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کر رہا تھا۔تاہم کچھ ہی دن میں اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور جب دس دن بعد فرزانہ تنخواہ کی رقم لے کر گھر آئی تو سب ٹھیک ہو گیا۔فرزانہ نے بیس تاریخ کو دفتر جوائن کیا تھا لہٰذا اس ماہ اسے دس دن کی تنخواہ ملی۔

فرزانہ نے ایک عقل مندی یہ کی کہ تنخواہ کی رقم اس نے لا کر امین کے ہاتھ میں دے دی تھی۔اس بات نے امین کو خوش کر دیا۔اس نے اس رقم سے پہلی فرصت میں اپنا اُدھار چکایا اور آئندہ کے لئے فرزانہ کی نوکری پر معترض ہونے کا خیال دل سے نکال دیا۔ پتہ نہیں، یہ اس کی کوئی مصلحت تھی یا منافقت۔ بہرحال، عموماً اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں

میں ــــــــ!

چند روز راضی خوشی گزر گئے۔ پھر اچانک ایک بھونچال سا آ گیا۔ فرزانہ کی جاب ناگن چورنگی پر تھی۔ ناگن چورنگی، نیو کراچی سے زیادہ دور نہیں۔ لہٰذا وہ نوکری کے لئے ساڑھے دس بجے گھر سے نکلتی اور ساڑھے پانچ بجے تک واپس آ جاتی۔ اس کی ڈیوٹی گیارہ سے پانچ بجے تک کی تھی۔ اس کے برعکس امین گھر سے نو بجے کا نکلا ہوا رات آٹھ، ساڑھے آٹھ بجے واپس آتا تھا۔ ایک رات وہ گھر میں داخل ہوا تو سخت برہم تھا۔ فرزانہ نے اس کی برہمی کا سبب دریافت کرنا چاہا تو وہ پھٹ پڑا۔

''بس فرزانہ ــــــــ! میں اس سے زیادہ بے غیرتی برداشت نہیں کر سکتا۔''

''بے غیرتی!'' وہ ہکا بکا ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ''تم کس بے غیرتی کی بات کر رہے ہو؟''

''وہ بے غیرتی جس کا مظاہرہ تم نے شروع کر رکھا ہے۔'' وہ غصیلے انداز میں دہاڑا۔

''میں نے کیا، کیا ہے؟'' فرزانہ نے اُلجھن زدہ لہجے میں دریافت کیا۔

''دیکھو تو، کیسی انجان بن کر پوچھ رہی ہو ــــــــ میں نے کیا، کیا ہے؟'' امین نے منہ بگاڑ کر اپنی بیوی کے کہے ہوئے الفاظ دہرا دیئے۔ ''میں تمہاری چکر بازیوں کو سمجھ گیا ہوں۔''

''یہی تو میں بھی پوچھ رہی ہوں۔'' فرزانہ چیخ پڑی۔ ''تم میری کون سی چکر بازیوں کو سمجھ گئے ہو، میں نے کون سی بے غیرتی دکھائی ہے، تم پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو صاف الفاظ میں کہو، جو کہنا چاہتے ہو۔''

''صاف الفاظ میں سننا چاہتی ہو تو سنو۔'' وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مجھے پتہ چل گیا ہے، کوئی کار والا روزانہ تمہیں گھر چھوڑ کر جاتا ہے۔''

''تو ــــــــ؟'' فرزانہ نے اس ایک لفظ کو غصے کی شدت سے کچھ زیادہ ہی کھینچ ڈالا۔

''مجھے بتاؤ، گرے کار والے اس شخص کا تم سے کیا ناتا ہے؟'' امین نے گھور کر اپنی بیوی کو دیکھا۔ ''وہ کیوں تمہیں اپنی گاڑی میں یہاں چھوڑنے آتا ہے؟''

''اُس شخص کا نام پرویز شاہ ہے۔'' فرزانہ نے غصیلے لہجے میں بتایا۔ ''میں اسی کے پاس کام کرتی ہوں اور تمہارا یہ کہا ہوا بالکل غلط ہے کہ وہ مجھے روزانہ گھر چھوڑنے آتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں دو تین مرتبہ پرویز شاہ کی گاڑی میں بیٹھی ہوں۔ اُسے سرجانی ٹاؤن جانا تھا اس لئے مجھے گھر ڈراپ کر کے آگے نکل گیا۔''

''تم دو تین مرتبہ بھی اس کی گاڑی میں کیوں بیٹھی ہو؟'' وہ کٹ حجتی پر اتر آیا۔ ''تمہیں پتہ

ہے، کسی نامحرم ـــــــ میرا مطلب ہے، یہ ٹھیک نہیں۔'' اس نے گڑبڑانے والے انداز میں جملہ مکمل کرنے کی کوشش کی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا وہ کچھ کہتے کہتے عین وقت پر رک گیا ہے۔

فرزانہ کو یہ سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کہ وہ پرویز شاہ کو نامحرم گردانتے ہوئے اس کی گاڑی میں بیٹھنے کے لئے مذمت کرنا چاہتا تھا لیکن یہ سوچ کر اسے بات کو ادھورا چھوڑنا پڑا کہ کہیں پلٹ کر فرزانہ اس سے نہ پوچھ بیٹھے کہ وہ بھی تو تین چار نامحرم عورتوں کے ساتھ گھل مل کر دفتر میں کام کرتا ہے۔ وہ اس بحث کو بڑھانا نہیں چاہتی تھی لہٰذا ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''امین! تم مجھ پر ـــــــ یا پرویز شاہ پر خواہ مخواہ کا شک کر رہے ہو۔ ہمارے درمیان ایسا کچھ نہیں جس انداز میں تم سوچ رہے ہو۔ وہ خاص طور پر مجھے گھر چھوڑنے کبھی نہیں آیا۔ سرجانی ٹاؤن میں اس کا پلاٹس کا ایک وسیع پراجیکٹ ہے۔ وہ اسی سلسلے میں ادھر جاتا رہتا ہے۔ تم اپنے ذہن کو صاف رکھو۔''

''میں اپنے ذہن کو کس طرح صاف رکھوں۔'' وہ آنکھیں دکھاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے پتہ چلا ہے، جب پرویز شاہ تمہیں گھر پر چھوڑتا ہے تم دونوں ایسے والہانہ انداز میں ایک دوسرے کو ''خدا حافظ'' کہتے ہو جیسے تمہارے درمیان کوئی گہرا رشتہ ہو۔ میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا فرزانہ!''

''ہمارے درمیان صرف ملازم اور مالک کا تعلق ہے۔'' فرزانہ نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور اس تعلق کو کسی رشتے کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اور جہاں تک مسکرا کر کسی کو ''خدا حافظ'' کہنے کا تعلق ہے میرے خیال میں اخلاقیات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں۔'' وہ لمحہ بھر کو متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے اس نے امین سے استفسار کیا۔

''کیا تم جب اپنے دفتر پہنچتے ہو تو ساتھ کام کرنے والی لڑکیوں اور عورتوں سے سلام دعا نہیں کرتے ہو؟ اسی طرح رخصت ہوتے وقت انہیں ''اللہ حافظ'' نہیں کہتے ہو؟ اور اگر تم ایسا کرتے ہو تو کیا اس دوران تمہارے چہرے پر غصہ چھایا رہتا ہے، تم ذرا سا بھی نہیں مسکراتے بلکہ کوئی بات کرے تو تم اسے کاٹ کھانے کو دوڑتے ہو؟'' جذبات کی رو میں بولتے بولتے اس کا لہجہ خاصا کڑوا ہو گیا۔ ''بتاؤ، تمہارے دفتر میں کام کرنے والی عورتیں نامحرم نہیں ہیں؟''

''میری بات دوسری ہے۔'' وہ سٹپٹائے ہوئے انداز میں بولا۔

''دوسری بات کیوں ہے؟'' اس نے چیخ سے مشابہ آواز میں پوچھا۔

وہ کوئی جواب نہ دے پایا۔ فرزانہ نے ایک کھلی حقیقت بیان کی تھی۔ امین کے پاس اس کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا تھا لہٰذا وہ بغلیں جھانکتے ہوئے کھسیانے سے لہجے میں

بولا۔

''میں تم سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ بس، میں نے جو کہا ہے اس کا خیال رکھنا۔''

''امین! یہ بات تم کسی معقول طریقے سے بھی کہہ سکتے تھے۔'' وہ شکایتی انداز میں بولی۔ ''تم سیدھا سیدھا کہہ دیتے کہ میں پرویز شاہ کی گاڑی میں نہ بیٹھا کروں، تمہیں اچھا نہیں لگتا۔ میں تمہاری بات مان لیتی۔ لیکن تم نے جس انداز میں میرے کردار پر شک کیا ہے اس سے مجھے دلی صدمہ ہوا ہے ـــــ کاش ـــــ کاش ـــــ!''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوگئی۔ امین نے اس کی شکایت پر نہ کوئی شرمندگی ظاہر کی اور نہ ہی کوئی غصہ دکھایا بلکہ دوسری طرف دیکھتا رہا۔ اچانک فرزانہ کے ذہن میں ایک اچھوتا سوال اُبھرا۔ امین صبح نو بجے گھر سے نکلتا تھا پھر اس کی واپسی رات آٹھ بجے سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔ جب کہ وہ خود سوا پانچ، ساڑھے پانچ تک گھر پہنچ جاتی تھی۔ اوقات کی اس ترتیب میں یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اسے پرویز شاہ کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے یا گاڑی سے اُترتے ہوئے دیکھ پاتا۔ پرویز شاہ کے حوالے سے اس نے فرزانہ پر جو بھی شک کیا تھا اس کے لئے اس نے ''مجھے پتہ چل گیا ہے'' اور ''مجھے پتہ چلا ہے'' جیسے الفاظ ادا کئے تھے۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، محلے کے کسی شخص نے اس کے کان بھرے تھے۔ کیونکہ پرویز شاہ کی گرے گاڑی میں اس کی آمد محلے والوں سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ اسی تناظر میں اس نے اپنے شوہر سے پوچھ لیا۔

''امین! ایک بات سچ سچ بتاؤ گے ـــــ؟''

وہ خفگی آمیز سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھنے لگا پھر بولا۔ ''پوچھو، کیا پوچھنا ہے؟''

''تمہیں یہ بات کس نے بتائی کہ میں کسی گرے گاڑی میں بیٹھ کر گھر آتی ہوں؟''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' وہ بدستور تیوری چڑھا کر بولا۔ ''تم نے اقرار کرلیا ہے، پھر تصدیق کی کیا ضرورت ہے؟''

''میں نے اقرار کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ میرے من میں کوئی کھوٹ نہیں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''اسی لئے میں جاننا چاہتی ہوں میرا ایسا ''خیرخواہ'' کون ہے، جس نے تمہیں میرے بارے میں اتنی اہم اطلاعات دی ہیں؟''

وہ تھوڑی دیر تک متامل دکھائی دیا، پھر غصیلے لہجے میں بولا۔ ''مجھے محلے ہی کے لوگوں سے اس گرے گاڑی والے کے بارے میں پتہ چلا تھا۔''

''میں بھی تو یہی پوچھ رہی ہوں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''تم مجھے اس شخص کا نام بتاؤ جس نے تمہیں بتایا ہے۔''

''کوئی ایک ہو تو بتاؤں۔'' وہ قدرے خجل ہوتے ہوئے بولا۔

''اگر ایک سے زیادہ افراد ہیں تو بھی بتا دو۔'' وہ اپنے غصے کو دباتے ہوئے معتدل لہجے میں بولی۔''تا کہ پتہ تو چلے، کس کس کو کیا کیا تکلیف ہے؟''

''یہ وہی لوگ ہیں جن کی وجہ سے ہمارا جینا دوبھر ہو کر رہ گیا ہے۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔''انہی لوفروں نے اس جانب میری توجہ مبذول کرائی ہے۔ بڑے طنزیہ انداز میں کہہ رہے تھے ـــــ تمہیں ہم محلے والوں ہی سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ہم دل پشوری کرنے کے لئے کوئی جملہ پھینک دیں تو تم پولیس کو بلا لاتے ہو اور جب غیر محلے دار تمہاری بیوی کو گاڑیوں میں سیر کراتے پھریں تو تمہاری غیرت جوش نہیں مارتی؟ واہ بھئی واہ! ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ یہ اچھا دستور ہے۔ اپنوں کو کاٹو اور غیروں میں بانٹو!'' وہ لمحہ بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا پھر کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

''میں نے اس لفنگے کے منہ سے ایسی لوفرانہ باتیں سنیں تو مجھے خود پر قابو نہ رہا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر جھٹ سے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ اس کی مدد کو دوسرے بھی لپک آئے۔ یہ سب وہی لوگ تھے جو ہم پر چپکے چپکے آوازے کستے ہیں اور تمہیں دیکھ کر معنی خیز انداز میں سیٹیاں بجاتے ہیں۔ انہوں نے زور زبردستی کر کے اپنے ساتھی کا گریبان چھڑا لیا اور اس کی حمایت میں بولے ـــــ ہم سے کیوں اُلجھتے ہو؟ اگر تمہارے اندر اتنی ہی زیادہ غیرت بھری ہوئی ہے تو جا کر اپنی بیوی سے پوچھو، وہ آج کل کس یار کی گرے فورڈ میں بیٹھ کر سیر سپاٹے کرتی پھرتی ہے؟''

وہ ایک مرتبہ پھر سانس کی درستی کے لئے متوقف ہوا۔ سانس پوری طرح ہموار بھی نہیں ہو پائی تھی کہ وہ دوبارہ تھرتھراتی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔

''ان بدبختوں کے تمہارے بارے میں ایسے بے ہودہ کلمات سن کر تو میرا دماغ ہی گھوم گیا۔ میں مرنے مارنے پر تل گیا۔ لیکن میں ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ ان چار کے مقابلے میں میری پیش نہ گئی۔ یہ تو اچھا ہوا، انہوں نے مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھایا، صرف دھکے ہی دیتے رہے ورنہ اس وقت میں تمہیں یوں صحیح سلامت نظر نہ آتا۔ میں ابھی ابھی انہی شیطانوں سے نمٹ کر آ رہا ہوں۔ ایک ذلیل نے تو یہاں تک کہہ دیا ـــــ اگر تم سے بیوی سنبھالی نہیں جاتی تو تھانیدار کے مشورے پر عمل کر لو۔ میں یہ پگھلا ہوا سیسہ اپنی سماعت میں انڈیل کر سیدھا تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ بتاؤ، میں کہاں غلطی پر ہوں؟''

بات ختم کرتے کرتے اس کی آواز بھرا گئی۔ اب اس آواز میں غصے اور برہمی کی بجائے بے

چارگی عود کر آئی تھی۔ اس نے بیوی کی طرف سے نگاہ چراتے ہوئے زخمی لہجے میں استفسار کیا۔
''تم تو جانتی ہی ہو، تھانیدار نے مجھے کیا مشورہ دیا تھا؟''
فرزانہ قانون کے اس پاسبان کے مشورے کو نہیں بھولی تھی۔ تھانیدار نے اس کے شوہر کو بڑے مخلصانہ انداز میں مشورہ دیا تھا کہ وہ یا تو اس محلے کو چھوڑ دے اور یا پھر اپنی بیوی کو ـــــ کہ جس کی وجہ سے وہ مشکلات اور مسائل سے دوچار ہے۔
تھانیدار کا یہ ''نیک'' مشورہ اس بوگس رپورٹ کی روشنی میں تھا جو تفتیشی افسر اے ایس آئی شمشاد نے تیار کر کے اس کی خدمت میں پیش کی تھی۔ اس رپورٹ میں فرزانہ کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے سارے فتنے کی جڑ قرار دیا گیا تھا۔ فرزانہ کی مخالفت میں اے ایس آئی نے محض اس وجہ سے رپورٹ تیار کی تھی کہ اس نے اے ایس آئی کے پھیلائے ہوئے جال میں قدم رکھنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ محلے کے چند شر پسند، اوباش لفنگوں کی باتیں سن کر اے ایس آئی یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ فرزانہ اس کے لئے انتہائی آسان شکار ثابت ہوگی۔ لیکن اس کی پیہم کوشش کے باوجود بھی جب ایسا کچھ ثابت نہیں ہوا تو اپنی ناکامی کے انتقام کے طور پر اس نے فرزانہ ہی کو قصوروار ٹھہراتے ہوئے کہانی اُلٹ دی تھی۔
یہ ساری ترش حقیقتیں فرزانہ کے ذہن میں بڑی تیزی سے گردش کر رہی تھیں لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اس بات کا بھی قلق تھا کہ اس کے شوہر نے اس کے مقابلے میں ان لفنگوں کی بات کو اہمیت دی جو اس کی عزت کے دشمن بنے بیٹھے تھے۔ وہ نامراد ہر لمحے اس موقع کی تاک میں رہتے کہ کب اس کے قدم ڈگمگائیں اور ان کا داؤ چل جائے۔ ان شیطانوں کے خلاف پولیس نے بھی کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ اس نے جی میں ٹھان لی کہ کوشش کر کے وہ بہت جلد اس محلے ہی کو خیر باد کہہ دیں گے۔
اس رات ان کے بیچ ایک پراسرار خاموشی حائل رہی۔ امین گومگو کی کیفیت سے دوچار رہا۔ اُسے اپنی بے بسی پر غصہ آتا۔ کمزوری چاہے اعصابی ہو، دماغی ہو، جسمانی ہو یا کسی بھی اور نوعیت کی ہو، وہ انسان کے اندر غصے کو جنم دیتی ہے، اس کی قوتِ برداشت کو کھا جاتی ہے۔ کمزور انسان ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا ہے۔ تحمل اور بردباری اس کے پاس سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی تمام تر ناکامیوں اور نا کامرانیوں کے لئے دوسروں کو موردِ الزام ٹھہرانے لگتا ہے۔
امین بھی یہی کچھ سوچ رہا تھا۔ محلے کے لفنگوں پر اس کا بس نہیں چلتا تھا لہٰذا وہ گھر کی مرغی پر سارا غصہ اتارتا تھا۔ اس کے خیال میں اس کے تمام تر مسائل کا سبب فرزانہ تھی۔ وہ جانتا تھا،

فرزانہ کا کوئی قصور نہیں لیکن اس کی کمزور سوچ اسی خیال سے بہل جاتی تھی کہ یہ سب کچھ فرزانہ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ وہ اُلٹی سیدھی باتیں کرنے والوں کے منہ توڑنے کی سکت نہیں رکھتا تھا اس لئے موقع محل دیکھ کر وہ فرزانہ پر برس کر اپنے دل کا غبار نکال لیتا تھا۔ نادان کو اس بات کا ذرا سا بھی احساس نہیں تھا کہ فرزانہ بے چاری اپنا غبار نکالنے کے لئے کہاں جا کر کس پر برسے؟''

وہ سرد مہر رات جیسے تیسے بیت گئی۔

اسی رات سونے کی کوشش میں جاگتے ہوئے فرزانہ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ پہلی فرصت میں اس محلے کو چھوڑ دیں گے اور جب تک وہ لوگ یہاں ہیں، وہ پرویز شاہ کی گاڑی میں بیٹھ کر اس طرف نہیں آئے گی۔ اس کا شوہر شکی مزاج اور کمزور اعصاب شخص تھا اور عمر کی اس منزل پر کھڑا تھا جہاں انسان کے اندر تبدیلی لانا ممکن نہیں ہوتا ـــــ اور انسان بھی ایسا کہ جو خود کو سقراط و بقراط سے کم نہ سمجھتا ہو!

آئندہ دو روز امن و سکون سے گزر گئے۔ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ فرزانہ نے سُکھ کی سانس لی کہ مصیبت ٹل گئی۔ لیکن یہ اس کی خوش فہمی نما بھول تھی۔ تیسرے دن، رات کو امین دفتر سے لوٹا تو اس کا موڈ بے حد خراب تھا۔ اس نے فرزانہ سے کوئی اچھی بری بات نہ کی اور منہ پُھلا کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ فرزانہ نے یہی سمجھا کہ اس کے دفتر میں کوئی ایسا واقعہ پیش آ گیا ہے جس کی وجہ سے وہ ایسے رویے کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ شامت کی ماری نے اس سے پوچھ لیا۔

''کیا بات ہے امین! تم خاموش کیوں ہو؟''

''خاموش نہ رہوں تو کیا اپنی رسوائی کا اعلان کرتا پھروں؟'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''رسوائی؟'' فرزانہ نے حیرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کس نے تمہاری رسوائی کر دی؟''

''تمہارے ہوتے ہوئے یہ کارنامہ اور کون انجام دے سکتا ہے؟'' وہ جلے کٹے انداز میں بولا۔

فرزانہ کو بھی تاؤ آ گیا۔ اُکھڑے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تم ہوش میں تو ہو ـــــ میں نے تمہاری رسوائی کے لئے ایسا کیا کر دیا ہے؟''

''کیا یہ بات بھی مجھے ہی بتانا ہو گی؟'' وہ عجیب سے لہجے میں مستفسر ہوا۔

''جو الزام لگاتا ہے وہی اس کا سبب بھی بتاتا ہے۔'' فرزانہ نے بپھرے ہوئے انداز میں کہا۔

''میں نے تمہیں سختی سے منع کیا تھا نا، تم اس پرویز کی گاڑی میں نہیں بیٹھو گی۔'' وہ آنکھیں دکھاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن تم نے میری بات کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا۔ کل پھر تم اسی منحوس شخص کی گر رے گاڑی میں گھر آئی ہو!''

''یہ جھوٹ ہے ـــــ ایک سو ایک فیصد جھوٹ۔'' وہ چلّا اُٹھی۔ ''میں اس دن کے بعد سے پرویز شاہ کی گاڑی کے قریب بھی نہیں گئی۔ کسی بدبخت نے تمہیں سراسر غلط اطلاع دی ہے۔''

''جب لوگ دیکھیں گے تو بولیں گے بھی۔'' وہ زہریلے لہجے میں پھنکارا۔

''اس کا مطلب ہے محلے کے آوارہ اور لفنگے تمہاری نظر میں مجھ سے زیادہ معتبر ہیں۔'' فرزانہ بھی ہتھے سے اُکھڑ گئی۔ ''تمہیں ان کی بات کا اعتبار ہے لیکن میرے کہے کا یقین نہیں۔ جب میں کہہ رہی ہوں کہ میں اس شخص کی کیا، کسی بھی شخص کی گاڑی میں نہیں بیٹھی ہوں تو تمہیں میری بات کو سچ ماننا چاہئے۔

''تم یہ نوکری چھوڑ ہی دو۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولا۔ ''نہ رہے گا بانس اور نہ ہے بجے گی بانسری۔ میں نہ محلے والوں کی زبانیں بند کرسکتا ہوں اور ـــــ اور ـــــ''

''اور نہ ہی ان کے بازو توڑ سکتے ہو۔'' فرزانہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے اس کے کپکپاہٹ آمیز جملے کو مکمل کر دیا اور نہایت ہی کٹیلے لہجے میں بولی۔ ''امین! تم انتہائی بزدل اور کانوں کے کچے انسان ہو۔ میں تم سے شادی کر کے پچھتا رہی ہوں۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ تم مجھ پر بھروسہ کرنے کی بجائے ان لوگوں کی لگائی بجھائی پر یقین کر رہے ہو جو ہمارے دشمن ہیں۔'' وہ لمحہ بھر کے لئے متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ان تمام مسائل کا صرف ایک ہی حل ہے کہ ہم جلد از جلد یہ محلّہ چھوڑ دیں۔ میں نے ناگن چورنگی کے قریب ہی ایک چھوٹا سا گھر دیکھ لیا ہے اور ـــــ''

''ناگن چورنگی ـــــ'' امین نے ایک ایک لفظ چبا کر اس کی بات کاٹ دی اور زہریلے لہجے میں بولا۔ ''ناگن چورنگی کا نام بھی نہ لینا میرے سامنے۔ یہ نام سنتے ہی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی موذی ناگن مجھے ڈنک مار رہی ہو۔'' پھر وہ منہ کو ٹیڑھا کر کے عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''تمہارے پرویز شاہ کی ایجنسی بھی تو ناگن چورنگی پر ہی ہے نا؟''

امین کا یہ جملہ کسی برچھی کی مانند اس کے کلیجے میں پیوست ہوگیا۔ امین نے اس کے حوالے سے پرویز شاہ کا ذکر بڑے بھونڈے انداز میں کیا تھا۔ ایک شوہر کو اپنی بیوی کے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار نہیں کرنا چاہئے۔ اسے یقین ہوگیا کہ امین اس کے کردار پر شک کر رہا

ہے اور یہ بات کسی بھی شخص کے لئے انتہائی اذیت کا باعث ہوتی ہے کہ اس کے کردار کو شبے کی نظر سے دیکھا جائے۔ فرزانہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اندر کچھ ٹوٹ گیا ہو۔ اس کی باطنی سماعت نے ایک چھناکے کی بڑی واضح آواز سنی تھی۔

کوئی بھی انسان جب اندر سے ریزہ ریزہ ہوتا ہے تو یا تو وہ بالکل ختم ہو جاتا ہے اور یا پھر اس کے پارہ پارہ اندرون میں ایک بغاوت، ایک ضد یا ایک سرکشی جنم لیتی ہے۔ فرزانہ پر بھی یہ ضد سوار ہوگئی کہ کچھ بھی ہو، وہ پرویز شاہ کی ایجنسی والی ملازمت نہیں چھوڑے گی۔

پرویز شاہ نامی وہ شخص ایک عجیب وغریب کاروبار کرتا تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک دھوکے باز شخص تھا جو معصوم، سادہ لوح اور بے وقوف لوگوں کو مستقبل کے سنہری خواب دکھا کر لوٹتا تھا۔ اس کا لوٹنا ایسے معمولی انداز کا تھا کہ کسی کو اس کی بد نیتی کے بارے میں پتہ نہیں چلتا تھا۔ فرزانہ بھی نہیں جانتی تھی، اس کا باس کتنا بڑا فراڈیا ہے۔ فراڈ اور دھوکا دہی کا کاروبار کرنے والے افراد عموماً بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں ——— نہایت ہی محبت اور خوش اخلاقی کے ساتھ۔ وہ اپنے مصنوعی دوستانہ رویے سے لوگوں کے دل جیت لیتے ہیں۔ لوگ آسانی سے ان پر بھروسہ کر لیتے ہیں اور یہیں سے ان کی کامیابی کا آغاز ہوتا ہے۔

پرویز شاہ نے ''برائٹ فیوچر اسٹیٹ'' کے نام سے ایک ایجنسی قائم کر رکھی تھی جس کا دفتر ناگن چورنگی کی ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور پر واقع تھا۔ اس دفتر میں صرف تین افراد بیٹھتے تھے۔ پروپرائٹر پرویز شاہ، اس کی سیکرٹری نما ملازمہ فرزانہ اور آفس اسسٹنٹ فرید احمد۔ باقی تین تین افراد کی تین ٹیمیں فیلڈ میں کام کرتی تھیں جسے پرویز شاہ مارکیٹنگ کا نام دیتا تھا اور یہی اصل کام تھا۔ یہ نو افراد (تین لڑکے اور چھ لڑکیاں) گھر گھر دروازہ کھٹکھٹا کر انعامی پرچیاں فروخت کرتے اور لوگوں کو یہ حسین خواب دکھاتے کہ قرعہ اندازی میں ان کے قیمتی انعامات نکلیں گے۔ مذکورہ انعامات سلائی مشین سے شروع ہو کر ایک سو بیس گز کے پلاٹ تک جاتے تھے۔ بہر حال، کسی نے کیا خوب، کہا ہے ——— جب تک دنیا میں بے وقوف موجود ہیں، عقل مند بھوکا نہیں مر سکتا۔

اس رات دونوں میاں بیوی کے درمیان اچھی خاصی تلخ کلامی ہوئی۔ امین اس بات پر مصر تھا کہ فرزانہ جاب چھوڑ کر گھر بیٹھ جائے اور فرزانہ کا اصرار تھا کہ وہ نوکری نہیں چھوڑے گی، امین کو چاہئے کہ وہ اپنی مصیبتوں سے چھٹکارا پانے کے لئے وہ محلہ چھوڑ دے۔ ناگن چورنگی نہ سہی، وہ کراچی کے کسی بھی حصے مین جا بسے، اسے اعتراض نہیں ہوگا۔ بہر حال وہ رات بدمزگی میں دونوں نے اپنے اپنے بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے گزار دی۔

اگلی صبح امین ناشتہ کیے بغیر گھر سے نکل گیا۔ فرزانہ نے بھی زیادہ پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے اپنے شوہر کی رات والی حرکت پر سخت غصہ تھا۔ امین کی طرف سے اس کا دل بری طرح دُکھا ہوا تھا۔ وہ اس کے جانے کے بعد کافی دیر تک پڑی سوتی رہی۔

اس نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ کسی بھی حال میں جاب نہیں چھوڑے گی لہٰذا اپنے وقت پر تیار ہوکر وہ گھر سے نکل گئی۔ وہ حسب معمول جاب پر پہنچ بھی گئی لیکن وہاں پہنچ کر اسے ایک ناخوشگوار صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا باس پرویز شاہ اور آفس اسسٹنٹ فرید احمد دس بجے تک دفتر پہنچ جاتے تھے۔ فیلڈ ورکرز کی تینوں ٹیمیں بھی صبح دفتر میں جمع ہوتیں اور ضروری میٹنگ کے بعد اپنے کام پر نکل جاتیں۔ اس نے دفتر میں قدم رکھا تو وہ دونوں موجود تھے لیکن ان کے منہ پھولے ہوئے تھے۔ فرزانہ ان کی برہمی کا سبب نہیں جانتی تھی۔ انہوں نے اس کے سلام کا صحیح طور پر جواب بھی نہیں دیا۔

فرزانہ نے فرید سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے ــــــ آپ کا چہرہ کیوں اُترا ہوا ہے؟''

''چہرہ اُترا ہوا نہیں بلکہ چڑھا ہوا ہے۔'' فرید نے خفگی آمیز لہجے میں جواب دیا۔

''یہی تو میں پوچھ رہی ہوں۔'' وہ اُلجھن زدہ لہجے میں بولی۔ ''اس برہمی اور ناراضگی کا سبب کیا ہے؟''

''سبب کے بارے میں شاہ جی بتائیں گے۔'' فرید نے پرویز شاہ کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

اس دفتر کو پارٹیشن کی مدد سے دو کمروں میں بدل دیا گیا تھا۔ عقبی کمرے میں پرویز شاہ بیٹھتا تھا اور بیرونی کمرہ دیگر اسٹاف کے استعمال میں تھا۔ پرویز شاہ فرزانہ کو اپنے ساتھ عقبی کمرے میں لے گیا۔ جب وہ بیٹھ چکی تو پرویز شاہ نے پوچھا۔

''تم نے اپنے شوہر کا نام امین ہی بتایا تھا نا؟'' اس کے لہجے سے خفگی جھلکتی تھی۔

''ہاں ــــــ'' فرزانہ نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر اُلجھن زدہ نظر سے اپنے باس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھ لیا۔ ''آپ میرے شوہر کا ذکر کیوں کررہے ہیں؟''

پرویز شاہ نے اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے تصدیقی لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا تمہارا شوہر امین کوئی نفسیاتی مریض ہے؟''

فرزانہ کے جی میں تو آئی کہ فوراً کہہ دے ''ہاں'' لیکن اس نے اپنی زبان کو قابو میں رکھا اور مصلحت آمیز لہجے میں بولی۔ ''سر! نفسیاتی مریض تو نہیں البتہ امین غصے کا ذرا تیز ہے۔''

''میں اس سے زیادہ غصے والا ہوں۔'' پرویز شاہ نے برہمی سے کہا۔ ''آج گھر جاکر اسے

اچھی طرح سمجھا دینا کہ آئندہ میرے آفس میں قدم نہ رکھے ورنہ میں پہلی فرصت میں اس پاگل کے بچے کو پولیس کے حوالے کر دوں گا اور تم ــــــ'' وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر لمحہ بھر کو متوقف ہوا پھر اپنی برہمی کو برقرار رکھتے ہوئے بولا۔

''اور تمہیں اگر نوکری نہیں کرنا تو ابھی اور اسی وقت جا سکتی ہو۔ مجھے اپنے دفتر کے لئے بہت لڑکیاں مل جائیں گی۔ آج کل ویسے بھی بیروزگاری عروج پر ہے۔''

فرزانہ سمجھ گئی کہ امین نے وہاں آ کر کوئی بڑی گڑبڑ کر دی ہے۔ اس نے اپنی تسلی کی خاطر پرویز شاہ سے پوچھ لیا۔ ''سر! کیا امین یہاں آیا تھا؟''

''ہاں ــــــ آیا تھا۔'' وہ سٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تمہارے آنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی گیا ہے وہ کریک۔ میں نے تمہاری وجہ سے اس کے ساتھ خاصی رعایت برتی ہے۔ ورنہ لوگوں کو جمع کر کے میں اس کی تشریف مبارک پر اتنے جوتے لگواتا کہ کئی دنوں تک اسے گھائل تشریف کے بل آرام سے بیٹھنا نصیب نہ ہوتا۔''

فرزانہ کے پیہم اصرار پر پرویز شاہ نے اسے بتایا کہ امین نے وہاں پہنچ کر بڑے جنگلی پن کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ فرزانہ کے حوالے سے پرویز شاہ کو اُلٹی سیدھی سناتا رہا اور مطالبہ کیا وہ فرزانہ کو نوکری سے نکال دے۔ اس کی وجہ سے ان کی عزت خاک میں مل رہی ہے۔ محلے والے بڑی پراسرار چہ میگوئیاں کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ نیز اس نے بڑے واشگاف الفاظ میں پرویز کو دھمکی دی کہ اگر آئندہ وہ فرزانہ کو اپنی گاڑی میں گھر چھوڑنے آیا یا ان کے محلے میں کہیں دکھائی دیا تو وہ کوئی لحاظ کئے بغیر اس کی ٹانگیں توڑ دے گا۔ اس کے علاوہ بھی اس نے پرویز شاہ کو متعدد سنگین اور خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیں۔ پانچ دس منٹ کی اس ہنگامہ آرائی کے بعد وہ پاؤں پٹختا ہوا دفتر سے رخصت ہو گیا۔

یہ تفصیل بیان کرنے کے بعد پرویز شاہ نے فرزانہ سے پوچھا۔ ''تم اتنے بدتمیز شخص کے ساتھ کیسے گزارا کرتی ہو؟ کیا تمہیں شادی کے لئے کوئی اور نہیں ملا تھا؟''

''سر ــــــ! آپ فکر نہ کریں۔'' وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔ ''میں امین کو اچھی طرح سمجھا دوں گی۔ آئندہ وہ اس طرف کا رخ نہیں کرے گا۔ میں اس کے ناشائستہ رویے کے لئے آپ سے معافی چاہتی ہوں۔''

پرویز شاہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''میری ٹانگیں توڑنے کی بات کرتے ہوئے اس کانگڑی پہلوان کی اپنی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ میں نے اس کی صحت کی خاموش التجا کو سن لیا ورنہ وہ تمہارا پوتی ایک ہاتھ کی مار بھی نہیں۔ پتہ نہیں، وہ کس بات پر اتنا اکڑ رہا تھا۔ نہ جسم میں

جان اور نہ ہاتھ پاؤں میں طاقت۔ اس کسمپرسی پر بھی وہ اچھل اچھل کر مجھے دھمکیاں دے رہا تھا۔" وہ لمحہ بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا پھر عجیب سے لہجے میں اس نے فرزانہ سے استفسار کیا۔

"سچ سچ بتاؤ، تم نے کیا دیکھ کر اس بڑے میاں سے شادی کی تھی؟"

"سر! جانے بھی دیں۔" وہ بات کو رفع دفع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "میں امین کو اچھی طرح سمجھا دوں گی۔ آئندہ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ مجھے اس واقعہ کا سخت افسوس ہے۔"

فرزانہ "جانے بھی دیں" کی بات کر رہی تھی لیکن پرویز چھوڑنے کے موڈ میں نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اپنی ہی رو میں بولتا چلا گیا۔

"جب اس بڈھے طوطے نے یہاں آ کر تمہارے بارے میں استفسار کیا تو میں یہی سمجھا کہ وہ تمہارا والد بزرگوار ہے۔ لیکن پھر اس نے مجھے تمہارے ساتھ منسوب کر کے اُلٹی سیدھی بکواس شروع کر دی اور اپنی شوہریت کا ڈھنڈورا پیٹنے لگا تو مجھے پتہ چلا کہ میں اس وقت کس مخلوق کے رو بہ رو ہوں ـــــ بہرحال۔" وہ تھوڑی دیر کو رکا، پھر افسوس ناک انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"تمہارے شوہر کو دیکھ کر مجھے تمہاری بدقسمتی پر دکھ محسوس ہوا ہے۔ پتہ نہیں، تم نے کس مجبوری کے تحت ہانپتے کانپتے، زرد پتوں والے پیڑ کے سایہ میں پناہ لی ہے۔ مجھے تمہارے نجی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن ایک نکتے کو ذہن نشین کر لو ـــــ" وہ لمحاتی توقف کے دوران میز پر رکھی ہوئی اشیاء کو اضطراری انداز میں اِدھر اُدھر کرتا رہا پھر گہری سنجیدگی سے بولا۔

"میں اس بے ہودہ شخص کو دوبارہ یہاں دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ اگر آئندہ دفتر میں مجھے اس کی شکل نظر آئی تو میں سوچے سمجھے بغیر اسے پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ پھر مجھ سے کوئی شکوہ نہ کرنا۔ تم دونوں کے درمیان جس بھی نوعیت کے گھریلو اختلافات پائے جاتے ہیں انہیں اپنی ہی ذات تک محدود رکھو۔ اگر تمہیں میری یہ شرائط منظور ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میں اپنے لئے کسی اور سیکرٹری کا بندوبست کر لیتا ہوں۔ تم اپنے شوہر کو سنبھالو گی یا کسی نئی جگہ نوکری کرو گی، یہ تمہارا مسئلہ ہے۔"

فرزانہ نوکری نہ چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ امین نے آج یہاں آ کر جس بے ہودگی کا مظاہرہ کیا تھا اس کے بعد تو اس کی نوکری کرنے کی ضد اور بھی پکی ہو گئی۔ وہ چند لمحات تک خاموش بیٹھی اپنے حالات پر غور کرتی رہی پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس نے پرویز

شاہ سے کہا۔

''سر! آج یہاں جو کچھ ہوا، میں اس کے لئے ایک مرتبہ پھر آپ سے معذرت چاہتی ہوں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ میرا شوہر آئندہ یہاں نہیں آئے گا۔ میں گھر جا کر اسے اچھی طرح سمجھا دوں گی ـــــ اور یہ کہ میں جس طرح جاب پر آ رہی ہوں ایسے ہی آتی رہوں گی۔''

''ٹھیک ہے ـــــ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' پرویز شاہ نے سرسری انداز میں کہا۔

اس طرح یہ تلخ موضوع لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا گیا۔

اس رات فرزانہ نے اپنے شوہر سے شدید جھگڑا کیا۔ ان کے درمیان اچھی خاصی گالم گلوچ بھی ہوئی۔ نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ جاتی اگر امین ذرا ہمت سے کام لیتا۔ لیکن اسے اپنی واشگاف ناتوانی کا پوری طرح احساس تھا، وہ ایسی غلطی کر کے اپنی ہڈیوں کو سپرِ دِعذاب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس بات کے امکانات تھے کہ فرزانہ باقاعدہ اس سے دھینگا مشتی تو نہ کرتی لیکن اگر وہ غصے میں دو چار ہاتھ بھی چھوڑ دیتی تو امین کو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ وہ ایک دو جھانپڑ سے زیادہ کا نہیں تھا۔ لہٰذا اپنی اوقات کو دیکھتے ہوئے اس سلسلے میں اس نے بہت احتیاط برتی اور زبانی جوش وخروش سے کام چلاتا رہا۔ وہ چیخ چلّا کر فرزانہ سے اس بات پر اصرار کر رہا تھا کہ وہ پہلی فرصت میں نوکری چھوڑ کر گھر بیٹھ جائے ورنہ وہ اسے اور پرویز شاہ کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

اُس کی اس گیدڑ بھبکی سے فرزانہ ذرا بھی متاثر نہ ہوئی اور اس نے ترکی بہ ترکی کہہ دیا، وہ اسے اور پرویز شاہ کو تو زندہ چھوڑے گا یا نہیں، البتہ یہ بات طے ہے کہ اگر آئندہ اس نے پرویز شاہ کے دفتر میں قدم رکھا تو وہ ضرور اسے تھانے میں بند کروا دے گا۔

فرزانہ نے ایک کھلی حقیقت بیان کی تھی لیکن یہ بات امین کو بہت زور کی لگی۔ وہ بلبلا اٹھا اور شدید غصے کے عالم میں اول فول بکنے لگا۔ وہ چیخ چیخ کر فرزانہ کو برا بھلا کہنے لگا۔ زور اس بات پر تھا کہ وہ اپنے شوہر کے مقابلے میں ایک نامحرم پرویز شاہ کی حمایت میں کیوں بولی تھی۔ فرزانہ کی حقیقت گوئی سے امین کی شوہرانہ انا کو بڑی ظالم ٹھیس لگی تھی۔ اس کی غصیلی اور لایعنی حرکات کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا، اچانک اس کے بدن میں پتنگے لگ گئے ہوں۔

ان دونوں کے درمیان اس رات جو جیخم دھاڑ ہوئی وہ آن ایئر اڑوس پڑوس تک بھی پہنچی جسے انہوں نے انجوائے کیا۔ اس غصیلی، بحث وتکرار تک محدود گرم جنگ کا اختتام ان کلمات پر ہوا۔

''میں آخری بار کہہ رہا ہوں فرزانہ!'' امین نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا۔ ''تم کل

سے نوکری پر نہیں جاؤ گی۔''

''میں جاؤں گی۔'' وہ سرکش لہجے میں بولی۔ ''تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے؟''

''میں تمہارا شوہر ہوں ـــــــ اور کون ہوں۔'' وہ ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

''شوہر تو بیوی کے لئے ایک سایہ دار درخت کی مانند ہوتا ہے۔'' وہ دُکھی لہجے میں بولی۔ ''ایک مضبوط چھتری کی طرح اسے موسم کے سرد و گرم، خشک و نم سے بچاتا ہے۔ ہر حوالے سے اس کی حفاظت کرتا ہے، اسے آرام و آسائش پہنچاتا ہے۔ لیکن تم نے کیا، کیا ہے؟ مجھے کچھ دینے کی تو تمہیں کبھی کوئی توفیق نہیں ہوئی۔ الٹا میری کردار کشی پر کمر بستہ ہو۔ ذرا گریبان میں جھانک کر دیکھو! کیا تم شوہر کہلوانے کے قابل ہو؟''

''تم مجھے گالی دے رہی ہو!'' وہ ناچ اٹھا۔

''اور تم تو اب تک مجھ پر پھول برسا رہے ہو۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''تمہیں کچھ احساس بھی ہے، اس گل باری نے میرے پندار کو کتنی بری طرح زخمی کیا ہے؟''

امین شرمندہ ہونے کی بجائے ڈھٹائی پر ڈٹا رہا اور فرزانہ کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتا رہا۔ بالآخر اس نے حتمی انداز میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ سنسناتے ہوئے لہجے میں اس نے فرزانہ سے کہا۔

''اگر تم اپنی ضد سے باز نہ آئیں تو مجھے خود ہی کوئی بندوبست کرنا ہوگا۔''

میاں بیوی کا رشتہ ایسا ہے کہ اس میں اٹھتے بیٹھتے نوک جھوک ہوتی رہتی ہے اور جہاں میاں بیوی میں بے پناہ محبت ہوتی ہے وہاں بھی یہ سلسلہ موجود نظر آتا ہے، ذرا مختلف انداز میں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہوں اور ان کے درمیان بحث و تکرار نہ ہو ـــــــ بعض ماہرین تو میاں بیوی کے بیچ ہونے والی اس ''تُو تُو، میں میں'' کو پُر مسرت اور خوشگوار ازدواجی زندگی کا ثبوت قرار دیتے ہیں۔

اس قسم کے اختلافات اور اس نوعیت کی بحث و تکرار کی عمر نہایت ہی مختصر ہوتی ہے۔ رات گئی، بات گئی کے مصداق ـــــــ صبح تک سب ٹھیک ہو جاتا ہے!

ان کی زندگی میں بھی صبح آئی لیکن کچھ بھی ٹھیک نہ ہو سکا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ میاں بیوی والی زندگی نہیں گزار رہے تھے۔ دوسرے دن دونوں کا منہ پھولا ہوا تھا۔ وہ اپنے اپنے وقت پر اپنی نوکری پر چلے گئے۔ وہ دن اسی سرد مہری اور تناؤ کی سی کیفیت میں گزر گیا۔ رات کو وہ کلام کئے بغیر اپنے اپنے بستر میں دبک کر سو رہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ ڈٹے رہے۔

اس سے اگلے روز کی صبح بھی گزشتہ سے پیوستہ ثابت ہوئی۔ لیکن اس دن کا اختتام بڑا ہی

ہول ناک تھا۔ امین اپنے معمول کے وقت سے کافی پہلے گھر پہنچ گیا۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا، دھوپ ناپید ہو چکی تھی لیکن رات کی تاریکی نے ابھی تک اپنے پَر نہیں پھیلائے تھے۔ گھر پہنچتے ہی وہ سیدھا واش روم میں گھس گیا۔ پھر واش روم کے اندر سے اس کے نہانے کی مخصوص آواز اُبھرنے لگی۔

فرزانہ کو اس کی اس خلافِ معمول حرکت پر شدید حیرت ہوئی۔ کیونکہ امین نہانے کے معاملے میں خاصا چور ثابت ہوا تھا اور خاص طور پر شام یا رات کے وقت نہاتے ہوئے تو اس کی جان جاتی تھی۔ اس کے فرار نما انکار سے یوں ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ گوشت پوست کا نہیں بلکہ کاغذ کا انسان ہو جو ذرا سا بھیگنے پر بھی پھس ہو جائے گا۔ وہ عموماً ہفتے میں ایک دن، چھٹی کے روز دوپہر کے وقت نہا لیا کرتا تھا۔

فرزانہ نے اپنی حیرت بھری اُلجھن کا اظہار نہیں کیا تاہم وہ دل ہی دل میں یہ سوچتی رہی کہ اس بگڑے ہوئے اللہ کے بندے کو سرِ شام غسل کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ اگر واش روم سے باہر آنے کے بعد امین نے خود سے کوئی بات کی تو وہ اس سے اپنی اس الجھن کا سبب ضرور دریافت کرے گی۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔

امین ابھی فارغ ہو کر واش روم سے نکلا بھی نہیں تھا کہ ان کے دروازے پر دستک ہوئی۔ فرزانہ لپک کر دروازے پر پہنچی، پھر جب اس نے دروازہ کھولا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ سامنے پولیس والے کھڑے تھے۔

پولیس والے اس کی اجازت حاصل کئے بغیر گھر میں گھس آئے اور تھوڑی سی کوشش کے بعد انہوں نے امین کو گرفتار کر لیا۔ فرزانہ کے استفسار پر اسے بتایا گیا کہ امین کو پرویز شاہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا جا رہا ہے۔ اس نے تفصیل جاننا چاہی تو اسے تھانے آنے کو کہا گیا۔

وہ تھانے میں قدم نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ انکوائری افسر اے ایس آئی شمشاد علی والے واقعے نے اسے پولیس کی طرف سے خاصا منتشر کر دیا تھا لیکن امین کے حوالے سے اس پر ایسا وقت آن پڑا تھا کہ وہ مجبور ہو گئی۔ اسے حالات سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے تھانے جانا پڑا۔ وہاں جا کر اسے کوئی خاص بات معلوم نہ ہو سکی۔ پولیس والوں نے اسے اپنے شوہر سے ملنے تک نہیں دیا۔ اسے بس یہی بتایا گیا کہ امین کو ''برائٹ فیوچر اسٹیٹ'' کے مالک پرویز شاہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے ـــــــ اور اسے اگر مزید کچھ معلوم کرنا ہو تو عدالت سے رجوع کرے۔

فرزانہ کا کبھی تھانے کچہری سے واسطہ نہیں پڑا تھا اس لئے وہ کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گئی۔

اگلے روز وہ عدالت پہنچی اور عدالتی کارروائی کو بھی دیکھا لیکن پریشانی کے باعث کچھ بھی اس کی سمجھ میں نہ آسکا۔ وہ محض اتنا جان پائی کہ پولیس نے اس کے احمق اور غصیلے شوہر کو عدالت میں پیش کر کے سات روز کا ریمانڈ حاصل کرلیا تھا۔ جب پولیس والے اسے اپنے ساتھ لے کر جا رہے تھے تو چند لمحات کے لئے اسے امین سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ گھبراہٹ کے انہی لمحات میں امین نے اس سے کہا تھا کہ وہ اس کے سلسلے میں فوری طور پر مجھ سے آکر ملے۔ امین نے اسے میرے وزیٹنگ کارڈ کے بارے میں بھی بتایا تھا کہ وہ اس نے اپنے سامان میں کہاں رکھا ہوا ہے۔

اور اب یہی پریشان حال، خوبصورت فرزانہ میرے سامنے بیٹھی تھی!

❀ ❀ ❀

بہ وجوہ، اس روز میں امین سے ملاقات کے لئے متعلقہ تھانے نہ جاسکا۔ مغرب کے بعد پے در پے ایسی مصروفیات سامنے آئیں کہ مجھے ایک لمحے کے لئے بھی سر کھجانے کی فرصت نہ مل سکی اور دفتر سے فارغ ہوتے ہی میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ پھر جب میں اپنے گھر سے چند گز کے فاصلے پر تھا تو مجھے یاد آیا کہ میں نے دفتر سے اٹھنے کے بعد سیدھا تھانے جانا تھا اور امین سے ملاقات کر کے ضروری معلومات حاصل کرنا تھیں۔ بہرحال، اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ لہٰذا میں نے اس کام کو کل کے لئے رکھ چھوڑا اور گھر پہنچ گیا۔

آئندہ روز میں عدالتی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد اپنے دفتر پہنچا تو انتظار گاہ میں فرزانہ کو بیٹھے دیکھ کر چونک اٹھا۔ میں نے کل اسے اپنے دفتر سے رخصت کرتے وقت یہ وعدہ کیا تھا کہ اس کے شوہر سے ضرور ملاقات کروں گا۔ اسی وعدے کے تناظر میں اسے دیکھتے ہی مجھے ندامت کا احساس ہوا کیونکہ میں اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکا تھا۔ فوری تلافی کے لئے میں نے سب سے پہلے فرزانہ ہی کو اپنے چیمبر میں بلالیا۔ ویسے بھی اس وقت میرے دفتر کی انتظار گاہ میں زیادہ رش نہیں تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔ ''بیگ صاحب! کل رات آپ امین سے ملنے تھانے نہیں پہنچے؟''

میں نے وعدہ خلافی پر شرمندگی کا اظہار کیا اور اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ آج میں خاص وقت نکال کر اس سے ضرور ملاقات کروں گا۔''

پچھلی ملاقات میں، میں فرزانہ کے لئے ''آپ'' سے ''تم'' پر اتر آیا تھا تاکہ وہ زیادہ سہولت کے ساتھ اپنا مدعا بیان کر سکے اور میرا یہ حربہ خاصا کامیاب رہا تھا اور اب میں نے

اسے دوبارہ ''آپ'' سے مخاطب کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے اپنی بپتا سنانے کے بعد میرے درجن بھر سوالات کے بڑے تسلی بخش جوابات دیئے تھے اور انہی بیانات کی روشنی میں، میں نے یہ کیس اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے فرزانہ سے دو چار نجی نوعیت کے سوالات بھی کئے تھے جن کا لُبِ لباب یہ تھا کہ وہ کون سے مجبور لمحات تھے جن کے زور پر اس نے امین سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور ـــــ یہ کہ اس کی ہزار نالائقی اور نامعقولیت کے باوجود بھی وہ اس کے لئے اس قدر پریشان کیوں تھی؟

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اس نے مجھے ٹال دیا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے اس پہلو کو زیر بحث لانے کے لئے تیار نظر نہ آئی تو میں نے بھی زیادہ اصرار نہ کیا اور یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ بعد میں کسی موقع پر اس کا موڈ خوشگوار دیکھتے ہوئے میں اسے اس حوالے سے ٹٹولوں گا۔ میں نے ان دونوں کو بڑی وضاحت سے دیکھا اور بڑی توجہ سے سنا تھا۔ ان میں مجھے کوئی تال میل دکھائی نہ دیا۔ وہ بلاشبہ ایک بے جوڑ جوڑا تھا۔

مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر فرزانہ نے کہا۔

''بیگ صاحب! میں روز روز تھانے جا کر امین سے نہیں مل سکتی۔ مجھے پولیس والوں سے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ وہ بڑی بری نظروں سے بہت دور تک گھورتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ آپ امین سے ملاقات کر کے صورتِ حال کا جائزہ لے لیں تو مجھے اطمینان ہو جائے گا۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کچھ زیادہ ہی گھبرائی ہوئی ہیں۔ اس طرح خوف زدہ ہونا آپ کے لئے ٹھیک نہیں۔ اپنے اندر ہمت پیدا کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں پوری طرح آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں چند لمحات کے لئے متوقف ہوا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ باہر جا کر ویٹنگ روم میں بیٹھیں۔ میں اپنے دو تین کلائنٹس کو فارغ کر کے ابھی آپ کے ساتھ تھانے چلتا ہوں۔''

وہ میرے ان تشفی آمیز کلمات سے خاصی مطمئن نظر آنے لگی۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی اور میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے چیمبر سے نکل گئی۔ میں نے اپنی سیکرٹری سے انٹرکام پر رابطہ کر کے دریافت کیا کہ آج کے لئے کتنے اپائنٹمنٹ ہیں۔ اس نے بتایا۔

''سر ـــــ تین افراد تو ویٹنگ لابی میں بیٹھے ہیں۔''

وہ انہی کلائنٹس کا ذکر کر رہی تھی جنہیں میں انتظار گاہ میں بیٹھے دیکھ چکا تھا۔ میں نے کہا۔

''ان کے علاوہ باقاعدہ اپائنٹمنٹ کے بارے میں مجھے بتاؤ۔''

''سر ــــ! چھ بجے سے پہلے کا باقاعدہ اپائنٹمنٹ کوئی نہیں۔'' سیکرٹری نے جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، انہیں باری باری میرے پاس بھیج دو۔''

چھ بجنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ میں نے لگ بھگ آدھے گھنٹے میں ان تین ملاقاتیوں کو نمٹا دیا۔ پھر فرزانہ کے ساتھ اپنے دفتر سے نکل آیا۔ سیکرٹری کو میں نے بتا دیا کہ واپسی میں مجھے کم و بیش ایک گھنٹہ لگ جائے گا اور یہ کہ میں چھ بجے سے پہلے دفتر پہنچ جاؤں گا۔ اس دوران اگر مجھ سے ملنے کوئی آ جائے تو وہ بٹھا لے۔ سیکرٹری نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا یقین دلایا تو میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔

امین سے میں نے لگ بھگ آدھا گھنٹہ ملاقات کی۔ میں نے اپنی کوشش کے ذریعے اس کے اندر سے جو تفصیلات اور مفید معلومات باہر نکالیں ان کی روشنی میں، میں نے اس کے کیس کی پیروی کا فیصلہ کر لیا۔ ان تمام تر باتوں کو یہاں دہرا کر میں آپ کے قیمتی وقت اور محدود صفحات کو ضائع کرنے کے حق میں قطعاً نہیں ہوں۔ عدالتی کارروائی کے دوران یہ اہم نکات مناسب مواقع پر ایک ایک کر کے آپ کے سامنے آتے رہیں گے۔

❁ ❁ ❁

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے چالان پیش کر دیا۔

جج اس روز ذرا دیر سے عدالت پہنچا تھا لہٰذا کارروائی بھی کچھ تاخیر ہی سے شروع ہوئی۔ میں نے ملزم امین کی درخواست ضمانت جج کے سامنے پیش کر دی۔ اس درخواست کے ساتھ ہی میرا وکالت نامہ بھی تھا۔ میں نے گزشتہ ملاقات میں، امین سے اس وکالت نامے پر دستخط لے لئے تھے۔ اس دستاویز کی رو سے میں اس کا وکیل تھا اور وہ میرا موکل تھا!

وکیل استغاثہ فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور جج سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''جنابِ عالی! یہ پاکستان پینل کورٹ کی دفعہ تین سو دو کا کیس ہے۔ ملزم نہایت ہی خطرناک شخص ہے لہٰذا اس کی درخواست ضمانت کو منظور کرنا انصاف کے اصولوں کے منافی ہو گا۔''

میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''جناب عالی! وکیل استغاثہ میرے سادہ دل موکل کے ساتھ بڑی زیادتی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ان سے پوچھا جائے، میرے موکل کو موصوف کس بنا پر ''انتہائی خطرناک شخص'' قرار دے رہے ہیں؟''

''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے، پڑھے لکھے کو فارسی کیا ہے!'' جج کے کچھ بولنے سے پہلے ہی

وکیل استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''امین نامی اس شخص پر قتل کا الزام ہے۔ کیا قتل جیسا فعل خطرناکی کے اعتبار سے کسی بھی طور کم ہوسکتا ہے؟''

میں نے وکیل مخالف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے سوال کا جواب تو میں بعد میں دوں گا، پہلے آپ میری ایک حیرانی تو دور فرمائیں۔'' میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے اپنی بات کے آغاز میں ہاتھ کے ساتھ کنگن اور آرسی، لکھنے پڑھنے کے ساتھ فارسی کا ذکر کیا ہے مگر آپ کے ہاتھ میں نہ تو کنگن اور آرسی نظر آ رہا ہے اور نہ ہی زبان پر فارسی سننے کو مل رہی ہے۔ یہ کیا معمہ ہے میرے فاضل دوست؟''

میں نے محض اسے تپانے کے لئے اس قسم کا استفسار کیا تھا۔ حالانکہ میں جانتا تھا اس کے کہنے کا مطلب کیا تھا۔ میرے استفسار کے مقصد کو حاضرینِ عدالت میں سے بہت سوں نے بہ عین سمجھ لیا۔ چنانچہ مضحکہ خیز انداز میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

وکیل استغاثہ کو قدرے خفت اٹھانا پڑی۔ اس نے کھنکار کر لوگوں کو خاموش رہنے کی اشاراتی تلقین کی پھر میری طرف دیکھتے ہوئے معاندانہ انداز میں بولا۔

''یہ معمہ نہیں، محاورہ ہے۔''

''اوہ ——— آئی سی ———!'' میں نے ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا۔ ''تو آپ اس محاورے کے زور پر میرے موکل کو مجرم ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' میں سانس لینے کو رکا پھر خاصے کڑوے لہجے میں وکیل استغاثہ سے پوچھا۔

''کیا آپ عدالتی کارروائی شروع ہونے سے پیشتر ہی میرے موکل پر عائد کردہ الزامات کو ثابت کر چکے ہیں جو اتنے دھڑلے سے اسے مجرم گردان رہے ہیں ——— اسے خطرناک قاتل قرار دے رہے ہیں؟''

وہ بوکھلا گیا اور یہی میرا مقصد بھی تھا۔ اسی بوکھلاہٹ میں اس نے کہا۔ ''یہ عدالت اسی لئے تو لگی ہے کہ ملزم کو مجرم ثابت کیا جائے۔''

''دی پوائنٹ اِز ٹو بی نوٹیڈ۔'' میں نے اپنا روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ''وکیل استغاثہ واشگاف الفاظ میں عدالت کی ایک نئی تعریف سامنے لا رہے ہیں۔ آج تک تو یہی سنا، پڑھا اور بتایا گیا تھا کہ عدالت انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لئے لگائی جاتی ہے جہاں جج ایک غیر جانب دار منصف کا کردار ادا کرتا ہے۔ لیکن میرے فاضل دوست نے جس قسم کی موشگافی فرمائی ہے اس سے تو ظاہر ہوتا ہے، اگر کوئی ملزم عدالت میں پیش ہو تو اسے ہر صورت میں، اس پر عائد کردہ الزام کے تحت سزا ضرور سنائی جائے گی چاہے وہ بے گناہ بھی

کیوں نہ ہو۔'' میں لمحے بھر کے لئے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
''جناب عالی! اگر واقعی ایسا ہونے لگا جیسا وکیل استغاثہ نے بیان کیا ہے تو کوئی بھی ملزم عدالت کا رخ کرنے کی بجائے ''مرنے مارنے'' کی حکمت عملی کو ترجیح دے گا۔ وہ کورٹ میں ہرگز ہرگز قدم نہیں رکھے گا کیونکہ وہاں سے تو سزا سنا کر اسے سیدھا جیل بھجوا دیا جائے گا۔ وہ حتیٰ الامکان یہی کوشش کرے گا کہ قانون کے جو رکھوالے اسے عدالت تک پہنچانے کے لئے مقرر کئے گئے ہیں وہ بہ بانگِ دہل ان سے ٹکرا جائے گا۔ یا تو انہیں کوئی نقصان پہنچا کر فرار ہونے کی کوشش کرے گا اور یا پھر ان سے کوئی شدید نقصان اٹھالے گا۔۔۔ میں ابھی۔۔۔''
وکیل استغاثہ کا صبر جواب دے گیا۔ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔
''جنابِ عالی!'' اس نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''وکیل صفائی ایک مقامی ڈائجسٹ میں اپنے کیسز کی روداد کہانی کے انداز میں لکھتے ہیں اور کہانیاں لکھتے لکھتے یہ عدالت کو بھی کوئی ڈراما ہاؤس سمجھنے لگے ہیں۔ بات کا بتنگڑ بنانا اور رائی کو پہاڑ میں بدلنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ میں نے تو محض ملزم پر عائد سنگین اور خطرناک الزام کا حوالہ دیا تھا اور میرے فاضل دوست کسی الاسٹک کی مانند بات کو کھینچ کر کہاں سے کہاں تک لے گئے ہیں۔'' وہ لمحہ بھر کو اپنا حوصلہ مجتمع کرنے کے لئے رکا پھر اصل بات کی طرف آتے ہوئے بولا۔
''میں تو معزز عدالت کو صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ ملزم کو ضمانت پر رہا کرنا انصاف کے تقاضوں اور قانون کے منافی ہوگا۔ جائے وقوعہ سے ایسے شواہد ملے ہیں جو ملزم کو مجرم ثابت کرنے کے لئے کافی ہوں گے۔ میں وہ تمام حقائق مناسب موقع پر عدالت کے سامنے لاؤں گا۔''
میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جنابِ عالی! مجھے وکیل استغاثہ کی دو باتوں پر سخت اعتراض ہے۔'' وکیل استغاثہ نے میرے اس اظہار پر بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے پراسرار انداز میں کہا۔ ''نمبر ایک، میں اپنے کیسز کی روداد کو کہانی کے رنگ میں نہیں لکھتا۔ قلم میرا میدان نہیں اور یہ میرے بس کا کام نہیں۔ یہ کام کسی اور شخص کے ذمے ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ میں کہانیاں لکھتے لکھتے کوئی کہانی کار بن گیا ہوں، بالکل غلط ہوگا۔ نمبر دو، میرے فاضل دوست نے رائی سے پہاڑ اور بات کا بتنگڑ کے حوالے سے ڈھکے چھپے الفاظ میں مجھے مبالغہ گو کہنے کی کوشش کی ہے جو کہ اخلاقی اصول کے منافی ہے اور جہاں تک ڈراما ہاؤس کا تعلق ہے تو بہت پہلے ولیم شیکسپیئر کہہ گیا تھا۔۔۔ یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور اس دنیا میں پایا جانے والا ہر شخص ایک کردار ہے جو ایک مخصوص اسکرپٹ کے مطابق اپنے حصے کا رول

ادا کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔اسی روشنی میں، میں یہ کہوں گا کہ میرے موکل کے خلاف جو استغاثہ تیار کیا گیا ہے وہ ایک سوچی سمجھی سازش (اسکرپٹ) کا نتیجہ ہے اسی لئے ایک ملزم کو بڑھ چڑھ کر مجرم گردانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ حالانکہ جب تک کسی ملزم کا جرم ثابت نہ ہو جائے اسے مجرم نہیں کہا جا سکتا۔''

جج ہماری اس باہمی بحث و تکرار سے مکدر نظر آنے لگا۔ اس نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ آپس میں الجھنے کی بجائے عدالت کی کارروائی کو آگے بڑھائیں تو اچھا ہے۔۔۔۔۔۔۔اور یہ کہ جب تک ملزم امین پر عائد الزام ثابت نہیں ہو جاتا اسے مجرم کہنے سے اجتناب برتا جائے۔''

وکیل استغاثہ نے کچھ بولنے کی بجائے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے کہا۔ ''جناب عالی۔۔۔۔۔۔۔! میرا موکل بے قصور ہے۔ اسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں ملوث کیا گیا ہے۔ اس کی گرفتاری سراسر بدنیتی پر مبنی ہے لہٰذا میں معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ ملزم کی درخواست ضمانت کو منظور کیا جائے۔''

قتل عمد کے کیس میں ملزم کی ضمانت آسانی سے نہیں ہوتی۔ اس حقیقت سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ تاہم میرا یہ سارا زور اس ذیل میں تھا کہ اگر میں اپنے موکل کی ضمانت نہ بھی کروا سکوں تو کم از کم استغاثہ پر دباؤ ضرور قائم ہو جائے۔

وکیل استغاثہ نے ضمانت کی مخالفت میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔ ''جنابِ عالی! استغاثہ کے پاس ایسے شواہد موجود ہیں جو ملزم کی جائے وقوعہ پر موجودگی اور محرکِ جرم کو ثابت کرتے ہیں۔ لہٰذا ملزم کی ضمانت پر رہائی آئندہ عدالتی کارروائی میں روک پیدا کر سکتی ہے۔ چنانچہ میں معزز عدالت سے پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ عدالت کی باقاعدہ کارروائی کے لئے تاریخ دے کر ملزم کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا جائے۔''

اس کے بعد ہم دونوں اپنے اپنے موقف کے حق میں دلائل دیتے رہے۔ جج نے پوری توجہ سے ہماری وضاحتیں سنیں اور ملزم کی ضمانت کی درخواست کو منسوخ کرتے ہوئے آئندہ پیشی کے لئے دس روز بعد کی تاریخ دے دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے عدالت کو برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ از ایڈجرنڈ!''

❀ ❀ ❀

دس روز کی یہ مدت پھیل کر دو ماہ تک دراز ہو گئی۔ اس دوران مختلف قسم کی عدالتی خانہ

پُریاں ہوتی رہیں۔ ان کارروائیوں کی تفصیل بیان کرنا آپ کو بور کرنے کے مترادف ہوگا اور میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ میں آپ کو براہِ راست عدالت کی باقاعدہ کارروائی کی طرف لے چلتا ہوں اور اس سے پہلے چند ضروری رپورٹس کا ذکر کرنا نہیں بھولوں گا۔

استغاثہ کی رپورٹ کے مطابق ملزم، مقتول سے شدید نفرت کرتا تھا اور ایک دو مواقع پر اسے قتل کی دھمکیاں بھی دے چکا تھا۔ اسے شک تھا کہ مقتول اس کی بیوی کے قریب ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ وقوعہ سے چند روز قبل مقتول کے دفتر پہنچا اور اسے سنگین نتائج کی دھمکی دے کر چلا آیا۔ اس نے گھر میں اپنی بیوی سے جھگڑا کرتے ہوئے بھی اس خیال کا اظہار کیا کہ اگر مقتول اور اس کی بیوی نے اپنی روش نہ بدلی تو پھر وہ کوئی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائے گا، وغیرہ وغیرہ۔ استغاثہ کے مطابق، وقوعہ کے روز ملزم کو جائے واردات سے افراتفری کے عالم میں فرار ہوتے ہوئے دیکھا گیا تھا بلکہ مقتول کی بیوی اس بات کی گواہ تھی کہ ملزم وقوعہ سے چند منٹ پہلے اس کے شوہر سے ملنے گھر پر آیا تھا۔ مقتول کی بیوی شائستہ بیگم کے مطابق وہ ملزم کو ڈرائنگ روم میں مقتول کے پاس چھوڑ کر خود گھر کے ایک دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد جب وہ کسی ضروری کام سے ڈرائنگ روم کی طرف گئی تو اس نے وہاں ایک وحشت ناک منظر دیکھا۔ مقتول پرویز شاہ ڈرائنگ روم کے فرش پر اپنے ہی خون میں لت پت پڑا تھا اور ملزم کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بے ساختہ باہر کی جانب دوڑی اور اس وقت اس نے ملزم کو بنگلے کے گیٹ سے نکل کر فرار ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ لپک کر بنگلے سے باہر نکلی اور شور مچا کر لوگوں کو اکٹھا کر لیا۔ بعدازاں اس واقعے کے بارے میں پولیس کو اطلاع دے دی گئی۔

پورٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول پرویز شاہ کی موت چھ اپریل کی سہ پہر تین اور پانچ کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ مقتول کو اعشاریہ تین دو کیلی بر کے ریوالور سے ہلاک کیا گیا تھا۔ مذکورہ ریوالور سے نکلنے والی دو مہلک گولیوں نے مقتول کے دل میں جگہ بنائی اور اسے ابدی نیند سلا دیا۔ اس رپورٹ میں ایک نکتے پر خاص زور دیا گیا تھا اور وہ یہ کہ مقتول کو براہِ راست فائرنگ کا نشانہ نہیں بنایا گیا تھا۔ علاوہ ازیں یہ بھی درج تھا کہ انتہائی قریب سے اسے شوٹ کیا گیا تھا۔ آلۂ قتل جائے واردات سے برآمد کر لیا گیا تھا۔

براہِ راست فائرنگ کا نشانہ نہ بنانے کی وضاحت پولیس چالان میں موجود تھی۔ جائے واردات پر سے وہ کشن بھی مل گیا تھا جسے مقتول کے سینے پر رکھ کر فائرنگ کی گئی تھی۔ یقیناً یہ طریقہ اپنانے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ فائرنگ کی آواز پیدا نہ ہو۔ گھائل کشن میں ایک بڑا سا

سوراخ بن گیا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ ریوالور کے بیرل کو ایک ہی مقام پر رکھ کر دو مرتبہ ٹریگر کو دبایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹی موٹی کئی باتیں تھیں جن میں سے ضروری اور اہم کا ذکر مناسب موقع پر کیا جائے گا۔

عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے میری ہدایت کے مطابق صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کے بیانات کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں نے جج سے درخواست کی کہ میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ جج نے میری درخواست کو منظور کر لیا۔ کسی بھی کیس کا انکوائری آفیسر ہر پیشی پر عدالت کے کمرے میں موجود ہوتا ہے۔ جج کے حکم پر مذکورہ انکوائری آفیسر گواہوں والے کٹہرے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔

انکوائری آفیسر ایک سب انسپکٹر تھا۔ استغاثہ کی جو رپورٹ عدالت میں پیش کی گئی تھی اس میں تفتیشی افسر کی کارکردگی کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا تھا۔ میں گواہوں والے کٹہرے کے نزدیک آیا اور انکوائری آفیسر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟''

''صادق علی۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''کیا آپ کو اپنے نام کے معنی معلوم ہیں؟'' میں نے استفسار کیا۔

''صادق علی ایک اچھا نام ہے۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس لئے اس کے معنی بھی اچھے ہی ہوں گے۔ ظاہر ہے، والدین سوچ سمجھ کر ہی اپنے بچوں کے نام رکھتے ہیں۔''

''صادق علی صاحب! آپ کی وضاحت میرے سوال کا جواب نہیں۔ بہر حال!'' میں نے لحاتی توقف کے بعد کہا۔ ''صادق علی کے لفظی معنی ہیں ـــــ شیرِ خدا سچے ہیں۔ والدین اپنی اولاد کا نام منتخب کرتے وقت اپنے دل میں یہ خواہش رکھتے ہیں کہ ان کا بچی یا بچہ اسم بامسمی ثابت ہو۔ کیا آپ بھی اپنے قول و فعل اور کارکردگی میں کھرے اور سچے واقع ہوئے ہیں؟''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ ناموں کی یہ بحث کیوں چھیڑ بیٹھے ہیں؟'' وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس سوال و جواب کا زیر سماعت کیس سے کیا تعلق ہے؟''

وکیل استغاثہ کو جھنڈا گاڑنے کا موقع مل گیا۔ جلدی سے بولا۔ ''انکوائری آفیسر صاحب! یہ اپنے بیگ صاحب اس قسم کی غیر متعلق جرح کے لئے خاصے مشہور ہیں۔ ابھی تو آغاز ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔''

جج نے گہری سنجیدگی سے مجھے مخاطب کیا اور کہا۔''بیگ صاحب! آپ آئی۔او سے صرف وہ سوال کریں جس کا پرویز مرڈر کیس سے تعلق بنتا ہو۔''

''اوکے یور آنر!'' میں نے تعظیمی انداز میں گردن کو خم کیا اور آئی۔او کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''آئی۔او (انکوائری آفیسر) صاحب! آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب دی گئی؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''تھانے کے روزنامچے کے مطابق، وقوعہ کے روز چار بجے سہ پہر اس قتل کی اطلاع دی گئی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔

''اطلاع کس نے فراہم کی اور کس ذریعے سے ــــــ؟''

''مقتول کی بیوہ شائستہ بیگم نے فون کر کے ہمیں بتایا تھا کہ کسی نے اس کے شوہر کو قتل کر دیا ہے۔'' انکوائری آفیسر نے بتایا۔

''پولیس کتنے بجے جائے وقوعہ پر پہنچی تھی؟''

''لگ بھگ ساڑھے چار بجے۔''

''ملزم کو کتنے بجے اور کہاں سے گرفتار کیا گیا؟''

''شام ساڑھے چھ بجے اس کے گھر، واقع نیو کراچی سے ہم نے اسے گرفتار کیا تھا۔''

''آپ نے کس کی نشان دہی پر ملزم کو گرفتار کیا تھا؟''

''میں سمجھا نہیں، آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟'' وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔''میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے مقتول پرویز شاہ کے قتل کے سلسلے میں میرے موکل ہی کو کیوں گرفتار کیا۔ کیا کسی شخص نے خاص طور پر اس جانب اشارہ کیا تھا یا آپ کوئی پراسرار قسم کا علم جانتے ہیں؟''

تفتیشی افسر نے ایک گہری سانس خارج کی اور بتایا۔''مقتول کے بنگلے پر اس وقت ایک دراز قامت شخص بھی موجود تھا۔ مقتول کی بیوہ شائستہ بیگم چونکہ ملزم کو شکل سے جانتی تھی۔ اس واقعے سے تھوڑی دیر پہلے وہ اس کے شوہر سے ملنے آیا تھا اور شائستہ اسے اپنے مقتول شوہر کے ساتھ ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر بنگلے کے ایک اندرونی کمرے کی طرف چلی گئی تھی ــــــ''

وہ سانس لینے کی خاطر متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو جوڑتے ہوئے بتانے لگا۔''جب مقتول کی بیوہ نے ملزم کا حلیہ تفصیل سے بیان کیا تو دراز قامت شخص نے فوراً اسے شناخت کر لیا۔ اسی دراز قامت شخص کی نشان دہی پر ہم نے ملزم کو اس کے گھر سے گرفتار کر لیا۔''

''آپ کی وضاحت سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ مذکورہ دراز قامت شخص ملزم کو اچھی طرح

جانتا ہے؟'' میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

''جی ہاں ــــــ اس میں کیا شک ہے!'' وہ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیا آپ معزز عدالت کو اس شخص کا نام بتانا پسند فرمائیں گے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''آپ نے یقیناً اس شخص کا بیان بھی قلمبند کیا ہوگا؟''

''جی ہاں ــــــ '' تفتیشی افسر نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ''میں نے نہ صرف اس شخص کا بیان لیا تھا بلکہ وہ استغاثہ کے اہم گواہوں میں بھی شامل ہے۔ اس دراز قامت شخص کا نام ہے فرید احمد۔''

''اوہ ــــــ!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا یہ صاحب وہ فرید احمد تو نہیں جو مقتول کے اسٹاف میں شامل ہے اور اس کی ڈیوٹی ادھر ناگن چورنگی والے دفتر میں ہوتی ہے؟''

''جی ہاں ــــــ جی ہاں۔'' وہ بڑی سرعت سے بولا۔ ''میں اسی فرید احمد کی بات کر رہا ہوں۔''

میں نے استغاثہ کے گواہوں کی فہرست پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دوبارہ تفتیشی افسر کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''آئی۔ او صاحب! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور آپ کے پیش کردہ چالان کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ مقتول کے سینے پر کشن رکھنے کے بعد فائرنگ کر کے اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ ماشاء اللہ! آپ نے مذکورہ سوراخ دار کشن اور آلۂ قتل جائے واردات سے برآمد کر لیا تھا۔ میں آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کو یہ دونوں چیزیں کہاں پڑی ملی تھیں؟''

وہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد گویا ہوا۔ ''صوفے کا کشن تو مقتول کی لاش کے پاس ہی پڑا ہوا ملا تھا۔ اس کا سوراخ بتاتا تھا کہ وہ سنگل فائر کا نتیجہ نہیں اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی اس بات کی تصدیق تو کرتی ہے۔ مقتول کے جسم میں سے بتیس بور کی دو گولیاں برآمد ہوئی ہیں اور آلہ قتل ــــــ!''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اس میز کی جانب بڑھا جہاں اس واردات میں استعمال ہونے والا ریوالور سیلوفین بیگ میں محفوظ تھا۔ اس نے وہ بیگ اٹھایا اور مجھے دکھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ ہے وہ آلۂ قتل جو ہمیں جائے وقوعہ پر پڑا ملا تھا۔ آپ نے پوچھا ہے، جائے وقوعہ پر کس جگہ ــــــ تو اس سوال کا جواب یہ ہے، پردوں کے عقب میں ڈرائنگ روم کی ایک دیوار کے ساتھ ترتیب

سے صوفہ سیٹ رکھا ہوا ہے۔ صوفہ سیٹ کے پیچھے پردہ لٹکا ہوا ہے۔ اسی پردے کے پیچھے یہ ریوالور پڑا ملا تھا۔''

''اور آپ کے خیال، بلکہ تحقیق و تفتیش کی روشنی میں آلۂ قتل کو میرے موکل نے اس پردے کے پیچھے پھینکا تھا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

''ظاہر ہے، اور کون پھینکے گا؟'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''جس نے قتل کی واردات کی ہے، یہ ریوالور بھی اسی نے پردے کے پیچھے پھینکا ہے۔''

''کیا آپ نے میرے موکل کو قتل کی واردات کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے سوال کیا۔

''آپ بھی کیسی عجیب بات کر رہے ہیں وکیل صاحب!'' وہ بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں تو وقوعہ کے وقت اپنے تھانے میں موجود تھا۔

''عجیب بات میں نے نہیں بلکہ آپ نے کی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کوئی عینی شاہد ہی اتنے وثوق سے یہ بات کر سکتا ہے۔''

وہ سٹ پٹائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''میں وقوعہ کے وقت جائے واردات پر موجود تھا اور نہ ہی میں نے اسے یعنی ملزم کو اپنی آنکھوں سے آلۂ قتل کو پردے کے پیچھے پھینکتے ہوئے دیکھا ہے۔''

میں نے کڑے لہجے میں دریافت کیا۔ ''اس کا مطلب ہے، آلۂ قتل کو پردے کے پیچھے ملزم کے علاوہ کوئی اور بھی پھینک سکتا ہے۔''

وہ چند لمحات تک خاموش رہنے کے بعد متذبذب انداز میں بولا۔ ''ہاں، ایسا ہو تو سکتا ہے لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول کے جسم سے برآمد ہونے والی دونوں گولیاں ـــــــــ''

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کو ہم بعد میں ڈسکس کریں گے۔'' میں نے ہاتھ اٹھا کر با آواز بلند کہا اور قطع کلامی کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ''آئی۔او صاحب! کیا آپ نے گرفتاری کے بعد ملزم کے فنگر پرنٹس لئے تھے؟''

''نہیں، ہم نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔'' وہ اُکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کیوں ضرورت محسوس نہیں کی؟'' میں نے پوچھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''دراصل، جب آلۂ قتل برآمد ہوا تو ہم نے اس پر قاتل کی انگلیوں کے نشانات کھوجنے کی کوشش کی تھی۔ اس کوشش کا نتیجہ صفر کے برابر نکلا۔ اس ریوالور پر

کوئی فنگر پرنٹس نہیں ملے۔'' اس نے سیلوفین بیگ میں موجود آلۂ قتل کی جانب اشارہ کیا اور مزید بولا۔''امکان اس بات کا ہے کہ ملزم نے ریوالور کو پردے کے پیچھے پھینکنے سے پہلے اس پر سے اپنے فنگر پرنٹس کو بالکل صاف کر دیا ہوگا۔''

بات ختم کر کے وہ خجل سے انداز میں جج کی جانب دیکھنے لگا۔اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر ہوتا تھا، اسے اپنے کہے کا خود بھی اعتبار نہیں ہے۔ میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے مگر طنزیہ لہجے میں کہا۔

''آئی۔او صاحب! آپ نے اپنی تفتیش کے سلسلے میں فنگر پرنٹس کے حوالے سے جو نئے نئے کارنامے انجام دینا شروع کئے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے بڑے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ بہت جلد آپ دو پھول سے تین پھول والے ہو جائیں گے۔''

وہ میرے طنز کو سمجھا یا نہیں، البتہ کھسیاہٹ آمیز نظر سے حاضرینِ عدالت کو دیکھنے لگا۔ میں نے سوال و جواب کے سلسلے کو موقوف کر دیا تو جج کی اجازت حاصل کر کے استغاثہ کا گواہ گل بادشاہ گواہی کے لئے کٹہرے میں آن کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے، عدالت سے یہ اس کا پہلا واسطہ ہے۔

گل بادشاہ اس پرائیویٹ کمپنی کا چوکیدار تھا جہاں میرا موکل ملازم تھا۔گل بادشاہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کروا دیا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ جرح کے لئے اس کے کٹہرے کے قریب چلا گیا۔

گل بادشاہ کی عمر چالیس سال کے قریب رہی ہوگی۔ اس کے سر کے سامنے والے بال ندارد تھے۔ قد درمیانہ اور جسم مائل بہ فربہی۔ وکیل استغاثہ نے اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم امین کی طرف دیکھا پھر گل بادشاہ کی توجہ اس طرف مبذول کروانے کے بعد مستفسر ہوا۔

''کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟''

''بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔'' گل بادشاہ نے جواب دیا۔''یہ ہمارے دفتر میں کام کرتا ہے۔''

''کیا یہ سچ ہے کہ ملزم بڑا غصے والا اور جھگڑالو قسم کا آدمی ہے؟''

''جی ہاں ـــــــ یہ بات سولہ آنے درست ہے۔''

''اور گل بادشاہ! تمہیں تو یہ معلوم ہی ہوگا کہ غصہ کتنی خطرناک چیز ہے۔'' وکیل استغاثہ نے بڑے ڈرامائی انداز میں دریافت کیا۔

''جی وکیل صاحب! آپ ٹھیک کہتے ہو۔ غصہ واقعی بہت خطرناک شے ہے۔'' گل بادشاہ

نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے چچا کالڑکا بہت غصے والا تھا۔ وہ ذرا سی بات پر غصے سے لال پیلا ہو جاتا۔ اکثر اس کا لوگوں سے جھگڑا ہوتا رہتا۔ آج کل وہ جیل میں ہے۔ اس نے غصے میں تین بندوں کو قتل کر دیا تھا۔''

بات ختم کرتے ہی گل بادشاہ نے سراسیمہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا۔ وکیل استغاثہ نے اگلا سوال کیا۔

''گل بادشاہ! کیا یہ درست ہے کہ ملزم کا اکثر و بیشتر دفتر والوں سے جھگڑا ہوتا رہتا تھا؟''

''جی ہاں! یہ بات بالکل درست ہے۔'' گل بادشاہ نے جواب دیا۔

''سننے میں آیا ہے، وقوعہ سے چند روز قبل ملزم نے تم سے ریوالور مانگا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے اس سوال کے اختتام پر فاتحانہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

گل بادشاہ نے اس سوال کا اثبات میں جواب دیا۔

وکیل استغاثہ نے جرح ختم کر دی۔

اپنی باری پر میں جج کی جانب سے وٹنس باکس کے نزدیک پہنچ گیا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور استغاثہ کے گواہ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''گل بادشاہ! تم گل ہو یا بادشاہ؟''

''وکیل صاحب! ہم گل ہے اور نہ بادشاہ۔'' وہ نہ سمجھنے والے انداز میں بولا۔ ''ہم صرف گل بادشاہ ہے۔''

''گل بادشاہ! تم نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ ملزم بڑا غصے والا اور جھگڑالو قسم کا آدمی ہے۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا کبھی تم سے اس کا جھگڑا ہوا تھا؟''

وہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولا۔ ''نہیں۔ ہم سے کبھی منہ ماری نہیں ہوا۔''

''تم نے وکیل استغاثہ کے ایک اور سوال کے جواب میں اس بات کی تائید کی ہے کہ ملزم کا اکثر و بیشتر دفتر والوں سے جھگڑا ہوتا رہتا تھا ـــــــ!'' میں نے اس کے چہرے پر نظر گاڑتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم دفتر میں نہیں ہوتے؟''

''ہم دفتر میں نہیں ہوگا تو پھر کدھر جائے گا۔'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''وکیل صاحب! ہم ادھر ڈیوٹی کرتا ہے۔ ہماری ایک ایک بات پر نظر ہے۔ ہم اس دفتر کا چوکیدار ہے۔''

''پھر ملزم کا کبھی تم سے جھگڑا کیوں نہیں ہوا؟''

''بس، نہیں ہوا تو نہیں ہوا۔''

''اس کا مطلب ہے، تمہاری حد تک وہ جھگڑالو نہیں ہے؟''

''آں ــــــ ہاں۔'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ میرے اس سوال کا کیا جواب دے۔

میں نے اُسے اُلجھن میں گرفتار رہنے دیا اور اپنی جرح کو سمیٹتے ہوئے اگلا سوال کیا۔ ''گل بادشاہ! تم نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ وقوعہ سے چند روز قبل ملزم نے تم سے ریوالور مانگا تھا۔ ذرا وضاحت کرو، کون سا ریوالور؟''

''ریوالور تو ریوالور ہوتا ہے وکیل صاحب!'' گل بادشاہ نے متذبذب انداز میں جواب دیا۔ ''اس میں کون سا والی کون سی بات ہے۔''

''تم شاید میرے سوال کو سمجھ نہیں سکے۔'' میں نے وضاحتی لہجے میں کہا۔ ''اس میں کون سا والی کون سی بات ہے یہ ہے کہ ملزم نے تم سے تمہارا ریوالور مانگا تھا یا کوئی اور؟''

''یہ تو اس نے بتایا ہی نہیں۔'' وہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ ''اور یقیناً اس نے تمہیں یہ بھی نہیں بتایا ہوگا کہ اسے کس مقصد کے لئے ریوالور چاہئے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

اس نے بڑی سرعت سے نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔ ''ہاں واقعی، اس نے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا۔''

''کیا تم نے اسے ریوالور مہیا کر دیا تھا؟''

''نہیں۔'' وہ قطعی لہجے میں بولا۔ ''ہم ایسی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا دماغ بہت گرم ہے۔ اس کے ہاتھ میں ہتھیار دینا ٹھیک نہیں تھا۔ ہم نے صاف منع کر دیا۔ پتہ نہیں، اس نے کہاں سے ریوالور حاصل کیا اور کسی شاہ جی کو قتل کر ڈالا۔''

''کیا یہ بات تمہیں کیل استغاثہ نے بتائی ہے یا تم نے خود اپنی آنکھوں سے یہ قتل ہوتے دیکھا تھا؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

''ہم خدا سے بہت ڈرتا ہے وکیل صاحب!'' وہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ ''مرنے کے بعد ہم کو اپنی قبر میں جانا ہے اس لئے ہم جھوٹ نہیں بولے گا۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر توبہ کے انداز میں اپنے کانوں کو چھوا اور اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ہم نے ملزم کو واردات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ بات ہم کو وکیل صاحب نے بتائی ہے۔''

''مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا جنابِ عالی!'' میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور جرح کے سلسلے کو موقوف کر دیا۔'' جج نے ایک ہفتے بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

❀❀❀

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے دو گواہ پیش کئے گئے۔ان میں سے ایک تو میرے موکل کا پڑوسی امداد حسین تھا۔وقوعہ سے ایک آدھ روز قبل ملزم اور اس کی بیوی کے درمیان خاصا زور دار جھگڑا ہوا تھا اور ان کی تیز و ترش آوازیں آس پڑوس میں بڑی واضح سنی گئی تھیں۔ملزم نے شدید غصے کے عالم میں اپنی بیوی سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر مقتول نے اپنی روش نہ بدلی تو وہ اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دے گا۔طیش کی حالت میں ملزم کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ امداد حسین کی صورت آج ایک گواہی بن کر عدالت تک پہنچ گئے تھے۔استغاثہ کی جانب سے امداد حسین اس بات کی تصدیق کرنے عدالت پہنچا تھا کہ اس کا پڑوسی خاصا غصہ ور اور جھگڑالو قسم کا شخص تھا اور اس نے مقتول کو قتل کرنے کی دھمکی دی تھی۔

دوسرا گواہ انہی لفنگوں میں سے ایک تھا جو ملزم اور اس کی بیوی پر آوازے کسا کرتے تھے۔ اس شخص کو ملزم کے خلاف زہر اُگلنے کا ایک نادر موقع مل گیا تھا۔سو اس نے اپنا جی ٹھنڈا کرنے کے لئے بڑھ چڑھ کر ارمان نکالے۔اس نے وکیل استغاثہ کی جرح کے جواب میں زور دے کر کہا کہ ملزم اپنی بیوی کے حوالے سے ایک خاص قسم کے مرضِ نفسیات میں مبتلا تھا۔اگر کوئی شخص اس کی خوبصورت بیوی کو نظر بھر کر بھی دیکھ لیتا تو وہ طیش میں آ جاتا اور فوراً مرنے مارنے پر تیار ہو جاتا۔قیصر نامی اس لفنگے استغاثہ کے گواہ نے یہاں تک کہہ دیا کہ ملزم نے کئی مرتبہ اسے بھی قتل کی دھمکی دی تھی حالانکہ اس نے تو ایک آدھ بار محض اس کی بیوی کو غور سے دیکھا تھا۔جب کہ ملزم کی بیوی نہ صرف یہ کہ مقتول کے دفتر میں ملازمت کرتی تھی بلکہ وہ اکثر و بیشتر اسے اپنی گاڑی میں گھر چھوڑنے بھی آتا تھا۔وغیرہ وغیرہ۔

امداد حسین اور قیصر محمود کے بیانات کا خلاصہ میں نے آپ کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ انہوں نے عدالت میں میرے موکل کے خلاف کوئی ایسا پہاڑ نہیں پچھاڑا جس کی تفصیل کو بیان کرنا ناگزیر ہو۔لہٰذا میں آپ کو آگے لئے چلتا ہوں۔

استغاثہ کی گواہیوں سے پہلے ملزم کا طویل بیان ریکارڈ کیا گیا تھا۔شاید میں اس کا ذکر کرنا بھول گیا ہوں۔فردِ جرم سے انکار کرنے کے بعد اس نے معزز عدالت کے روبہ رو حلفیہ بیان ریکارڈ کراتے ہوئے بتایا تھا کہ وقوعہ سے ایک آدھ رات پہلے اس نے غصے کی کیفیت میں اپنی بیوی سے جو کچھ کہا وہ ایک وقتی اشتعال اور جذباتی اُبال تھا۔دراصل وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بیوی کہیں ملازمت کرے ــــــــ وہ بیوی کے حوالے سے فوراً جیلس ہو جاتا تھا۔جب اس کی بیوی نے ملازمت چھوڑنے کے سلسلے میں اس کی کوئی بات نہیں مانی تو وہ اتمامِ حجت کے لئے

اس کے غیاب میں اس کے دفتر پہنچ گیا اور مقتول کو خاصی کھری کھری سنا ڈالیں۔ اس وقت تک ملزم کی بیوی دفتر نہیں پہنچی تھی۔ وہ اس غصیلی کارروائی سے صرف ایک مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا اور وہ یہ کہ اس کے طرزِ عمل کے ردِ عمل میں مقتول فوراً سے پیشتر اس کی بیوی کو ملازمت سے نکال دے۔ لیکن بہر حال، ایسا نہ ہو سکا۔

میرے موکل نے اپنا موقف عدالت پر واضح کرنے کے بعد بتایا کہ وقوعہ کے روز جب اسے لنچ سے فارغ ہوئے ابھی چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ اس کے لئے کسی اجنبی کا فون آ گیا۔ اس وقت دو پہر کے ڈھائی بجے تھے۔ اس نے فون سنا۔ دوسری طرف سے بولنے والے نے اسے بتایا کہ وہ اس کا ایک نادیدہ ہمدرد اور خیر خواہ ہے اور اس کی بیوی کے سلسلے میں اسے ایک اہم اطلاع دینا چاہتا ہے ـــــ بیوی اس کا انتہائی حساس مسئلہ تھا چنانچہ اس کا ذکر سنتے ہی ملزم کے کان کھڑے ہو گئے۔ پھر اس کے اضطراری اصرار پر فون کرنے والے اجنبی مخلص نے بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے مقتول اس کی بیوی کو ساتھ لے کر اپنے بنگلے کی طرف گیا ہے۔ اطلاع کنندہ کو شک ہے کہ مقتول کی نیت ٹھیک نہیں، مقتول اور اس کی بیوی کے درمیان پچھلے کچھ عرصے سے جو کھچڑی پک رہی ہے، شاید اس کے دستر خوان تک پہنچنے کا وقت آ گیا ہے۔ اگر وہ اپنی بیوی کو تباہی سے بچانا چاہتا ہے تو فوراً مقتول کے بنگلے پر پہنچ جائے۔

کسی بھی شوہر کے لئے اس کی بیوی کے حوالے سے اس نوعیت کی اطلاع بوکھلا دینے والی ہوتی ہے۔ میرا موکل بھی چکرا کر رہ گیا۔ اس نے اطلاع فراہم کرنے والے شخص سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور اس کا مقتول کے یا اس کی بیوی کے معاملات سے کیا تعلق ہے؟ دوسری طرف سے بولنے والے نے اس کے سوالات کا کوئی جواب نہیں دیا اور یہ کہتے ہوئے فون بند کر دیا کہ اس نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ اب [illegible] صوابدید پر ہے کہ وہ اپنی بیوی کی عزت کی حفاظت کرتا ہے یا کسی بے غیرت شوہر کی مانند آنکھیں بند کئے ایک طرف پڑا رہتا ہے۔

اس اطلاع نے میرے موکل کو ہلا کر رکھ دیا۔ تاہم افراتفری کے لمحات میں اس نے اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھا اور عقل مندی کا ایک کام کر ڈالا۔ اس زمانے میں کالر آئی ڈی کی سہولت ابھی متعارف نہیں ہوئی تھی کہ پتہ چلایا جا سکتا، اسے بیوی کے حوالے سے اطلاع فراہم کرنے والا کس نمبر سے بات کر رہا تھا۔ فوری طور پر میرے موکل کی سمجھ میں یہی آیا کہ وہ اپنی بیوی کے دفتر فون کرے تاکہ صحیح صورت حال کا علم ہو سکے۔ اس نے اس فیصلے پر پہنچتے ہی ''برائٹ فیوچر اسٹیٹ'' کے دفتر فون کیا اور کوشش کی کہ وہ آواز بدل کر بات کرے۔ وہ ایک آدھ روز پہلے اسی دفتر میں پہنچ کر اپنی بیوی کے حوالے سے اچھی خاصی ہنگامہ آرائی کر آیا تھا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا نام یا حوالہ سنتے ہی دوسری طرف سے فون بند کر دیا جائے یا پھر اسے کھری کھری سننا پڑیں۔

کئی گھنٹیوں کے بعد اس کی کال ریسیو کر لی گئی۔ دوسری طرف جو کوئی بھی تھا، وہ بہر حال پرویز شاہ ہرگز نہیں تھا۔ ملزم نے اپنے لہجے میں مصنوعی پن لاتے ہوئے پوچھا۔

''شاہ جی کہاں ہیں؟ مجھے ان سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔''

''شاہ جی تو اس وقت اپنے دفتر میں نہیں ہیں۔'' اسے جواب دیا گیا۔ ''آپ کو ان سے کیا کام ہے؟''

''کام تو میں بعد میں بتاؤں گا۔'' ملزم نے آواز کی تبدیلی والی اداکاری جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے آپ اپنا تعارف کرائیں۔''

ملزم کو امید تھی کہ دوسری جانب بولنے والا پرویز شاہ کا ساتھی فرید احمد ہوگا۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اسے بتایا گیا۔ ''میں شاہ جی کا خاص بندہ فرید بات کر رہا ہوں۔ آپ اسٹیٹ سے متعلق کوئی بھی معاملہ مجھ سے ڈسکس کر سکتے ہیں۔''

''بات تو مجھے شاہ جی ہی سے کرنا تھی۔'' ملزم نے متاسفانہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''وہ کہاں گئے ہیں اور کتنی دیر میں واپس آجائیں گے؟''

''وہ ایک نئی سائٹ کے معائنے کے لئے اورنگی کی طرف گئے ہیں۔'' فرید احمد نے بتایا۔ ''اور ان کی واپسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

''ان کی سیکرٹری تو دفتر میں موجود ہوگی۔ آپ اس سے میری بات کروا دیں۔'' ملزم نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ خاتون میرے مسئلے کو اچھی طرح سمجھتی ہیں۔''

''اتفاق سے فرزانہ بھی اس وقت دفتر میں موجود نہیں۔'' فرید نے بتایا۔

''کیا وہ بھی شاہ جی کے ساتھ گئی ہے؟'' ملزم نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

''نہیں۔'' فرید نے قطعی لہجے میں جواب دیا۔ ''دراصل فرزانہ کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا اس لئے شاہ جی جب دفتر سے نکلنے لگے تو انہوں نے اس سے کہا کہ وہ اگر چاہے تو شاہ جی اسے گھر پر ڈراپ کر دیں گے۔ لہٰذا وہ آج دفتر سے جلد چھٹی کر کے چلی گئی ہے۔ شاہ جی اسے گھر چھوڑ کر اورنگی کی طرف نکل جائیں گے۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ''آپ نے ابھی تک اپنے کام کے بارے میں بتایا ہے اور نہ ہی اپنا تعارف کرایا ہے۔''

جواب میں ملزم نے فون بند کر دیا۔ فرید احمد کے سوالات کا اس سے اچھا اور کوئی جواب ہو

ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے ریسیور تو کریڈل کر دیا لیکن اس کا ذہن تیز آندھیوں کی زد میں آ چکا تھا۔ فرید احمد سے ہونے والی گفتگو نے اسے یقین دلا دیا کہ پرویز شاہ فرزانہ کے ساتھ ہی گیا ہے ــــــ تو گویا تھوڑی دیر پہلے کسی مخلص، نادیدہ اجنبی نے فرزانہ کے حوالے سے اسے جو اطلاع فراہم کی تھی وہ سچ تھی۔

اس سنسنی خیز اور دماغ کی چولیں ہلا دینے والے سوال نے اسے سلگا کر رکھ دیا۔ اس کے جی میں آئی کہ اس کے پنکھ نکل آئیں اور وہ آنِ واحد میں پرواز کرتے ہوئے حیدری پہنچ جائے۔ فرزانہ کی زبانی اسے معلوم ہو چکا تھا کہ پرویز شاہ حیدری کے کس بنگلے میں رہتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان کی بہت ہی کم خواہشیں پوری ہوتی ہیں۔ ملزم کے پنکھ نکل سکتے تھے اور نہ ہی وہ پرواز کے قابل ہو سکتا تھا۔ مگر جائے واردات پر پہنچنا بھی ضروری تھا۔ لہٰذا وہ اپنی بساط اور اوقات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جلد از جلد منزل تک پہنچنے والی سواری پکڑ کر پرویز شاہ کے بنگلے واقع حیدری پہنچ گیا۔

اس وقت سہ پہر کے چار بجے تھے۔ ملزم کو یقین تھا کہ اگر اطلاع فراہم کرنے والے نے کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تو اس بنگلے میں اس وقت پرویز شاہ اور اس کی بیوی کے سوا اور کوئی نہیں ہوگا۔ بنگلے کا گیٹ بند تھا۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔

ان لمحات میں اس کا دماغ کسی دہکتے ہوئے تنور کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ ان سنگین ساعتوں میں اس نے ایک خطرناک فیصلہ کیا کہ اگر آج اس کی بیوی اس بنگلے سے برآمد ہو جاتی ہے تو وہ اس کا جو حشر کرے گا وہ دیکھنے والوں کے لئے تو عبرت کا باعث ہوگا ہی، اس کے ساتھ ہی خود فرزانہ کے لئے بھی کسی کڑی سزا سے کم نہیں ہوگا۔ انہی منتقمانہ سوچوں کے درمیان وہ پرویز شاہ کو بھی کوئی یادگار سبق سکھانے کی پلاننگ کر رہا تھا۔ لیکن جب ایک ادھیڑ عمر مگر خوب صورت عورت نے گیٹ کھول کر اس کی آمد کی وجہ دریافت کی تو وہ بھونچکا رہ گیا۔

وہ خوب صوت عورت اس کی بیوی فرزانہ نہیں بلکہ مقتول پرویز کی بیوہ شائستہ بیگم تھی۔ وہ عورت ملزم کے لئے اجنبی تھی۔ وہ بوکھلا گیا اور بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔

''میں پرویز شاہ سے ملنے آیا ہوں۔''

شائستہ بیگم نہایت ہی شائستگی سے اسے بنگلے کے اندر لے گئی۔

❀ ❀ ❀

شائستہ بیگم نے موسم کی مناسبت سے پرنٹیڈ لان کا ایک نفیس سوٹ زیب تن کر رکھا تھا اور

اس کی عمر کا تخمینہ پینتالیس کے قریب بنتا تھا لیکن اس نے خود کو بڑے سلیقے سے سنبھال رکھا تھا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا۔ اس کے بیان میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہ کم و بیش وہی باتیں تھیں جو وہ وقوعہ کے روز پولیس کو بتا چکی تھی۔

وکیل استغاثہ نے رسمی سی جرح کے بعد اسے فارغ کر دیا تو میں جج کی اجازت سے گواہوں والے کٹہرے میں کھڑی شائستہ بیگم کے پاس آ گیا۔ میں نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''شائستہ بیگم! آپ مقتول کو کب سے جانتی ہیں؟''

میرا یہ سوال اس کے لئے انتہائی غیر متوقع تھا۔ اس نے ناپسندیدہ نظروں سے گھور کر مجھے دیکھا اور کہا۔ ''میں آپ کے سوال کو سمجھ نہیں سکی۔ بہر حال، میں پرویز شاہ کو اس وقت سے جانتی ہوں جب ہماری شادی ہوئی تھی ـــــ یعنی کم و بیش سترہ سال سے۔''

''آپ اپنے ذہن کو نہ اُلجھائیں، میرے سوال کا جواب مل گیا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''آپ کے کتنے بچے ہیں؟''

''ہمارے بچے نہیں ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ دونوں میاں بیوی کے علاوہ بنگلے میں اور کون رہتا تھا؟''

''کوئی نہیں ـــــ صرف ہم دونوں ہی وہاں رہتے تھے۔'' اُس نے دُکھی لہجے میں بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا وقوعہ کے روز بھی آپ دونوں کے سوا اس بنگلے میں اور کوئی موجود نہیں تھا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''میرا اشارہ اس مخصوص دورانئے کی طرف ہے جب وہ اندوہ ناک واقعہ پیش آیا ـــــ یعنی سہ پہر تین بجے سے پانچ بجے کے درمیان؟''

اس نے ایک لحہ میرے سوال پر غور کیا اور بولی۔ ''جی نہیں، ہمارے سوا اس وقت بنگلے میں اور کوئی بھی نہیں تھا۔''

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کے مقتول شوہر عموماً کتنے بجے گھر سے نکل جاتے تھے؟''

''دس، سوا دس بجے تک۔''

''اور ان کی واپسی کب تک ہوتی تھی؟''

''واپسی کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔'' اس نے تامل کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''کبھی تو سات آٹھ بجے آ جاتے تھے اور کبھی دس گیارہ بھی بج جاتے۔ ان کی واپسی کا انحصار کاروباری

مصروفیات پر ہوتا تھا۔''

''سات آٹھ بجے۔'' میں نے گویا اس کے آخری جملے کو سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے وہ عام طور پر شام سے پہلے گھر نہیں آتا تھا؟''

''جی ہاں ـــــ کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' شائستہ بیگم نے گول مول جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''وقوعہ کے روز مقتول بھری سہ پہر میں اپنے بنگلے میں موجود تھا۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''ہاں ـــــ'' اُس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''دراصل، اس رات کو ہمیں ایک شادی کی تقریب میں جانا تھا۔ وہ گھر کے قریب سے گزر رہے تھے کہ آ گئے۔ میں نے ان کے ساتھ کچھ ضروری شاپنگ کے لئے جانا تھا اور انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ دن میں جب بھی موقع ملا وہ تھوڑی دیر کے لئے گھر کا چکر لگا لیں گے لیکن ـــــ'' اس کی آواز بھرا گئی۔ ''کیسی شاپنگ اور کیسی شادی کی تقریب ـــــ سب کچھ ختم ہو گیا ـــــ سب کچھ۔'' پھر وہ ملزم کی سمت انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے جذبات انگیز لہجے میں بولی۔ ''اس مردود نے ہماری خوشیاں لوٹ لیں۔''

ان لمحات میں وہ خاصی دل گرفتہ ہو رہی تھی۔ میں یہ اندازہ لگانے سے قاصر رہا کہ اس کی یہ دل گرفتگی حقیقی تھی یا مصنوعی۔

وہ تھوڑی دیر سنبھلی تو میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ ملزم کو جانتی تھیں؟''

''نہیں ـــــ'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''وقوعہ کے روز میں نے اسے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ میرے شوہر سے ملنے آیا ہے اور میں نے اسے ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا۔ مجھے کیا معلوم تھا، یہ بدبخت میرا سہاگ اُجاڑ کر چلا جائے گا۔''

''جب آپ نے ملزم کو ڈرائنگ روم میں پہنچایا تو اس کے بعد آپ بنگلے کے کسی اندرونی کمرے میں چلی گئی تھیں۔'' میں نے کہا۔ ''ڈرائنگ روم میں دو فائر ہوئے اور آپ کو اس فائرنگ کے بارے میں کوئی خبر نہ ہوئی۔ پھر جب آپ کو کوئی ضروری کام یاد آیا تو ـــــ''

''ایک منٹ ـــــ!'' اُس نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات ثابت شدہ ہے کہ ملزم نے وہ دونوں فائر کشن پر کئے جو مقتول کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔ اس کارروائی سے اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ فائرنگ کی آواز ڈرائنگ روم سے باہر نہ نکلے۔ اور پھر میں تو بنگلے کے اندرونی کمرے میں موجود تھی۔ علاوہ ازیں، میں نے ٹی وی آن کر رکھا تھا اس لئے بھی فائرنگ

کی موہوم آواز بھی مجھ تک رسائی حاصل نہ کرسکی۔"

"دیٹس رائٹ!" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "آپ کی وضاحت سمجھ میں آتی ہے۔" پھر پوچھا۔ "آپ کو اچانک ایسا کون سا کام یاد آ گیا جو آپ ڈرائنگ روم میں پہنچ گئیں؟"

"مجھے شاپنگ ہی کے سلسلے میں پرویز شاہ سے بات کرنا تھی۔" اس نے بیزاری سے کہا۔

میں نے پوچھا۔ "جس وقت یہ واقعہ پیش آیا، آپ میاں بیوی کے علاوہ بنگلے میں اور کون کون موجود تھا؟"

"یہ نامراد موجود تھا۔" اس نے نفرت انگیز انداز میں ملزم امین کی جانب انگلی اٹھا دی۔

"جب آپ کسی ضروری کام سے ڈرائنگ روم میں پہنچیں تو آپ کے بیان کے مطابق ملزم بنگلے سے نکلنے کی کوشش میں تھا۔ جب تک آپ ڈرائنگ روم سے نکل کر بیرونی دروازے تک پہنچتیں، ملزم بنگلے کا گیٹ کھول کر وہاں سے فرار ہو چکا تھا۔ اس کے بعد آپ نے کیا، کیا؟"

"میں نے آس پاس کے لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنے کے لئے واویلا مچایا اور لوگ میرے بنگلے کے سامنے جمع ہو گئے۔ اس کے بعد ہی پولیس کو اطلاع دے دی گئی۔"

"جو لوگ آپ کی چیخ و پکار پر جمع ہوئے ان میں سے کسی نے ملزم کو پکڑنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟" میں نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔ "آپ کی اطلاع پر، پولیس آپ کے بنگلے تک پہنچ گئی۔" میں نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "انہوں نے لاش کا معائنہ کیا، آلۂ قتل برآمد کیا اور ضروری کارروائی کے بعد ملزم کی گرفتاری کے لئے نیو کراچی کی جانب روانہ ہو گئے۔" میں لمحہ بھر کو سانس لینے کی غرض سے رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "انکوائری آفیسر کے مطابق، ملزم کی نشان دہی کے لئے فرید احمد نامی ایک شخص نے بڑی سرگرمی دکھائی دی۔ آپ کے بیان کردہ ملزم کے حلیے کو فرید نامی اس شخص نے فوراً شناخت کرلیا اور پولیس کو بتایا کہ وہ نیو کراچی کے کس ایریا میں رہائش پذیر ہے۔ گویا ملزم کی گرفتاری میں فرید احمد کا غالب ہاتھ ہے۔ آپ سے میرا صرف اتنا سا سوال ہے۔"

میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ "کیا فرید نامی یہ شخص جائے واردات پر پہلے سے موجود تھا؟"

"آں، ہاں ـــــ نن، نہیں ـــــ" وہ گڑبڑا گئی۔ پھر جلد ہی سنبھلتے ہوئے بولی۔ "فرید پولیس کی آمد کے تھوڑی دیر بعد بنگلے پر پہنچا تھا اور ـــــ اور میں نے خود اسے بلایا تھا ـــــ ورنہ اس وقت فرید کا بنگلے پر کیا کام؟"

اس کی گھبراہٹ اور زبان کی لکنت نے مجھ پر واضح کر دیا کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہی ہے اور اس دروغ گوئی کو نبھانے کے لئے مزید جھوٹ کا سہارا لے رہی ہے۔ میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا اور قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''آپ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے، فرید نامی یہ شخص آپ کی فیملی کے بہت قریب ہے اسی لئے مصیبت کے وقت آپ نے اسے آواز دی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں ـــــ آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''فرید احمد میرے شوہر کے آفس میں کام کرتا ہے اور خاصا ذمے دار شخص ہے۔ وہ ہمارے لئے ایک فیملی ممبر کی مانند ہے۔ میں نے اس اندوہ ناک صورتِ حال میں فرید کو فون کیا اور وہ دفتر بند کر کے فوراً میرے پاس چلا آیا۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ نے پہلے پولیس کو بلانے کے لئے فون کیا تھا یا فرید کو؟''

''میں نے پہلے پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے سوالات کی ترتیب میں گڑبڑ کر کے اس کی زبان سے سچ اُگلوانے کی کوشش کی۔

''فرید احمد نامی آپ کا یہ خیر خواہ کتنے بجے تک بنگلے پر پہنچ گیا تھا؟''

''میرا خیال ہے اس وقت سہ پہر کے پونے پانچ بجے تھے۔''

''آپ نے پولیس کو کتنے بجے فون کر کے اس اندوہ ناک واقعے کی اطلاع دی تھی؟''

''میں نے گھڑی میں ٹائم تو نہیں دیکھا۔'' وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔ ''لیکن میرا خیال ہے اس وقت سہ پہر کے چار بجے ہوں گے۔''

''آپ کا اندازہ قطعی درست ہے۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''پولیس کے روزنامچے میں اس اطلاع کا وقت چار بجے ہی درج ہے۔''

وہ اُلجھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس سے اس قسم کے سوالات کیوں پوچھ رہا ہوں اور اس سے پہلے کہ وہ سمجھنے کی کوشش کرتی، میں نے ایک اور تیکھا سوال کر دیا۔

''شائستہ بیگم! کیا آپ کو کچھ اندازہ ہے، پولیس کتنے بجے تک آپ کے بنگلے پر پہنچ گئی تھی؟''

وہ حتمی لہجے میں بولی۔ ''ساڑھے چار بجے۔''

انکوائری آفیسر نے بھی میری جرح کے جواب میں جائے وقوعہ پر اپنی آمد کا یہی وقت بتایا تھا۔ میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے درخواست کی۔

''یور آنر! اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اس کیس کے آئی۔ او صاحب سے ایک بات کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔''

انکوائری آفیسر کا ہر پیشی پر عدالت میں موجود رہنا لازمی ہوتا ہے۔ جج نے مجھے اجازت دے دی۔ آئی۔ او سب انسپکٹر صادق علی وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحات کے لئے شائستہ بیگم کو کٹہرے سے ہٹا دیا گیا تھا۔ میں نے آئی۔ او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نہایت ہی ٹھوس انداز میں سوال کیا۔

''سب انسپکٹر صاحب! چند روز قبل آپ نے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ آپ نے ایک دراز قامت شخص فرید احمد کی نشاندہی پر ملزم کو اس کے گھر واقع نیو کراچی سے گرفتار کیا تھا۔ مزید آپ کا ہی یہ بیان بھی تھا کہ مذکورہ دراز قامت شخص اس وقت بنگلے پر موجود تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں وکیل صاحب! آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''جب میں موقع کی کارروائی کر رہا تھا تو وہ دراز قامت شخص وہاں موجود تھا۔ وہ مقتول کی بیوہ کے لئے خاصا پریشان نظر آتا تھا۔''

''آپ نے یہ بھی تصدیق کی تھی کہ جائے واردات پر آپ کی آمد کا وقت سہ پہر ساڑھے چار بجے تھا؟'' میں نے تیکھے انداز میں سوال کیا۔ ''آپ کے اس بیان کی تصدیق استغاثہ کی گواہ شائستہ بیگم کے بیان سے بھی ہوئی ہے۔ بہر حال۔'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ سے اس وقت میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں آئی۔ او صاحب! کہ آپ نے ملزم کو اپنے ہاتھوں سے گرفتار کیا ہے اور مقتول کی لاش کو الٹ پلٹ کر بھی آپ ہی نے معائنے کی نگاہ سے گزارا ہے۔ لہٰذا ملزم اور مقتول کی جسمانی صحت آپ سے ڈھکی چھپی نہیں رہ سکتی۔ کیا یہ ——— کیا یہ ——— کیا یہ ممکنات میں سے ہے کہ ملزم جیسا سنگل ——— نہیں بلکہ آدھی پسلی کا یہ نحیف و ضعیف شخص مقتول جیسے ہٹے کٹے، تنومند شخص کو پچھاڑ سکے۔ نہ صرف پچھاڑ سکے بلکہ اس کے سینے پر کشن رکھ کر سوار بھی ہو جائے ——— نہ صرف سوار ہو جائے بلکہ براستہ کشن اس کے سینے میں دو مہلک گولیاں بھی اتارنے میں کامیاب ہو جائے ——— بتائیں آئی۔ او صاحب! ہاؤ کین اِٹ پاسبل؟''

''بظاہر یہ ممکن تو دکھائی نہیں دیتا۔'' بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔

''اور بہ باطن؟'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔

''وہ بات یہ ہے جناب ـــــ'' وہ اچانک پلٹا کھاتے ہوئے بولا۔ ''واقعات و حالات کی روشنی میں ـــــ''

''اس روشنی کی فی الحال ضرورت نہیں ہے۔ عدالت کے کمرے میں اچھا خاصا اُجالا موجود ہے آئی۔ او صاحب!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے میرے سوالات کے بالکل درست جوابات دیئے۔ مجھے آپ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

میرے آخری جملے پر جج نے انکوائری آفیسر کو کٹہرے سے نکلنے اور شائستہ بیگم کو وہاں کھڑا ہونے کی ہدایت کر دی۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور دوبارہ مقتول کی بیوی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''شائستہ بیگم! میں آپ سے مقتول اور ملزم کی صحت کا موازنہ نہیں کراؤں گا کیونکہ شاید یہ کام آپ سے ہو نہ سکے۔ ملزم کو آپ نے صرف ایک مرتبہ چند لمحات کے لئے دیکھا تھا۔ بہرحال میں آپ سے ایک نہایت ہی اہم سوال پوچھ رہا ہوں اور یہ اس جرح کا آخری سوال بھی ہوگا۔ ذرا سوچ سمجھ کر جواب دیجئے گا۔''

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔

''شائستہ بیگم! آپ نے معزز عدالت کے روبرو ابھی اقرار کیا ہے کہ آپ نے ایک فون پولیس کو کیا اور دوسرا فرید احمد کو۔ آپ کے بیان کے مطابق پولیس ساڑھے چار بجے جائے واردات پر پہنچ گئی اور فرید احمد پونے پانچ بجے وہاں پہنچا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جب پولیس آپ کے بنگلے پر آئی، فرید احمد وہاں موجود نہیں تھا۔ لیکن حالات و واقعات اور آئی۔ او کی تصدیق تو کوئی اور ہی کہانی سنا رہی ہے۔ آئی۔ او کے مطابق دراز قامت فرید احمد نامی وہ شخص بنگلے پر موجود تھا اور اسی نے ملزم کی گرفتاری کے سلسلے میں بھرپور تعاون کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ کیا ماجرا ہے؟ آپ کا بیان آئی۔ او کے بیان سے لگا کیوں نہیں کھاتا؟''

وہ لمحہ بھر کے لئے متزلزل ہوئی پھر ہٹ دھرمی کے سے انداز میں بولی۔ ''میں نے آپ کو جو کچھ بتایا ہے وہی درست ہے۔ آئی۔ او صاحب کو وقت کے سلسلے میں کوئی غلطی ہو گئی ہوگی۔''

میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔ ''شائستہ بیگم ـــــ! آپ اس کیس کی مدعی ہیں اور سب انسپکٹر صاحب اس کیس کے انکوائری آفیسر۔ استغاثہ کا دارومدار آئی۔ او کی رپورٹ پر ہے۔ اگر آپ اپنے بیان میں راسخ ہیں تو پھر آئی۔ او صاحب جھوٹے پڑ جائیں گے۔ آپ دونوں کا متحد رہنا ضروری ہے۔ یہ پھوٹ آپ کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کرے گی۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے اس بات کا؟''

وہ جز بز ہو کر کبھی وکیل استغاثہ اور کبھی انکوائری آفیسر کو دیکھنے لگی۔ جج نے قدرے سخت لہجے میں اس سے دریافت کیا۔ ''بی بی ــــــ! تم وکیل صاحب کے سوال کا واضح جواب دو۔''

''وکیل صاحب! آپ نے مجھ سے کیا پوچھا تھا؟'' وہ مجھ سے پوچھ بیٹھی۔

وہ اس وقت بہت زیادہ نروس ہو رہی تھی۔ کچھ تو میری جرح نے زچ کر کے اسے لاجواب کر رکھا تھا، اس پر جج کے سخت استفسار نے اسے مزید بوکھلا دیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ اسی ناسمجھی میں وہ مجھ سے سوال کر بیٹھی تھی۔

میں نے اس کے پوچھنے کے جواب میں اپنا سوال دہرا دیا۔ وہ اپنے موقف سے ایک انچ اِدھر اُدھر نہ ہٹی اور اٹل لہجے میں بولی۔

''فرید احمد، پولیس کی آمد کے بعد وہاں پہنچا تھا۔ اس وقت جائے وقوعہ پر ایسی افراتفری مچی ہوئی تھی کہ وقت ناپنے کا کسے ہوش تھا۔ اسی سبب آئی۔ او صاحب کو غلط فہمی ہو گئی ہو گی۔''

بات ختم کرتے ہی وہ بوکھلاہٹ آمیز نظر سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ وکیل استغاثہ اور انکوائری آفیسر کو اس کا جواب بھی پسند نہیں آیا تھا تاہم انہوں نے اس موقع پر بلبلانے یا واویلا مچانے کی کوشش نہیں کی۔ صرف شکایتی نظروں سے اسے گھور کر رہ گئے۔

''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جنابِ عالی!'' میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے جرح ختم کر دی۔

عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں تھوڑی دیر باقی تھی لہٰذا استغاثہ کی طرف سے ایک اور گواہ کو پیش کر دیا گیا۔ اس شخص کا نام منظور تھا، منظور کی گلی کے آخری سرے پر ایک دکان تھی جہاں وہ سگریٹ اور کولڈ ڈرنکس فروخت کرتا تھا۔ جہاں سگریٹ فروخت ہوتی ہو وہاں پان کی فروخت بھی ایک لازمی بات ہے۔ بہر حال، منظور اس بات کا گواہ تھا کہ اس نے وقوعہ کے روز ملزم کو افراتفری اور نہایت ہی ہنگامی انداز میں جائے وقوعہ سے فرار ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔

وکیل استغاثہ کافی دیر تک گھما پھرا کر اس سے مختلف سوال کرتا رہا جس کا لب لباب یہی تھا کہ ملزم وقوعہ کے روز جائے واردات سے فرار ہوتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ اس نے گواہ پر زیادہ جرح نہیں کی۔ اس تمام تر جرح میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جسے بیان کیا جائے لہٰذا میں آپ کو بور کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ فہرست کے مطابق، استغاثہ کا صرف ایک گواہ بچا تھا یعنی فرید احمد لیکن عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

جج نے نئی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

اگر اس روز فرید احمد عدالت میں موجود بھی ہوتا تو وقت کی تنگی کے باعث اس کی گواہی ممکن نہیں تھی۔ جج نے وکیل استغاثہ کو تاکید کر دی کہ آئندہ پیشی پر استغاثہ کے گواہ فرید احمد کو ضرور

عدالت میں پیش کیا جائے۔ دراصل، آئی۔او اور شائستہ بیگم پر جرح کے دوران چند ایسے نکات اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے جن کی تصدیق یا تردید فرید احمد ہی کر سکتا تھا۔

❁ ❁ ❁

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں فرید احمد کھڑا تھا۔

یہ شخص بڑی مشکل سے قابو آیا تھا۔ گزشتہ پیشی پر جج نے دس دن بعد کی تاریخ دی تھی لیکن اب اس بات کو ڈیڑھ ماہ سے زیادہ گزر گیا تھا۔ اس دوران ایک مرتبہ گواہ کی ناسازئ طبیعت کی درخواست پہنچ گئی اور ایک بار وکیل استغاثہ بہ وجوہ عدالت میں حاضر نہ ہو سکا۔ بہر حال، اس وقت وہ بہ نفسِ نفیس وٹنس باکس میں موجود تھا۔

اس کا حلفیہ بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل استغاثہ نے جج کی اجازت سے جرح شروع کر دی۔ اس کا سارا زور یہ ثابت کرنے کے لئے تھا کہ ملزم ایک انتہائی غصہ ور اور جھگڑالو قسم کا شخص تھا۔ وہ اس دھمکی کا پکا گواہ تھا جو کچھ عرصہ پہلے ملزم نے مقتول کے آفس پہنچ کر اسے دی تھی۔ گواہ کے مطابق ملزم نے مقتول کو بڑے واشگاف انداز میں یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ اگر وہ باز نہ آیا تو کوئی بھی خطرناک نتیجہ سامنے آ سکتا ہے اور گواہ کے مطابق وہ خطرناک نتیجہ پرویز شاہ کی موت کی صورت میں سامنے آیا تھا۔ بہر حال، میں اپنی باری پر جرح کے لئے فرید والے کٹہرے کے قریب چلا گیا۔ میں نے اس شخص سے نمٹنے کے لئے بڑی خاص تیاری کی تھی۔ کیس کی فائلوں میں سر کھپانے کے علاوہ مجھے باہر نکل کر کچھ فیلڈ ورک بھی کرنا پڑا تھا۔ بہر حال میں اپنی تیاری سے مطمئن تھا۔

میں نے دراز قامت فرید احمد کا بہ غور جائزہ لیا۔ اس نے خاصی تگڑی مونچھیں پال رکھی تھیں۔ اس کی صحت کو قابلِ رشک کہا جا سکتا تھا۔ اسے دیکھ کر کہیں سے بھی نہیں لگتا تھا کہ وہ پچھلے دنوں بیمار رہا ہوگا۔ کسی طاقت ور سے طاقت ور شخص کو اگر ایک دن بھی بخار آ جائے تو وہ جھٹک کر رہ جاتا ہے لیکن ہفتے بھر کی بیماری نے بھی فرید کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ وہ ایک دم صحت مند اور تر و تازہ دکھائی دیتا تھا۔

میں نے ہمدردانہ لہجے میں اس کی مزاج پرسی کی۔ ''فرید صاحب! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''بس ٹھیک ہے۔'' وہ اپنی آواز میں نقاہت بھرتے ہوئے بولا۔

میں اس کی اداکاری کے تاثر میں نہیں آیا اور جارحانہ انداز میں جرح شروع کر دی۔ ''آپ کو وہ دن تو یاد ہوگا جب پرویز شاہ کے قتل کا واقعہ پیش آیا تھا۔ چھ اپریل ______''

اس کیس کو عدالت میں لگے ہوئے چار ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، یاد ہے۔ آپ پوچھیں کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

میں نے پوچھا۔ ''وقوعہ کے روز دوپہر، بلکہ سہ پہر تین بجے آپ کہاں تھے؟''

''میں کہاں ہوں گا، اپنے دفتر ہی میں تھا۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''مقتول کی بیوہ کا دعویٰ ہے کہ اس نے لگ بھگ ساڑھے چار بجے فون پر آپ کو پرویز شاہ کے قتل کی اطلاع دی اور آپ کم و بیش پندرہ منٹ کے اندر آفس بند کر کے اس کے بنگلے پر پہنچ گئے ــــــ یعنی پونے پانچ بجے کے قریب۔''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، میں بیگم صاحبہ کا فون سن کر ہی دفتر سے اٹھا تھا۔ وہ اطلاع ہی ایسی تھی کہ میں ایک لمحہ بھی دفتر میں نہیں رک سکا تھا لیکن ــــــ'' وہ لمحہ بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''وقت کے سلسلے میں بیگم صاحبہ کو تھوڑا مبالغہ ہو رہا ہے اور اس کی وجہ وہ پریشانی ہے جس میں وہ اس وقت گھری ہوئی تھیں۔ اس قسم کی صورتِ حال میں ایسا ہو جاتا ہے۔ بہرحال، میں کم و بیش ساڑھے چار بجے ہی بنگلے پر پہنچا تھا۔ تاہم پولیس مجھ سے چند منٹ بعد وہاں پہنچی تھی۔''

''ناگن چورنگی سے مقتول کے گھر تک کتنے منٹ کی ڈرائیو ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''یہ بات میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ مجھے پتہ چلا ہے، آپ بائیک پر سوار ہو کر آئے تھے؟''

''آپ کو بالکل درست پتہ چلا ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے سوا چار بجے آفس بند کیا تھا اور لگ بھگ پندرہ منٹ میں، میں مقتول کے بنگلے پر پہنچ گیا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے، آئی۔او کا یہ بیان صحیح ہے کہ جب وہ لوگ جائے واردات پر پہنچے تو آپ وہاں موجود تھے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور آپ ہی کی نشان دہی پر ملزم کو اس کے گھر سے گرفتار کیا گیا تھا!''

''جی ہاں، حقیقت یہی ہے۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ نے ملزم کی نشاندہی اتنے بھرپور انداز میں کی تھی کہ لگتا ہے آپ اس سے خاصی گہری واقفیت رکھتے ہیں ــــــ اسے پہچانتے ہیں؟''

''میں نے اس واقعے سے پہلے ملزم کو صرف ایک مرتبہ دیکھا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اور وہ دیکھنا ایسا یادگار تھا کہ میں اس کی شکل کو قیامت تک بھلا نہیں سکتا۔ اس کا ایک ایک نقش میرے حافظے میں نقش ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ اپنی اوقات اور صحت سے زیادہ اُچھل اُچھل کر باتیں کر رہا تھا اور پرویز صاحب کو پتہ نہیں، کہاں کہاں کی خطرناک دھمکیاں دے رہا تھا۔ مجھے

اُس کی اس پُر اشتعال حرکت پر غصے کی بجائے ہنسی آئی تھی۔ شاہ جی کے مقابلے میں وہ ایسا ہی تھا جیسے ہاتھی کے سامنے کوئی مریل سا چوہا کھڑا ہو۔''

''غالباً آپ اس واقعے کا ذکر کر رہے ہیں جس پر وکیل استغاثہ نے خاصی لمبی چوڑی جرح کی ہے۔'' میں نے کہا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا، میں نے کہا۔ ''فرید صاحب! آپ نے بہت اچھی بات کی ہے، بہت ہی خوبصورت مثال دی ہے ـــــ ہاتھی کے مقابلے میں مریل سا چوہا۔ اس مثال سے اگرچہ میرے موکل کی توہین کا پہلو نکلتا ہے لیکن یہ نکتہ اتنا اہم ہے کہ میرے موکل کی بے گناہی کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔''

وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا پھر پوچھ بیٹھا۔ ''وہ کس طرح؟''

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''فرید صاحب! آپ نے وقوعہ کے روز سوا چار بجے ''برائٹ فیوچر اسٹیٹ'' کا دفتر بند کر دیا تھا۔ اس دفتر میں آپ کے علاوہ ملزم کی بیوی فرزانہ بھی ملازمت کرتی تھی۔ کیا وہ بھی سوا چار بجے ہی گھر چلی گئی تھی یا وہ اس سے پہلے جا چکی تھی؟''

''ہم ایک ساتھ ہی آفس سے نکلے تھے۔'' وہ میرے بچھائے ہوئے جال میں قدم ڈالتے ہوئے بولا۔ ''فرزانہ ناگن چورنگی کی طرف سے نیو کراچی چلی گئی اور میں حیدری کی جانب آ گیا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے، سوا چار بجے تک فرزانہ بھی آپ کے ساتھ دفتر میں موجود تھی؟''

''جی ہاں ـــــ میرے کہنے کا مطلب یہی تھا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا یہ صحیح ہے کہ آپ کے آفس کے برابر میں پرنس پارٹی ڈیکوریٹر کی دکان ہے جس کے مالک کا نام ہے اکرام بھٹی۔ پرنس ڈیکوریٹر صبح گیارہ بجے سے رات دس بجے تک کھلا رہتا ہے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

''ہاں ـــــ میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔'' وہ جلدی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اور آپ پرنس ڈیکوریٹر کے بارے میں جو کچھ بتا رہے ہیں وہ بھی سولہ آنے درست ہے۔''

میں نے اچانک سوالات کا زاویہ بدل دیا اور پوچھا۔ ''وقوعہ کے روز لگ بھگ تین بجے آپ کے آفس میں کسی کا فون آیا تھا۔ وہ مقتول کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ جب آپ نے بتایا کہ مقتول آفس میں موجود نہیں تو وہ مقتول کی سیکرٹری کے بارے میں پوچھنے لگا۔ آپ نے اس سے کہہ دیا کہ سیکرٹری کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا لہٰذا وہ چھٹی لے کر گھر چلی گئی۔ شاہ جی کے حوالے سے آپ نے بتایا کہ وہ کسی نئی سائٹ کے معائنے کے لئے اورنگی گئے ہیں۔ اسی

دوران اس شخص نے فون بند کر دیا تھا؟''

''ہاں، ہاں ـــــــ مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایسا فون آیا تو تھا'' وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تو وہ کوئی جھکی سا لگا تھا اسی لئے میں نے فرزانہ سے اس کی بات نہیں کرائی تھی۔ شاہ جی تو خیر اس وقت واقعی آفس میں موجود نہیں تھے۔'' وہ لمحہ بھر کو رکا، پھر سنجیدگی سے بولا۔ ''دکانداری میں ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے وکیل صاحب! ایک سے ایک پاگل ٹکراتا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''اگر میں آپ کو اس جھکی اور پاگل شخص سے ملوا دوں جس نے وقوعہ کے روز تین بجے سہ پہر آپ کو فون کیا تھا تو آپ کے تاثرات کیا ہوں گے؟''

''کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟'' وہ آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔

''نہ صرف جانتا ہوں بلکہ ابھی اور اسی وقت میں آپ کو اس شخص سے ملوا بھی سکتا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''آپ کہیں مذاق تو نہیں کر رہے وکیل صاحب؟'' وہ مجھے شک کی نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے ملزم امین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ پر اسرار شخص یہی تو تھا۔ اس نے آواز بدل کر آپ سے گفتگو کی تھی۔'' پھر میں نے اس گفتگو کی حقیقت فرید احمد کے گوش گزار کر دی۔

''کیا واقعی؟'' وہ حیرت سے معمور آواز میں بولا۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا ـــــــ یہ ایسا لگتا تو نہیں ہے۔''

''ہے نا؟'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ شخص واقعی ایسا نہیں دکھائی دیتا جس قسم کے واقعات اس سے منسوب کر کے بیان کئے جا رہے ہیں جیسا کہ ـــــــ'' میں نے دانستہ تھوڑا سا ڈرامائی توقف کیا پھر کہا۔

''جیسا کہ استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ اس ہڈیوں کے کہنہ سال پنجر نے گراں ڈیل مقتول کے سینے پر سوار ہو کر کشن کے راستے اس کے سینے میں دو مہلک گولیاں اُتاری ہیں ـــــــ فرید صاحب! جس طرح آپ کو یقین نہیں آ رہا کہ اس نے آواز بدل کر آپ سے گفتگو کی تھی اور جس طرح آپ کو یقین نہیں آ رہا کہ وقوعہ سے چند روز قبل اس نے اُچھل اُچھل کر مقتول کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دی تھیں۔ بالکل ویسے ہی مجھے ـــــــ اور کسی کو بھی یقین نہیں آئے گا کہ مقتول کی موت جس انداز میں واقع ہوئی ہے وہ ملزم ہی کا کارنامہ ہے لیکن آپ اور استغاثہ کی پوری مشینری یہی ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہے کہ پرویز شاہ کو میرے موکل نے قتل کیا ہے ـــــــ!''

میں نے جملہ نامکمل چھوڑا تو وہ سمجھ گیا، میں اسے اپنے دام میں لانے کی چال چل رہا

ہوں۔ وہ قدرے برہمی سے بولا۔ ''اس دنیا میں سب کچھ ہوسکتا ہے ــــــ سب کچھ ــــــ!''

''ہاں واقعی، سب کچھ ہوسکتا ہے۔'' میں نے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔ ''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ وقوعہ کے روز سہ پہر سوا تین بجے آفس بند کردیں۔ فرزانہ کو چھٹی دے کر گھر بھیج دیں اور خود بیگم صاحبہ کے بنگلے کی راہ لیں۔ لیکن حیرت انگیز طور پر آپ سوا چار بجے اسی دفتر میں بیٹھ کر بیگم صاحبہ کی کال سنیں۔ وہ آپ کو بتائیں کہ کسی نامراد نے ان کے شوہر کو قتل کردیا ہے، آپ فوراً بنگلے پر پہنچیں۔ اور آپ فرزانہ کو نیو کراچی کی طرف روانہ کر کے مقتول کے بنگلے پر پہنچ جائیں اور ــــــ''

''یہ کیا بکواس ہے؟'' اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ میں نے میٹھی چھری سے اس کے حوصلے کو بڑی بے دردی سے ذبح کر ڈالا تھا۔ وہ جارحانہ لہجے میں بولا۔ ''آپ یہ کس قسم کی فضول باتیں کررہے ہیں؟''

جج نے اس ''بہادری'' پر اسے سخت ڈانٹ پلائی اور تنبیہی لہجے میں کہا۔ ''مسٹر فرید! اپنی آواز کو قابو میں رکھو ورنہ میں توہینِ عدالت کے جرم میں تمہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دوں گا۔''

وہ ماتھے پر آنے والے پسینے کو اضطراری انداز میں صاف کرتے ہوئے معاندانہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''آپ میں تو ذرا سی سچائی سننے کا حوصلہ نہیں ہے۔''

جج مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''بیگ صاحب! آپ نے بہ یک وقت متضاد باتیں کی ہیں۔ معزز عدالت ان کی وضاحت چاہتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''جنابِ عالی! استغاثہ کے گواہ فرید احمد کا دعویٰ ہے کہ اس نے ٹھیک سوا چار بجے آفس بند کیا اور مقتول کے بنگلے کی طرف روانہ ہوگیا لیکن اس کے آفس کے برابر میں واقع پرنس ڈیکوریٹر کا مالک اکرام بھٹی اس بات کا گواہ ہے کہ وقوعہ کے روز ''برائٹ فیوچر اسٹیٹ'' کا دفتر سہ پہر سوا تین بجے بند ہوگیا تھا۔ میں معزز عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ استغاثہ کے گواہ فرید احمد سے پوچھا جائے اس کھلی دروغ گوئی سے اس کا مقصد کیا ہے؟''

''میں نے کوئی دروغ گوئی نہیں کی۔'' وہ چیخ کر بولا۔ ''ایک حقیقت بیان کی ہے۔''

جج نے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! کیا آپ اکرام بھٹی نامی اس پارٹی ڈیکوریٹر کو گواہی کے لئے عدالت میں پیش کرسکتے ہیں؟''

میں نے جج کے سوال کا جواب دینے کی بجائے تیکھی نظر سے استغاثہ کے گواہ فرید احمد کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ تاثرات سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ابھی

کٹہرے سے نکل کر بھاگ کھڑا ہوگا۔اس کی کیفیت کو سمجھنا چنداں مشکل نہیں تھا۔

میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"جنابِ عالی! پرنس پارٹی ڈیکوریٹر کا مالک اکرام بھٹی اس وقت عدالت کے برآمدے میں موجود ہے۔آپ کی اجازت ہو تو میں اسے صفائی کے گواہ کے طور پر عدالت میں پیش کر سکتا ہوں۔"

میرا یہ کہنا تھا کہ فرید احمد آپے سے باہر ہو گیا۔وہ کٹہرے کی ریلنگ کو تھام کر چیخ چیخ کر کہنے لگا۔"بلالیں ـــــ جس کو بھی بلانا ہے بلالیں۔میں ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔یہ اکرام بھٹی کیا بیچتا ہے۔یہ میرے خلاف گواہی دے گا۔میں تو اس کی ہڈی پسلی ایک کر کے رکھ دوں گا اور اس وکیل بیگ کے بچے ـــــ"

"آرڈر ـــــ آرڈر ـــــ"جج کی تحکمانہ آواز عدالت کے کمرے میں گونجی۔

اس آواز کے ساتھ ہی سناٹا چھا گیا۔فرید احمد کے رویے نے اسے سب کی نظروں میں مشکوک ثابت کر دیا تھا۔حاضرین عدالت میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔پھر جج کے حکم پر اکرام بھٹی کو گواہی کے لئے وٹنس باکس میں لایا گیا۔اس طرح فرید احمد کے جھوٹ کا پول کھل گیا۔

جج نے استغاثہ کے گواہ فرید احمد کو پولیس کے حوالے کرتے ہوئے ازسرنو اس کیس کی انکوائری کے احکام صادر کر دیئے۔صورتِ حال روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی تھی۔

فرید، پولیس کی تفتیش کا سامنا نہ کر سکا اور اس نے ایک ہی رات کی خاطر مدارات کے بعد اقبالِ جرم کر لیا۔فرید احمد اور مقتول کی بیوہ آپس میں ملے ہوئے تھے اور ان کی ملی بھگت سے پرویز شاہ کو ٹھکانے لگایا گیا تھا۔قربانی کے بکرے کے طور پر انہیں امین جیسا ایک احمق مل گیا تھا اس لئے ان کا کام آسان ہو گیا۔انہوں نے امین کو پھنسانے کی پلاننگ کی۔فرزانہ کے حوالے سے امین کو فون بھی انہوں نے کرایا تھا تا کہ وہ مشتعل ہو کر سیدھا مقتول کے بنگلے پر پہنچ جائے جہاں اس کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کا مکمل بندوبست تھا۔

آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے موکل امین کو باعزت بری کر دیا۔

انتہائی احمق اور بے وقوف ہونے کے باوجود بھی وہ خاصا خوش قسمت ثابت ہوا تھا اور میرا خیال ہے اس خوش قسمتی میں اس کی بیوی کی دعاؤں اور کوششوں کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ورنہ وہ جس قسم کی سچویشن میں پھنس گیا تھا اس کا بچنا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔

آتش بدن

میں گھر سے نکلنے ہی والا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے یکا یک پلٹ کر فون سیٹ کی طرف دیکھا اور بہ آوازِ بلند گھریلو ملازم کو پکارا۔

''شکور! ذرا یہاں آنا۔''

شکور اس وقت مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا لہٰذا قبل اس کے کہ میں فون ریسیو کرتا، وہ کسی چراغی جن کی مانند میرے سامنے حاضر ہو گیا۔ اس کی صورت پر نگاہ پڑی تو میں نے اپنے بریف کیس اور فائلوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔

''انہیں میری گاڑی میں رکھ دو۔''

شکور حکم کی تعمیل کے لئے آگے بڑھا تو میں نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔ اس دوران دو مرتبہ گھنٹی بج چکی تھی۔ میں نے ریسیور کو کان سے لگایا تو ایک شناسا آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''ہیلو بیگ صاحب! کیسے ہیں آپ؟''

''اللہ کا احسان ہے بزمی صاحب!'' میں نے جواباً دوسری طرف سے بولنے والے کی خیریت دریافت کی۔ ''آپ سنائیں بزمی صاحب! اتنی صبح کیسے یاد فرمایا؟''

بزمی کا پورا نام ستار بزمی تھا۔ وہ ایک مقامی سماجی تنظیم کا روحِ رواں تھا۔ اکثر و بیشتر مختلف معاشرتی تقریبات میں ستار بزمی سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ ہمارے درمیان اچھی خاصی بے تکلفی تھی۔ بزمی نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور میرے استفسار کے جواب میں بولا۔

''ڈاکٹر اور وکیل ہمارے معاشرے کے دو ایسے کردار ہیں جنہیں صبح صبح یاد کرنے کا مطلب ہوتا ہے ــــــ خیریت نہیں!''

میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''بزمی صاحب! آپ نے ہسپتال اور کچہری کا ذکر کیا ہے تو اس میں میری طرف سے آپ تھانے کا اضافہ کر لیں۔ عموماً لوگ کسی مشکل یا مصیبت کے وقت ہی ڈاکٹر، وکیل یا تھانہ انچارج سے اتنی صبح رابطہ کرتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی فارمولا نہیں۔

بہر حال ـــــــ" میں نے لمحہ بھر کو توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔" آپ فرمائیں۔ اس وقت آپ کو میری کیا ضرورت پیش آ گئی؟"

وہ فوراً مطلب کی بات پر آ گیا۔" آج کل پریکٹس کیسی چل رہی ہے بیگ صاحب؟"

میں فوراً سے پیشتر سمجھ گیا، وہ کوئی مُفتا یا رعایتی کیس میرے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"چل رہی نہ کہیں بزمی صاحب! یہ تو کسی تیز رفتار ٹرین کی طرح دوڑ رہی ہے۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔" وہ دوستانہ انداز میں بولا۔" چاہے کتنی بھی تیز رفتاری سے دوڑ رہی ہے، اس کے ڈرائیور تو آپ ہی ہیں نا۔ میری خاطر کسی اسٹیشن پر تھوڑی دیر کے لئے اسے روک سکتے ہیں۔"

میں نے قصے کو مختصر کرنے کی غرض سے کہا۔" فرمائیں بزمی صاحب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

وہ کسی خطیب کے سے انداز میں بولا۔" کسی ایک مصیبت زدہ انسان کی مدد کرنا پوری انسانیت کی مدد کرنے کے مترادف ہے۔ میں ایک بے گناہ، غریب انسان کا کیس آپ کے سپرد ـــــــ"

"ایک منٹ بزمی صاحب!" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔" آپ کو اچھی طرح یہ بات معلوم ہے کہ میں ایک اصول پسند اور اصول پرست وکیل ہوں۔ فیس کے بغیر میں کوئی کیس ٹیکل کرنے کی ہامی نہیں بھرتا۔"

وکالت ایک ایسا پیشہ ہے جس میں وکلاء کی اکثریت دوٹوک اور حتمی بات کرنے سے احتراز برتتی ہے۔ جس سے بہت سی ناہمواریاں اور پیچیدگیاں جنم لیتی ہیں۔ مذکورہ بالا وکلاء ایسے رویے سے اپنا فائدہ کرتے ہیں یا نقصان اس سے بحث نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کی وجہ سے راست گو اور اصول پسند سنجیدہ وکلاء کا امیج وقتی طور پر متاثر ہوتا ہے۔ بھیڑ چال کے اصول کے پیشِ نظر یہی سمجھا جانے لگتا ہے کہ تمام وکلاء ایک ہی جیسے ہیں۔ بہر حال، یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ بزمی نے میری قطع کلامی کے جواب میں کہا۔

"جانتا ہوں بیگ صاحب ـــــــ اچھی طرح جانتا ہوں۔ فیس آپ کو ضرور ملے گی لیکن مجھے امید ہے اس سلسلے میں آپ میری سفارش پر تھوڑی بہت رعایت ضرور کریں گے۔"

"آپ کی سفارش ہے تو ضرور غور کرنا پڑے گا۔" میں نے عام سے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ "آپ کس شخص کا کیس مجھے دینا چاہتے ہیں اور اس کیس کی نوعیت کیا ہے؟"

''کیس فوجداری کا ہے۔'' بزمی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''ملزم کا نام مستقیم ہے۔ آپ نے استغاثہ کو صراطِ مستقیم دکھا کر اس غریب آدمی کو چھڑانا ہے۔ مستقیم اپنی بیوی اور اکلوتی بچی کے ساتھ محمود آباد میں رہتا تھا لیکن اس وقت عدالتی ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہے۔ اس پر اپنے باس کو قتل کر کے لوٹنے کا الزام ہے۔''

''اوہ۔۔۔۔۔!'' میں نے تفصیل سننے کے بعد متاسفانہ انداز میں گہری سانس لی پھر پوچھا۔ ''آپ نے تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ ایک بے گناہ شخص کا کیس میرے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ مجھے بتانا پسند فرمائیں گے کہ آپ کو مستقیم نامی اس شخص کی بے گناہی کا یقین کیونکر ہے؟''

وہ لحاتی توقف کے بعد گویا ہوا۔ ''ایسا ہے کہ میری تنظیم کا ایک عہدیدار عبدالرؤف محمود آباد میں رہتا ہے اور اتفاق سے اس کا گھر اسی گلی میں واقع ہے جہاں ایک گھر کے پورشن میں مستقیم کرائے دار کی حیثیت سے رہائش پذیر ہے۔ عبدالرؤف کی زبانی مجھے مستقیم کے نیک چال چلن کا پتہ چلا ہے اور اسی بناء پر میں ملزم کی سفارش کر رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ میں دیکھ لیتا ہوں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''میری فیس ملزم کے لواحقین ادا کریں گے یا آپ کا ارادہ ہے؟''

''دونوں مل جل کر آپ کی فیس۔۔۔۔۔ رعایتی فیس کا بوجھ اٹھا لیں گے۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''اس لئے آپ ہاتھ ذرا ہولا ہی رکھئے گا۔''

میں نے ستار بزمی کو اپنے حتیٰ الامکان تعاون کا یقین دلایا اور اس کیس کے حوالے سے مزید تفصیلات دریافت کیں لیکن بزمی اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

''بیگ صاحب! مستقیم کی بیوی فوزیہ اس وقت میرے دفتر میں بیٹھی ہے۔ میں اسے آپ کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ مجھے جو معلوم تھا وہ آپ کو بتا چکا، مزید تفصیلات آپ فوزیہ سے پوچھ لیجئے گا۔ وہ آپ کو صورتِ حال سے آگاہ کر دے گی۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کی غرض سے رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ کہتے ہیں تو میں فوزیہ کے ساتھ آپ کے پاس آجاتا ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''اس وقت میری طرف آنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں عدالت جانے کے لئے گھر سے نکل ہی رہا تھا کہ آپ کا فون آگیا۔ آپ ایسا کریں شام میں کسی وقت ملزم کی بیوی کو میرے دفتر میں بھیج دیں۔''

''یہ ٹھیک ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''مگر شام کے وقت میں فارغ نہیں ہوں گا۔ اگر میں عبدالرؤف کو فوزیہ کے ہمراہ بھیج دوں تو؟''

''تو بھی ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

''آپ ملزم کی بیوی سے ملاقات کرلیں۔'' بزمی نے کہا۔ ''آپ کی فیس میں کسی وقت بھی پہنچا دوں گا۔ میرا خیال ہے آپ مجھ پر اتنا اعتبار تو کر ہی لیں گے۔''

''آپ میرے لئے قابلِ بھروسا آدمی ہیں بزمی صاحب!'' میں نے کہا پھر پوچھا۔ ''ملزم مستقیم کس تھانے میں بند ہے؟''

اس نے متعلقہ تھانے کا نام بتایا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اختتامی کلمات کے بعد گفتگو کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ اگلے ہی لمحے میں اپنی گاڑی میں بیٹھ کر گھر سے روانہ ہو گیا۔

میرا دفتر سٹی کورٹ کے نزدیک ہی ایک کثیر المنزلہ عمارت میں واقع ہے۔ عدالت میں قدم رکھنے سے پہلے میں اپنے دفتر ضرور جاتا ہوں جہاں میرا اسسٹنٹ پہلے سے میرا منتظر ہوتا ہے۔ میں گھر میں صرف وہی فائلیں لے کر آتا ہوں، رات میں جن کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔ باقی تمام ضروری دستاویزات اور کیس فائلز دفتر ہی میں رکھی رہتی ہیں۔ میرا اسسٹنٹ میرے اسکیجویئل سے بخوبی آگاہ ہے۔ وہ ان تمام فائلوں کو تیار رکھتا ہے جو مجھے اپنے ساتھ عدالت لے کر جانا ہوتی ہیں۔ بعض اوقات میں تھوڑی دیر تک دفتر میں رک کر ضروری کاغذات اور فائلوں کا جائزہ بھی لے لیتا ہوں۔

اس روز میں گھر سے دفتر پہنچا، لگ بھگ آدھا گھنٹہ دفتر میں گزارا اور پھر گاڑی میں بیٹھ کر عدالت کی جانب روانہ ہو گیا۔

❀ ❀ ❀

مئی آدھے سے زیادہ گزر چکا تھا۔ گرمی ان دنوں جولانی پر تھی۔ دن طویل ہونے کے باعث یوں محسوس ہوتا تھا جیسے رات دیر سے شروع ہوتی ہو۔ سات بجے تک تو اچھا خاصا اُجالا رہتا تھا۔ وہ دونوں اس شام کم و بیش سات بجے ہی میرے دفتر پہنچے تھے۔

میں نے دونوں کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے کہ میری سیکرٹری نے عبدالرؤف اور فوزیہ کی آمد کے بارے میں مجھے اطلاع دی۔ آج صبح چونکہ فون پر ستار بزمی سے فوزیہ کے حوالے سے بات ہو چکی تھی لہٰذا میں نے انہیں ان کی باری پر اپنے چیمبر میں بلا لیا۔ جب وہ میرے چیمبر میں داخل ہوئے تو اس وقت مجھے پتہ چلا وہ دو نہیں بلکہ تین ہیں۔ ان کے ساتھ ایک پانچ، ساڑھے پانچ سال کی بچی بھی تھی۔ اس معصوم سی بچی کو دیکھتے ہی میں نے اندازہ لگا لیا، وہ

فوزیہ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بچی میں ماں کی گہری شباہت جھلکتی تھی۔ بچی کی معصومیت میں اس وقت خوف و ہراس اور حیرانی نے خاصی جگہ بنا رکھی تھی۔

ستار بزمی کی تنظیم کا عہدیدار عبدالرؤف نامی ایک دُبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پچاس کے قریب قائم کیا۔ اس کے سر کے بیشتر بال سفید ہو چکے تھے جنہیں اس نے عمدہ قسم کے کسی خضاب میں رنگ رکھا تھا۔ عبدالرؤف کی آنکھوں سے ذہانت مترشح تھی۔ وہ خاصا چاق و چوبند اور متحرک شخص دکھائی دیتا تھا۔

ملزم مستقیم کی بیوی فوزیہ سانولی سلونی اور دھان پان سی عورت تھی۔ عمر تیس کے قریب رہی ہوگی۔ وہ واجبی سی صورت کی مالک ایک درمیانہ قامت گھریلو عورت تھی۔ شوہر کی گرفتاری نے فوزیہ کو حد درجہ دل گرفتہ اور ملول کر رکھا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا وہ اس وقت اپنی زندگی کے مشکل ترین لمحات سے گزر رہی تھی۔

میں نے پیشہ وارانہ مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے فوزیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''صبح بزمی صاحب نے مجھے آپ کے شوہر کے بارے میں بتایا تھا کہ پولیس نے اُسے کسی ناکردہ جرم کے سلسلے میں گرفتار کرلیا ہے لیکن بزمی صاحب مجھے تفصیل سے آگاہ نہیں کر سکے۔ آپ بتائیں، کیا صورتِ حال ہے؟''

بات ختم کرتے ہی میں نے نوٹس کے لئے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا۔ فوزیہ کے بولنے سے پہلے ہی عبدالرؤف بول اٹھا۔ ''بیگ صاحب! مجھے تو آپ تھوڑی دیر کے لئے اجازت دیں۔ میں پچیس منٹ میں واپس آتا ہوں۔ بزمی صاحب کے ایک ضروری کام سے مجھے سول ہسپتال تک جانا ہے۔ اس دوران آپ فوزیہ سے تفصیلی بات چیت کرلیں۔'' وہ لمحہ بھر کو رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ویسے بھی میں اس کیس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ آپ دونوں کے درمیان خاموش بیٹھ کر خواہ مخواہ وقت ضائع کروں گا۔ آپ لوگ تسلی سے گفتگو کریں۔ میں ایک چھوٹا سا کام نمٹا کر حاضر ہوتا ہوں۔''

عبدالرؤف کی یہ فرمائش پوری کرنے میں کوئی حرج دکھائی نہیں دیتا تھا لہٰذا میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ میرے چیمبر سے رخصت ہو گیا تو میں فوزیہ کی جانب متوجہ ہو گیا اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

''اب آپ مجھے پوری تفصیل سے بتائیں، آپ کا شوہر کن حالات سے دوچار ہو کر پولیس

کسٹڈی میں پہنچا ہے؟''

وہ چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے بکھرے ہوئے خیالات کو مجتمع کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کے بعد دھیمے لہجے میں اس نے مجھے اپنے شوہر کو پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتایا۔ اس کے بیان میں ضروری اور غیر ضروری دونوں اقسام کی باتیں شامل تھیں۔ اس کے بیان کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔ یہ خلاصہ بیان کرتے ہوئے میں نے غیر متعلقہ باتوں کو حذف کر دیا ہے۔

ان کی شادی کو کم و بیش آٹھ سال ہوئے تھے۔ ان کی اکلوتی بیٹی نرگس کی عمر اس وقت پانچ سال تھی۔ وہ نرسری کی تعلیم مکمل کر چکی تھی اور اگلے سال کلاس ون میں جانے والی تھی۔ محمود آباد والے گھر میں رہائش اختیار کیے انہیں سات سال ہوئے تھے۔ یہ ایک دو منزلہ مکان تھا جس کی بالائی منزل پر مالک مکان رہائش پذیر تھا جبکہ زیریں منزل کو دو پورشنز میں تقسیم کر کے اس نے کرائے پر اٹھا رکھا تھا جن میں سے ایک پورشن میں وہ لوگ رہتے تھے۔ یہ گھر محمود آباد نمبر ایک کی ایک ایسی گلی میں تھا جس میں داخل ہوں تو بتدریج یہ گلی نشیب کی طرف بڑھتی چلی جاتی تھی۔

ملزم مستقیم پیشے کے اعتبار سے ایک ڈرائیور تھا۔ وہ گزشتہ پانچ سال سے ''اے۔ این۔ اے'' نامی ایک ٹریڈنگ کمپنی میں بطور ڈرائیور کام کر رہا تھا۔ اس کی ڈیوٹی کمپنی کے مالک یعنی باس کے ساتھ تھی۔ اسے روزانہ صبح دس بجے باس کے بنگلے پر پہنچنا ہوتا تھا۔ باس کا نام اشفاق علی تھا جو ڈیفنس فیز ٹو کے ایک عالیشان بنگلے میں رہتا تھا جبکہ ''اے۔ این۔ اے'' ٹریڈنگ کمپنی کا دفتر ڈیفنس مارکیٹ کے قریب ایک بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور پر واقع تھا۔ اشفاق علی کے گھر اور دفتر کے درمیان بہ مشکل دس منٹ کی ڈرائیو تھی۔

ملزم اپنے باس کو گھر سے اٹھاتا اور دفتر پہنچا دیتا۔ اس کے بعد وہ دفتر ہی میں رہتا۔ اگر باس کو کسی کام سے کہیں جانا ہوتا تو ملزم کو ساتھ لے جاتا ورنہ اسے دفتر ہی میں آن ڈیوٹی رہنا پڑتا۔ اس دوران اکثر و بیشتر یہ بھی ہوتا کہ باس کی بیگم کو گاڑی یا ڈرائیور کی ضرورت پیش آ جاتی۔ چنانچہ باس کے حکم پر اسے بیگم کی طرف جانا پڑتا۔ اشفاق کی بیوی کے پاس علیحدہ گاڑی بھی تھی لیکن اسے بعض اوقات اپنے شوہر کی گاڑی کی ضرورت پڑ جاتی تھی۔ بہرحال جب تک اشفاق علی اپنے دفتر میں موجود رہتا، ملزم کو بھی آن ڈیوٹی رہنا پڑتا۔ پھر وہ اپنے باس کو اس کے بنگلے پر چھوڑنے کے بعد چھٹی کر جاتا۔ ملزم لگ بھگ آٹھ بجے رات اپنے گھر پہنچ جاتا تھا۔ محمود آباد اور ڈیفنس فیز ٹو میں زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ ملزم پیدل مارچ کرتے ہوئے، فیز ون کے اندر سے گزر

کر محمود آباد پہنچ جاتا۔ بعض اوقات اگر باس کو زیادہ دیر تک آفس میں رُکنا ہوتا یا دفتر کے وقت کے بعد باہر کہیں جانا ہوتا تو ملزم کو اپنے گھر پہنچنے میں ساڑھے آٹھ اور نو بھی بج جایا کرتے تھے ـــــ وقوعہ کے روز بھی وہ لگ بھگ نو بجے ہی گھر پہنچا تھا۔

اس کی آمد کے تھوڑی دیر بعد ہی پولیس اس کے گھر پہنچ گئی۔ پھر ساڑھے نو بجے اسے اپنے باس اشفاق علی کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔ اس سنگین الزام میں یہ ہولناک شق بھی شامل تھی کہ اس نے ایک بھاری رقم لوٹنے کے لئے اشفاق احمد کو قتل کیا تھا۔

ملزم مستقیم کی گرفتاری اُنیس مئی کی رات عمل میں آئی۔ اگلے روز پولیس نے اُسے عدالت کا منہ دکھا کر سات دن کا ریمانڈ حاصل کرلیا تھا۔ اور اب وہ ریمانڈ پر پولیس کی تحویل میں تھا۔ میں نے ٹیبل کیلنڈر پر نگاہ ڈال ڈال کر تاریخوں کا حساب لگایا تو پتہ چلا ملزم کے ریمانڈ کی مدت ختم ہونے میں صرف تین روز باقی تھے۔

میں نے ملزم کی بیوی سے متعدد سوالات کئے لیکن وہ ان اہم سوالات کے تسلی بخش جواب نہ دے سکی۔ وہ بے چاری اس واقعے کے پس منظر سے ذرا سی بھی واقف نہیں تھی۔ کچھ تو ناواقفیت اور کچھ اس واقعے نے اس کے حواس کو مختل کر رکھا تھا ـــــ وہ بے حد پریشان تھی۔

اس کی کتھا ختم ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ''کیا اس دوران آپ تھانے جا کر اپنے شوہر سے ملی ہیں؟''

یہ سوال میں نے اس لئے پوچھا تھا کہ اگر ملزم نے اپنی بے گناہی کے سلسلے میں اسے کوئی خاص بات بتائی ہو تو اسے یاد آ جائے۔ پریشان ذہن سے بہت سی باتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''میں تین مرتبہ تھانے جا کر مستقیم سے ملنے کی کوشش کر چکی ہوں لیکن صرف ایک بار ان لوگوں نے مجھے اس سے ملنے دیا ہے اور وہ بھی چند منٹ کے لئے۔ میں مستقیم سے ڈھیروں باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن پولیس نے اس کا موقع نہیں دیا۔ وہ کہتے ہیں، جو بھی باتیں کرنا ہیں جا کر اُدھر عدالت میں کرنا۔ وہاں جج بھی سنے گا اور بہت سارے دوسرے لوگ بھی موجود ہوں گے۔ تم خوب دل کی بھڑاس نکال لینا، ہمارا سر نہ کھاؤ۔'' وہ سانس لینے کے لئے لمحہ بھر کو متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''میں نے جو دو چار منٹ مستقیم سے ملاقات کی ہے، اس دوران ایک پولیس والا مستقل ہمارے سر پر سوار رہا اور کچا کھا جانے والی نظر سے ہمیں گھورتا رہا۔ مستقیم سے بات کیا کرتی، میں تو سہم کر رہ گئی تھی۔ ویسے میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی ہے۔''

وہ اتنا کہہ کر رکی تو میں نے فوراً پوچھ لیا۔ ’’وہ کون سی بات؟‘‘

’’پولیس والے جس انداز میں مستقیم سے ملنے کی راہ میں حارج ہو رہے ہیں اس سے میں نے اندازہ لگایا ہے وہ مجھ سے کسی رشوت کی توقع کر رہے تھے۔‘‘ فوزیہ نے تلخی سے بتایا۔ ’’اگر میں ان کی مٹھی گرم کر دیتی تو ممکن ہے وہ میری بات مان لیتے۔‘‘

’’ایسا ہو سکتا ہے!‘‘ میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ ’’پولیس اور رشوت کی بڑی گہری دوستی مانی جاتی ہے۔ تاہم پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں ـــــ بہرحال!‘‘ میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’میں دفتر سے فارغ ہونے کے بعد مستقیم سے ملاقات کرنے متعلقہ تھانے جاؤں گا کیونکہ آپ نے مجھے جو معلومات فراہم کی ہیں وہ میری نظر میں ناکافی ہیں۔ اس سے بات نہیں بنے گی۔‘‘

فوزیہ نے پوچھا۔ ’’کیا میں بھی آپ کے ساتھ تھانے جا سکتی ہوں؟‘‘

’’اس میں کوئی حرج نہیں۔‘‘ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’لیکن اس کے لئے آپ کو میرے فارغ ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔‘‘

وہ اس انتظار پر آمادہ نظر آئی تو میں نے اسے وزیٹنگ لابی میں بھیج دیا۔

تھوڑی دیر بعد عبدالرؤف لوٹ آیا۔ جب اسے پتہ چلا کہ فوزیہ میرے ساتھ تھانے جائے گی تو اس نے ایک لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ’’میرا خیال ہے آپ مجھے تو اجازت ہی دیں۔ میں محسوس کر رہا ہوں، معاملہ ڈائریکٹ ہو گیا ہے۔‘‘

’’معاملہ ڈائریکٹ ہوا ہے یا نہیں مگر اس کیس میں سے آپ کی جان آسانی سے نہیں چھوٹے گی۔‘‘ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا پھر وہ سفید لفافہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’کیا مطلب ہے آپ کا؟‘‘

’’مطلب یہ ہے کہ ـــــ‘‘ میں نے بدستور سنجیدہ رہتے ہوئے کہا۔ ’’یہ کیس آپ نے ہی ستار بزمی تک پہنچایا ہے ـــــ ملزم کی نیک چال چلنی کا حوالہ دے کر۔ اب جہاں کہیں ملزم کے کردار کا ذکر ہو گا، آپ کو گواہی دینے کے لئے جانا ہو گا۔ آخر کو آپ اس کے محلے دار ہیں اور اسے اس معاشرے کا ایک شریف فرد سمجھتے ہیں۔ میں ضرورت پڑنے پر آپ کا نام صفائی کے گواہوں میں بھی شامل کر سکتا ہوں۔‘‘

’’کیوں نہیں ـــــ کیوں نہیں۔‘‘ وہ بڑی سرعت سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ پھر اپنی جیب میں سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری جانب بڑھا دیا اور کہنے لگا۔ ’’آپ میرا کارڈ رکھ لیں۔ اس کیس کے سلسلے میں جب بھی میری ضرورت پیش آئے، آپ

مجھے فون کر دیں۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

میں نے اس کے وزیٹنگ کارڈ پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ اس کارڈ کے مطابق وہ ایک بزنس مین تھا لیکن میں یہ اندازہ نہ لگا سکا کہ وہ کس قسم کا بزنس کرتا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں اس سے استفسار کیا تو وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"بیگ صاحب! اُدھر منظور کالونی میں، ایک گھر کرائے پر لے کر میں نے ایک چھوٹا سا کارخانہ کھول رکھا ہے جہاں گتے کے، ہر سائز کے ڈبے تیار کئے جاتے ہیں۔ آپ میرے کارخانے کو کاٹیج انڈسٹری سمجھ لیں!"

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور لفافہ اسے دکھاتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

یہ وہی سفید لفافہ تھا جو ابھی عبدالرؤف نے مجھے تھمایا تھا۔ میں نے ابھی اسے کھول کر نہیں دیکھا تھا۔

وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہ بزمی صاحب نے آپ کے لئے بھیجا ہے ——— آپ کی فیس۔"

"اوہ!" میں نے بھویں اُچکائیں اور لفافے کے اندر "ماہرانہ" نگاہ ڈالی پھر مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے، بزمی صاحب خاصے سمجھ دار انسان ہیں۔"

رؤف نے کہا۔ "اب آپ فوزیہ یا اس کے شوہر سے فیس کے بارے میں کوئی بات نہیں کریں گے۔"

"آپ بے فکر ہو جائیں اس سلسلے میں۔" میں نے تسلی بخش لہجے میں اسے یقین دلایا۔

فوزیہ اس وقت انتظار گاہ میں بیٹھی تھی لہٰذا وہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سے آگاہ نہیں تھی۔ میں نے فیس کی وصولی کی رسید بنا کر عبدالرؤف کو تھما دی اور کہا۔

"یہ آپ بزمی صاحب کو دے دیجئے گا۔ یہ ایک چھوٹی سی مگر ضروری کاغذی کارروائی ہے۔"

اس نے سرسری انداز میں مذکورہ رسید کا معائنہ کیا اور شکریہ ادا کر کے میرے دفتر سے رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

❁ ❁ ❁

میں نے اپنی گاڑی کو تھانے کی چار دیواری کے باہر ایک طرف پارک کیا اور فوزیہ سے اترنے کو کہا۔ ان ماں بیٹی کے باہر آنے سے پیشتر میں گاڑی چھوڑ چکا تھا۔ تمام دروازوں کو اچھی طرح لاک کرنے کے بعد ہم تینوں تھانے میں داخل ہو گئے۔ فوزیہ اور نرگس اگرچہ سہمے ہوئے تھے تاہم میری موجودگی کے باعث انہیں اچھی خاصی ڈھارس تھی۔ وہ پُریقین تھے کہ میں

سب ٹھیک کر دوں گا۔

تھانہ انچارج اس وقت تھانے میں موجود نہیں تھا۔ میں سیدھا انچارج کے کمرے ہی میں پہنچا۔ وہاں پر ایک سرخ آنکھوں والے اے ایس آئی کی صورت نظر آئی جس کی زبانی پتہ چلا کہ انچارج صاحب راؤنڈ پر ہیں۔ شام اور رات کے ابتدائی حصے میں عموماً تھانے دار، تھانے میں نہیں پائے جاتے۔ وہ اس وقت چاہے سرکاری فرائض انجام دے رہے ہوں یا اپنے کسی ذاتی کام سے کہیں مصروف ہوں، بتایا یہی جاتا ہے کہ وہ معمول کے گشت پر ہیں۔ بہرحال، میں نے وہاں موجود خونیں آنکھوں والے اے ایس آئی سے کہا۔

''میں تمہارے انچارج صاحب سے ملنے آیا تھا۔ وہ تو ہیں نہیں۔ چلو کوئی بات نہیں، میں ان کے تعلق دار ہی سے ملاقات کر لیتا ہوں۔'' بات ختم کرتے ہی میں جانے کے لئے مڑا۔

''تعلق دار کون؟'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر فوزیہ کو گہری نظروں سے گھورنے لگا۔ گھورنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

میں نے رک کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ارے بھائی! میں اس حوالاتی کی بات کر رہا ہوں جو عدالتی ریمانڈ پر تمہارے تھانے میں بند ہے ــــــ ملزم مستقیم۔''

''اوہ!'' اس نے بدستور فوزیہ کا ایکسرے کرتے ہوئے ایک گہری سانس خارج کی اور پہچان کے مراحل کو اختتام تک پہنچاتے ہوئے بولا۔ ''آپ اس عورت کے شوہر کا ذکر کر رہے ہیں نا ــــــ میں نے اسے پہلے بھی تھانے میں ایک آدھ بار دیکھا ہے۔''

''دیکھا ہوگا یقیناً ــــــ'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''یہ پچھلے چار دن میں کم از کم چار مرتبہ یہاں آ چکی ہیں لیکن افسوس کہ اس دُکھیاری کو صرف ایک بار چند منٹ کے لئے اس کے شوہر سے ملنے کی اجازت دی گئی ــــــ ہے نا افسوس ناک بات؟''

میرے طنزیہ فقرات نے اسے حد سے زیادہ محتاط کر دیا۔ وہ تقریباً میری راہ میں حائل ہوتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''آپ کون ہیں اور حوالاتی سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟''

''میں حوالاتی کا وکیل ہوں ــــــ مرزا امجد بیگ۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''کوئی وکیل اپنے مؤکل سے کیوں ملاقات کرتا ہے یہ تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہو گا اے ایس آئی صاحب!''

اس کی سرخ آنکھوں کی سرخی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا، جارحانہ انداز میں بولا۔ ''اس وقت انچارج صاحب تھانے میں موجود نہیں ہیں۔ ان کی اجازت کے بغیر آپ حوالاتی ــــــ ایسا

حوالاتی جو عدالتی ریمانڈ پر بھی ہو، سے نہیں مل سکتا۔" بات ختم کرتے ہی وہ میری راہ کا روڑا بن گیا۔

"اجازت!" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "اگر یہ مسئلہ ہے تو ابھی اجازت لے لیتے ہیں۔"

بات مکمل کرتے ہی میں بڑی سرعت سے تھانہ انچارج کی میز کی طرف لپکا۔ اس میز پر ٹیلی فون سیٹ رکھا ہوا تھا۔ میں نے ریسیور کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اے ایس آئی میرے سر پر پہنچ گیا پھر برہمی سے بولا۔

"آپ کس کو فون کر کے اجازت لیں گے؟ انچارج صاحب ــــــ؟"

"میں پریس کلب فون کرنے جا رہا ہوں۔" میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ "فی الحال تو وہیں سے این او سی لینا ہوگا۔"

میرا جواب اس کے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ وہ ہونقوں کی طرح منہ کھول کر مستفسر ہوا۔ "پریس کلب کا تھانہ انچارج صاحب سے کیا تعلق؟"

"بہت ہی گہرا تعلق ہے اے ایس آئی صاحب!" میں نے تفریح لینے والے انداز میں کہا۔ "اس وقت پریس کلب میں جرائم کی اقسام اور ان کی بیخ کنی کے مختلف مروجہ طریقۂ کار کے سلسلے میں ایک اہم میٹنگ ہو رہی ہے جس میں چیف منسٹر کے علاوہ آئی جی صاحب بھی موجود ہیں۔ میں ذرا آئی جی صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"خدا کا خوف کریں ایڈووکیٹ صاحب!" وہ ساری برہمی اور غصیلے پن کو یکسر فراموش کرتے ہوئے منت ریز لہجے میں بولا۔ "کیوں ہاتھ دھو کر میری نوکری کے پیچھے پڑے ہیں جناب؟"

"آپ نے ایک تعلق کے بارے میں پوچھا تھا، میں نے تو آپ کے سوال کا جواب دیا ہے۔" میں نے ترش لہجے میں کہا۔ "میرا خیال ہے، آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا۔ آئی جی صاحب کا پولیس سے، پولیس کا تھانے سے اور تھانے کا ایک حوالاتی سے کیا تعلق ہوتا ہے۔"

وہ نرمی سے بولا۔ "جناب! اتنے لمبے چوڑے چکر میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ حوالاتی سے ملاقات کرنے آئے ہیں، کر لیں ملاقات لیکن جو بھی بات چیت کرنا ہے، پانچ دس منٹ میں کر لیں۔ اگر انچارج صاحب کو پتہ چل گیا تو ــــــ"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر متوقف ہوا پھر دروازے کی سمت منہ اٹھا کر باآواز بلند چلایا۔ "خادم حسین! اندر آؤ۔"

اس کے تحکمانہ انداز سے میں نے سمجھ لیا کہ خادم حسین کوئی کانسٹیبل ہوگا۔ اور میرا یہ اندازہ صد فیصد درست ثابت ہوا۔ کانسٹیبل کمرے میں پہنچا تو اے ایس آئی نے مختصر الفاظ میں اسے بریف کرتے ہوئے کہا۔ ''وکیل صاحب کو حوالاتی مستقیم کے پاس لے جاؤ۔ جیسے ہی ان کی ملاقات ختم ہو، مجھے آ کر بتانا۔''

میں اے ایس آئی کی شاطرانہ چال تک پہنچ گیا۔ اس نے اشارتاً کانسٹیبل کو یہ ہدایت دی تھی کہ میں جب تک ملزم سے گفتگو کرتا رہوں، وہ سائے کی طرح ہماری نگرانی پر مامور رہے۔ میں اس کی مکاری پر دل ہی دل میں مسکرا اٹھا پھر کانسٹیبل کی رہنمائی میں حوالات کی طرف بڑھ گیا۔

کوئی ملزم خاص طور پر قتل کا ملزم اگر عدالتی ریمانڈ پر پولیس کی کسٹڈی میں ہو تو کسی شخص کو، خصوصاً کسی وکیل کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ چنانچہ اس سلسلے میں کوئی نہ کوئی کارڈ کھیلنا پڑتا ہے جیسا کہ میں نے آئی جی صاحب کا کارڈ کھیلا تھا۔ اس نوعیت کے کھیل کے لئے بے پناہ خود اعتمادی کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ بنا بنایا کھیل لمحے بھر میں بگڑ کر رہ جاتا ہے۔ جن معاملات میں گھی سیدھی انگلی سے نہ نکل رہا ہو اور گھی کی اشد ضرورت بھی درپیش ہو تو پھر ضرورت پوری کرنے کے لئے انگلی کو ٹیڑھا کرنا ہی پڑتا ہے۔

مستقیم کی عمر لگ بھگ پینتیس سال تھی۔ وہ درمیانے قد اور بھاری جثے کا مالک تھا۔ اس نے خاصی دبنگ مونچھیں پال رکھی تھیں جن کے سبب اس کی شخصیت میں ایک خاص قسم کا رعب ودبدبہ شامل ہو گیا تھا۔ تاہم حالات کی ستم ظریفی نے اسے سامانِ ظرافت کی شکل دے دی تھی۔ وہ بڑا پریشان اور درماندہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی شخصیت کا دبدبہ کہیں دب دبا کر رہ گیا تھا۔

اُس نے اپنی بیوی اور بچی کی معیت میں ایک اجنبی (مجھے) کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو چونک کر کھڑا ہو گیا۔ اس سے قبل وہ حوالات کے زخمی فرش پر گھٹنوں میں سر دیئے اکڑوں بیٹھا تھا۔ مئی کی گرمی حوالات کے اندر کچھ زیادہ ہی اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ مستقیم پوری طرح پسینے میں نہایا ہوا تھا۔

رسمی کلمات کے بعد میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام مرزا امجد بیگ ہے۔ تمہاری بیوی کی کوشش سے ایک سماجی شخصیت ستار بزمی نے مجھے تمہارا وکیل مقرر کیا ہے۔ میں تم سے چند ضروری باتیں کرنے یہاں آیا ہوں لیکن ــــــــ''

میں نے جملہ نامکمل چھوڑ کر تھوڑا توقف کیا پھر بات کو جاری رکھتے ہوئے اضافہ کیا۔

''لیکن پہلے تم اپنی بیوی اور بیٹی سے تسلی کی دو باتیں کر لو۔ میں بعد میں تمہارا انٹرویو کروں گا۔''

یہ تجویز میں نے ایک خاص احتیاط کے پیشِ نظر دی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ جلد ہی فوزیہ اور نرگس کو وہاں سے ہٹانے کے ''احکام'' آ جائیں گے۔ میں چاہتا تھا وہ اپنی فیملی سے تھوڑی گفتگو کر لے تا کہ ہر دوسرے کا دلی غبار چھٹ جائے۔ یہ بہت ضروری تھا۔

پانچ منٹ کے بعد میں نے فوزیہ سے کہا۔ ''اب آپ بچی کو لے کر تھانے کے برآمدے میں چلی جائیں اور چوبی بنچ پر بیٹھ کر میرا انتظار کریں۔ میں مستقیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ کے پاس آتا ہوں۔''

فوزیہ نگراں کانسٹیبل کی رہنمائی میں وہاں سے رخصت ہو گئی تو میں آہنی سلاخوں کی دوسری طرف موجود مستقیم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سب سے پہلے میں نے نہایت ہی اہم کاغذی کارروائی مکمل کی۔ وکالت نامے اور چند ضروری کاغذات پر مستقیم کے دستخط لے کر میں فارغ ہوا ہی تھا کہ کانسٹیبل خادم حسین دوبارہ سر پر نازل ہو گیا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے معتدل لہجے میں بولا۔

''وکیل صاحب! آپ کو ملزم سے جو بھی پوچھنا ہے، جلدی جلدی پوچھ لیں۔ آپ کی وجہ سے ہم سب کی نوکریاں داؤ پر لگی ہیں۔''

''مطلب یہ کہ اس وقت آپ سب لوگ جواء کھیل رہے ہیں۔'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔ ''یہ تھانہ ہے یا جوئے کا اڈہ ـــــــ ہوں!''

''آپ میری بات کو مذاق نہ سمجھیں وکیل صاحب!'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''اللہ کے بندے اور خادم حسین! جب تک تم سر پر سوار رہو گے، میں ملزم سے کس طرح بات کر سکوں گا؟'' میں نے لمحے بھر کو توقف کیا پھر سوچنے والے انداز میں اپنی ہپ پاکٹ کو ٹٹول کر بٹوا نکالا اور سرسری سے لہجے میں کہا۔ ''ایسا کرو، تم ایک اچھی سی کڑک چائے پی کر آ جاؤ۔ تب تک میں اپنا کام مکمل کر لیتا ہوں۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے والٹ میں سے پچاس روپے کا ایک کرارا سا نوٹ نکال کر اس کی سمت بڑھا دیا۔ خادم حسین کی آنکھوں میں ضرورت کی چمک نمودار ہوئی۔ اس زمانے میں ایک اچھی اور معیاری چائے کی پیالی ایک روپے میں مل جاتی تھی جو آج کل لگ بھگ دس روپے کی ہے۔ اس نے خوش دلی سے بانی پاکستان، قائدِ عوام کو سلام کیا اور میرے ہاتھ سے پچاس روپے کا نوٹ لے کر تیز تیز ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔

یہ بات یقینی تھی کہ وہ پچاس کپ چائے اپنے معدے میں نہیں اتارے گا اور اس بات پر

بھی کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں نکالی جا سکتی تھی کہ وہ اتنی جلدی بھی واپس نہیں آئے گا جس سے لگے کہ وہ واقعی ایک اچھی سی کڑک چائے نوش فرما کر آ رہا ہے۔ میں ایک بڑی ''کام نکالو شے'' اس کے ہاتھ میں تھما چکا تھا۔

میں نے مستقیم کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''ہاں بھئی! بتاؤ کیا معاملہ ہے؟ وقت کم اور مقابلہ سخت ہے۔ میں نے جس کانسٹیبل کی مٹھی گرم کی ہے، تھوڑی ہی دیر بعد وہ ٹھنڈی مٹھی کے ساتھ واپس آ جائے گا۔ اس لئے مختصر الفاظ میں مجھے کیس کے بارے میں آگاہ کرو۔''

وہ لمحہ بھر سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ''وکیل صاحب! میں نے کچھ نہیں کیا۔ آپ یقین جانیں، میں بے گناہ ہوں۔ میں نے اشفاق صاحب کو قتل کیا ہے اور نہ ہی کوئی رقم لوٹی ہے۔ آپ ـــــــ''

''مجھے پورا یقین ہے، تم بے قصور ہو۔ تمہیں کسی گہری سازش کے تحت اس کیس میں گھسیٹا جا رہا ہے۔'' میں نے اس کا اعتماد بحال کرنے کی غرض سے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ وہ خاصا دل شکستہ اور آزردہ ہو رہا تھا۔ ''لیکن صرف میرے یقین کرنے سے بات نہیں بنے گی۔ تمہاری بے گناہی کو عدالت میں ثابت کرنا پڑے گا اور اس کے لئے ضروری ہے تم سب کچھ سچ سچ مجھے بتا دو۔''

''میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں وکیل صاحب!'' وہ روہانسا ہو گیا۔ ''میں قتل کی اس واردات کے بارے میں کچھ نہیں جانتا ـــــــ''

''ایک منٹ!'' میں نے دو لفظی جملہ بول کر اسے مزید آگے بڑھنے سے روک دیا۔ مجھے یہ احساس ہو چلا تھا کہ وہ پریشانی کی شدت کے باعث پھر کہیں کا کہیں نکل جائے گا۔ اس کی ذہنی کیفیت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ از خود کچھ بتانے کے قابل نہیں لہٰذا میں نے یہی فیصلہ کیا کہ سوالات کے ذریعے اس سے کچھ اُگلوانے کی کوشش کروں۔ اسی خیال کے تحت میں نے اس سے پوچھا۔

''مستقیم! تمہاری بیوی کی زبانی مجھے پتہ چلا ہے، وقوعہ کی رات تم لگ بھگ نو بجے گھر پہنچے تھے اور ساڑھے نو بجے پولیس نے تمہیں گرفتار کر لیا۔ مجھے بتاؤ اس رات تم دیر سے کیوں گھر آئے تھے ورنہ عام طور پر تو تم آٹھ بجے تک واپس آ جاتے ہو؟''

''اُس رات دفتر سے نکلتے ہوئے دیر ہو گئی تھی۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''عام طور پر اشفاق صاحب سات بجے دفتر سے اٹھ جاتے تھے۔ میں انہیں ان کے بنگلے پر پہنچا کر اپنے گھر آ جاتا تھا لیکن وقوعہ کے روز تو سب کچھ عجیب ہوتا چلا گیا تھا۔''

وہ معنی خیز انداز میں خاموش ہوا تو میں نے گہری سنجیدگی سے اصرار کیا۔ ''کیا سب کچھ عجیب ہوتا چلا گیا تھا؟''

''اُس روز دوپہر کے بعد بیگم صاحبہ نے مجھے بنگلے پر بلالیا تھا، گاڑی سمیت۔ وہ اپنی گاڑی کو کسی وجہ سے گیرج میں چھوڑ آئی تھیں اور انہیں گاڑی کے ساتھ ساتھ ڈرائیور کی بھی ضرورت تھی۔ فون اشفاق صاحب کے پاس ہی آیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں گاڑی لے کر بنگلے پر چلا جاؤں۔ میں نے پوچھا کہ ان کی واپسی کا کیا پروگرام ہے؟ انہوں نے بتایا کہ وہ دیر تک دفتر میں بیٹھیں گے اور یہ کہ کسی اہم شخص سے ان کی میٹنگ ہے۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ میں بیگم صاحبہ کے کام نمٹانے کے بعد واپس دفتر نہیں آؤں گا اور اپنے وقت پر چھٹی کر کے گھر چلا جاؤں گا۔ وہ خود ہی کسی طرح گھر چلے جائیں گے۔''

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کی غرض سے متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''میں گاڑی لے کر بنگلے پر پہنچا تو وہ دونوں میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں ـــــ''

''ٹھہرو!'' میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا اور پوچھا۔ ''دونوں کون ـــــ کیا اس بنگلے میں بیگم اشفاق کے علاوہ بھی کوئی موجود تھا؟''

''موجود تھا نہیں جناب! اب تک موجود ہے۔'' وہ زہر خند کے ساتھ بولا۔

میں نے اُلجھی ہوئی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''میں سمجھا نہیں تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟ میری معلومات کے مطابق مقتول کے یہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔''

یہ بات مجھے دفتر میں فوزیہ نے بتائی تھی۔ شاید میں اس کا ذکر کرنا بھول گیا ہوں۔ مستقیم نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔

''آپ کی معلومات بالکل درست ہیں وکیل صاحب! اشفاق صاحب نے بڑھاپے میں ایک جوان عورت سے شادی کی تھی اور دو سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی یہ متضاد جوڑا ابھی تک بے اولاد ہی تھا۔'' وہ اتنا کہہ کر تھوڑی دیر کے لئے چپ ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے جس دوسرے کا ذکر کیا ہے وہ ڈاکٹر خاور ہے۔''

''ڈاکٹر خاور!'' میں نے متذبذب انداز میں دہرایا۔ ''مقتول بے اولاد تھا۔ اس صورتِ حال میں اس بنگلے میں مقتول اور اس کی بیوی کو رہائش پذیر ہونا چاہئے تھا۔ کیا ڈاکٹر خاور ان دونوں میں سے کسی کا رشتے دار ہے؟''

''نہیں جناب! ـــــ وہ تو کسی کا بھی رشتے دار نہیں۔'' مستقیم نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

''پھر یہ ڈاکٹر خاور مقتول کے بنگلے میں کس حیثیت سے رہ رہا تھا؟'' میں نے مستقیم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''بلکہ تم نے بتایا ہے کہ اب تک رہ رہا ہے۔''

مستقیم نے لحہ بھر سوچا، پھر بتانے لگا۔ ''ڈاکٹر خاور دراصل اشفاق صاحب کے ایک دیرینہ اور مرحوم دوست کا چھوٹا بھائی ہے۔ اشفاق صاحب کا مذکورہ دوست داور، سکھر میں رہتا تھا۔ ان لوگوں کا خاندان اب بھی وہیں سکھر میں آباد ہے۔ تاہم ان کا اکثر و بیشتر کراچی میں آنا جانا ہوتا رہتا ہے۔ خاور نے کچھ عرصہ پہلے اندرونِ سندھ کے کسی میڈیکل کالج سے ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا تھا۔ اندرونِ سندھ ہی کے ایک دو ہسپتالوں میں اس نے جاب بھی کی ہے لیکن بقول ڈاکٹر خاور اسے وہاں کام کرنے میں مزہ نہیں آیا۔ چنانچہ تین ماہ پہلے اس نے اشفاق صاحب سے رابطہ کر کے کراچی آنے کی خواہش ظاہر کی۔ اشفاق صاحب اپنے مرحوم دوست داور سے بہت قریب تھے لہٰذا انہوں نے خاور کو فوراً خوش آمدید کہا۔ اس طرح ڈاکٹر خاور کراچی پہنچ گیا۔ تب سے وہ اشفاق صاحب کے بنگلے کی بالائی منزل پر مقیم ہے۔ اشفاق صاحب اسے کسی اچھے اور بڑے ہسپتال میں لگوانے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ یہ اندوہناک واقعہ پیش آ گیا۔''

مستقیم بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گیا پھر بڑی امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے ملتجیانہ انداز میں بولا۔

''وکیل صاحب! میں آپ کو ہر طرح یقین دلانے کو تیار ہوں کہ میں نے اشفاق صاحب کو قتل نہیں کیا۔ میں ـــــ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو بہت اچھے تھے ـــــ میرے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرتے تھے۔ میں قاتل نہیں ہوں جناب ـــــ''

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم قاتل ہوتے تو میں تمہارا کیس لیتا! بتاؤ؟'' میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں یہ سوال محض اس لئے کیا تھا کہ مستقیم کا کھویا ہوا اعتماد واپس آ جائے۔ وہ میرے استفسار کا جواب دینے کی بجائے عاجزانہ انداز میں بولا۔

''وکیل صاحب! خدارا آپ مجھے اس مصیبت سے نکالیں۔ آپ کا یہ احسان میں زندگی بھر یاد رکھوں گا۔ میں اور میرے بیوی بچے آپ کو دعائیں دیں گے۔''

''میں اسی کوشش میں ہوں کہ تم باعزت بری ہو جاؤ۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر پوچھا۔ ''تم مجھے وقوعہ کے روز بعد از دوپہر پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بتا رہے تھے ـــــ جب تم مقتول کے بنگلے پر پہنچے تو وہ دونوں تمہارا انتظار کر رہے تھے؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور ٹوٹے ہوئے گفتگو کے سلسلے کو جوڑ لگاتے ہوئے آگے بڑھا۔

''میں نے بیگم صاحبہ کو بتایا کہ میں گاڑی لے کر آ گیا ہوں۔ بتائیں کہاں جانا ہے؟ بیگم صاحبہ نے جواب دیا کہ انہیں تو کہیں نہیں جانا۔ گاڑی انہوں نے ڈاکٹر خاور کے لئے منگوائی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ہدایت دی کہ میں ڈاکٹر خاور کے ساتھ جاؤں۔ ڈاکٹر خاور کو جہاں جہاں، جو جو بھی کام ہے وہ نمٹا کر آؤں۔ دن کا باقی حصہ میں ڈاکٹر خاور کے ڈسپوزل پر ہوں۔ بیگم صاحبہ کے احکام کے جواب میں، میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ مجھے بھلا اس ڈیوٹی پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اشفاق صاحب کی طرف سے مجھے اطمینان تھا۔ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ آج میں انہیں لینے کے لئے نہ آؤں، وہ خود ہی واپس آ جائیں گے۔ میں نے بیگم صاحبہ کو یہ بات بتانا ضروری نہ سمجھا۔ میں یہی سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ میں اپنی چھٹی کے وقت تک ڈاکٹر خاور کو گھما پھرا کر واپس لے آؤں گا اور پھر گاڑی کو بنگلے پر چھوڑ کر سیدھا اپنے گھر چلا جاؤں گا۔''

مستقیم نے سانس لینے کی غرض سے بیان میں تھوڑا توقف کیا، پُر اُمید اور امداد طلب نظر سے میری طرف دیکھا پھر سلسلۂ بیان کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''ڈاکٹر خاور کی ہدایت پر میں گاڑی شہر کی مختلف سڑکوں پر گھماتا رہا۔ وہ دو تین ہسپتالوں میں بھی گیا اور ایک دو بنگلوں میں بھی اس کا جانا ہوا۔ میں تو یہی سمجھا کہ وہ اپنی جاب کے سلسلے میں ہی سرگرداں ہے۔ اس دوران ہمارے درمیان مختلف موضوعات پر ہلکی پھلکی گفتگو بھی ہوتی رہی۔ وہ اس روز خاصی بے تکلفی سے بات کر رہا تھا۔ ممکن ہے وہ ایسا ہی خوش مزاج ہو۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس سے پہلے میں نے خود ہی کبھی اس سے زیادہ فری ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جب وہ میری خانگی زندگی کے بارے میں پوچھ رہا تھا تو مجھے اچھا لگا۔ اس نے سراہنے والے انداز میں مجھ سے کہا۔

''مستقیم! تم نے بر وقت شادی کر کے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔ اللہ نے تمہیں اولاد جیسی نعمت سے بھی نواز دیا ہے۔ ایک طرح سے تمہاری فیملی مکمل ہو گئی ہے۔ میں اشفاق بھائی کو دیکھتا ہوں تو دل کڑھتا ہے۔ عمر کی اس منزل پر انہوں نے شادی تو کر لی لیکن اولاد کے بغیر گھر میں جو ویرانی نظر آتی ہے اسے ختم کرنے کی کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی۔''

''ڈاکٹر خاور، اشفاق صاحب کو ''اشفاق بھائی'' کہتا تھا۔ ان کے ذکر پر ڈاکٹر اُداس ہو گیا تو میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! آپ بھی اس معاملے میں دیر نہ کر دینا۔ صحیح وقت پر شادی ہو جائے تو پھر کم سے کم مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

وہ پُر خیال انداز میں بولا۔ ''میں اشفاق بھائی والی غلطی کو نہیں دہراؤں گا۔ ذرا میری جاب

کا مسئلہ حل ہو جائے، اس کے بعد پہلی فرصت میں شادی کر لوں گا۔"
وہ خاصی بے تکلفی سے بات کر رہا تھا لہٰذا میں نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔ "کیا آپ کی منگنی وغیرہ ہو چکی ہے؟"
"نہیں، ابھی کہاں؟" اس نے سرسری انداز میں جواب دیا پھر فوراً گفتگو کے موضوع کو بدل کر دوسری باتیں کرنے لگا۔
"میں سمجھ گیا وہ دانستہ اس موضوع سے کنی کاٹ گیا تھا۔ میں نے بھی پھر اصرار نہیں کیا۔ ہمارے درمیان مختلف موضوعات پر بات چیت ہوتی رہی۔ پھر ایک بار وہ گھر کی ویرانی اور اشفاق صاحب کی بڑھاپے کی شادی کا تذکرہ کرنے لگا۔ کافی عرصے سے میرے ذہن میں ایک سوال تھا جس کے بارے میں، میں نے کسی سے نہیں پوچھا تھا۔ مجھے اشفاق صاحب کی ڈرائیوری کرتے ہوئے کم و بیش پانچ سال ہو گئے تھے۔ بیگم صاحبہ سے ان کی شادی میری ملازمت کے دوران ہوئی تھی۔ مجھ سمیت دفتر کے تمام لوگ اس شادی میں شریک ہوئے تھے اور سب اشفاق صاحب کی قسمت پر رشک کر رہے تھے جنہیں بڑھاپے میں ایک دلکش و دل نشین، کم عمر اور جوان بیوی مل گئی تھی۔ اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ بیگم صاحبہ حُسنِ بے مثال کی مالک ہیں۔ پتہ نہیں اشفاق صاحب نے انہیں حاصل کرنے کے لئے کون سی گیدڑ سنگھی استعمال کی تھی۔"
وہ حیرت اور دلچسپی کے تاثرات چہرے پر سجائے تھوڑی دیر کو متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میں نے آپ کو بتایا ہے کہ کافی عرصے سے میرے ذہن میں ایک سوال کروٹیں بدلتا رہتا تھا۔ وہ سوال اشفاق صاحب کی نجی زندگی سے متعلق تھا۔ میں نے انہیں ملازمین کے ساتھ وسیع و عریض بنگلے میں "اکیلے" رہتے ہوئے دیکھا تھا۔ بیگم صاحبہ سے ان کی شادی دو سال پہلے ہوئی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا اس شادی سے قبل انہوں نے زندگی میں کبھی کوئی شادی کی تھی یا نہیں۔ میں نے ڈاکٹر خاور کو دوستانہ انداز میں باتیں کرتے دیکھا تو سوچا یہ سوال مجھے ڈاکٹر سے کرنا چاہئے۔ ان دونوں خاندانوں کے دیرینہ تعلقات تھے۔ ڈاکٹر خاور یقیناً اشفاق صاحب کے ماضی کے بارے میں جانتا ہو گا۔ چنانچہ میں نے صورتِ حال کو موافق دیکھتے ہوئے ڈاکٹر خاور سے پوچھ لیا۔
"ڈاکٹر صاحب! کیا یہ اشفاق صاحب کی پہلی شادی ہے یا انہوں نے اس سے پہلے بھی کبھی شادی کی تھی؟"
"ہاں۔" ڈاکٹر نے اثبات میں جواب دیا۔ "جوانی کے زمانے میں اشفاق بھائی نے شادی

کی تھی جو تین سال تک سلامت رہی، پھر ختم ہو گئی۔ پتہ نہیں یہ دوسری شادی کب تک ——— ''اُس نے بولتے بولتے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں سمجھ گیا وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ پتہ نہیں یہ دوسری شادی کب تک چلے گی۔ اس نے چونکہ ازخود بات ادھوری چھوڑ دی تھی لہٰذا میں نے بھی پھر اس حوالے سے کوئی سوال نہ کیا اور صرف اتنا پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب! کیا پہلی بیوی سے اشفاق صاحب کی کوئی اولاد ہوئی تھی؟''

''نہیں۔'' اس نے قطعیت سے جواب دیا اور خاموش ہو گیا۔

ہمارے درمیان اشفاق صاحب کے حوالے سے پھر کوئی بات نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر خاور کی ہدایت پر شام چھ بجے ہم نارتھ ناظم آباد کے ایک بنگلے پر پہنچے۔ مجھے گاڑی میں چھوڑ کر ڈاکٹر خاور یہ کہتے ہوئے مذکورہ بنگلے میں داخل ہو گیا۔

''بس پانچ منٹ کا کام ہے۔ تم بیٹھو، میں آ رہا ہوں۔''

اُس نے کہا بیٹھو اور میں گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا رہ گیا۔ اشفاق صاحب بنگلے کی طرف روانہ کرتے وقت مجھ سے کہہ چکے تھے کہ رات کو وہ خود ہی گھر آ جائیں گے لہٰذا مجھے بھی جلدی واپس جانے کی فکر نہیں تھی۔ بیگم صاحبہ نے بھی کہہ دیا تھا آج کا دن میں ڈاکٹر خاور کی ڈسپوزل پر ہوں اس لئے بھی میں ہر طرف سے مطمئن تھا۔

ڈاکٹر خاور نے پانچ منٹ بعد آنے کو کہا تھا لیکن ایک منٹ سے بھی پہلے وہ نمودار ہوا اور مجھ سے کہنے لگا۔

''یار مستقیم! میں جن صاحب سے ملنے یہاں آیا تھا وہ اس وقت گھر میں موجود نہیں ہیں۔ انہیں آنے میں گھنٹہ، آدھا گھنٹہ لگ سکتا ہے۔ مجھے ان سے ایک ضروری سلسلے میں ملاقات کرنی ہے۔ ایسا کرو تم گاڑی لے کر واپس بنگلے پر چلے جاؤ۔ میرے ساتھ کب تک یہاں انتظار میں بیٹھے سوکھتے رہو گے۔ تمہیں اشفاق بھائی کو بھی دفتر سے لینا ہو گا۔ میں ان صاحب سے فارغ ہونے کے بعد خود ہی کسی طرح واپس آ جاؤں گا۔''

ڈاکٹر خاور کو معلوم نہیں تھا کہ آج مجھے اشفاق صاحب کو دفتر سے اٹھا کر گھر نہیں چھوڑنا اور یہ اطلاع اسے فراہم کرنا میں نے ضروری بھی نہ جانا۔ چنانچہ چپ چپاتے ڈاکٹر کو نارتھ ناظم آباد والے بنگلے پر چھوڑ کر میں واپس آ گیا۔''

وہ سانس لینے کی غرض سے چند لمحات کے لئے متوقف ہوا پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے دوبارہ گویا ہوا۔

''وکیل صاحب! میں لگ بھگ چھ بجے صاحب کے بنگلے پر پہنچا۔ ارادہ یہی تھا کہ گاڑی کو

گیراج میں کھڑا کر کے گھر چلا جاؤں گا لیکن یہاں پہنچ کر مجھے ایک غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ میرے ہارن بجانے پر جب گھریلو ملازمہ نے گیٹ کھولا اور میں نے گاڑی کو بنگلے کے اندر لے جانا چاہا تو اصغری نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کرتے ہوئے کہا۔

''گاڑی کو باہر ہی رہنے دو اور بیگم صاحبہ سے مل لو۔ شاید انہیں تم سے کوئی ضروری کام ہے۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں تمہیں اس بارے میں بتا دوں۔''

میں نے گاڑی کو بنگلے کے باہر ہی چھوڑا اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت میرا ذہن بیگم صاحبہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ملازمہ نے بتایا تھا، انہیں مجھ سے کوئی ضروری کام ہے اور گاڑی کو اندر نہ لانے کی تاکید یہ ظاہر کرتی تھی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر کہیں جانا چاہتی ہیں ــــــ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ ان کی اپنی گاڑی ابھی ٹھیک ہو کر واپس نہیں آئی۔

میں بیگم صاحبہ کے پاس پہنچا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی انہوں نے کہا۔ ''مستقیم! تمہیں صاحب کے دفتر جانا ہو گا۔ وہ سات بجے دفتر سے اٹھیں گے۔ تم انہیں یہاں پہنچا کر اپنے گھر چلے جانا۔'' پھر انہوں نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالی اور کہا۔ ''سات بجنے میں بیس پچیس منٹ باقی ہیں۔ تم فوراً اس طرف روانہ ہو جاؤ۔''

میں اُلجھ کر رہ گیا۔ متذبذب انداز میں، میں نے کہا۔

''بیگم صاحبہ! انہوں نے دوپہر میں مجھے آپ کی طرف بھیجتے ہوئے ہدایت کی تھی کہ آج میں انہیں لینے کے لئے نہ آؤں۔ کسی اہم شخص سے ان کی ضروری میٹنگ ہے۔ میٹنگ سے فارغ ہونے کے بعد وہ خود ہی گھر آ جائیں گے۔''

''میٹنگ کا ذکر انہوں نے صبح مجھ سے بھی کیا تھا۔'' بیگم صاحبہ نے بتایا۔ ''اسی لئے میں نے اطمینان سے تمہیں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ بھیج دیا تھا لیکن تھوڑی دیر پہلے تمہارے صاحب کا فون آیا تھا۔ انہوں نے تمہارے بارے میں پوچھا۔ میں نے بتا دیا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ اگر تم ساڑھے سات بجے سے پہلے واپس آؤ تو میں تمہیں دفتر بھیج دوں۔ ایسا لگتا ہے ان کی ضروری میٹنگ پوسٹ پون ہو گئی ہے۔ تم جلدی سے جاؤ اور انہیں لے کر آ جاؤ۔''

میں متاملانہ انداز میں جانے کے لئے مڑا تو انہوں نے پوچھ لیا۔ ''ڈاکٹر صاحب کو تم کہاں چھوڑ آئے ہو؟''

''وہ نارتھ ناظم آباد میں اپنے کسی دوست کے بنگلے پر رک گئے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کہہ رہے تھے انہیں واپسی میں دیر ہو جائے گی لہٰذا میں چلا جاؤں ــــــ اور میں چلا آیا۔''

''ٹھیک ہے۔'' بیگم صاحبہ نے سرسری انداز میں کہتے ہوئے بات ختم کر دی ــــــ میں

گاڑی لے کر دفتر روانہ ہو گیا۔"

مستقیم نے اپنی کتھا کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔"جب میں دفتر پہنچا تو سات بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ اس وقت اسٹاف کے لوگ چھٹی کر کے گھر جا چکے تھے۔صرف فیض صاحب اپنی سیٹ پر موجود تھے۔فیض صاحب ایک طویل عرصہ سے اشفاق صاحب کی ٹریڈنگ کمپنی میں ملازم ہیں۔لگ بھگ بیس سال سے وہ اس کمپنی کے لئے خدمات انجام دے رہے ہیں۔فیض صاحب انگوٹھا ٹیک چٹے ان پڑھ ہیں لیکن اپنی دور اندیشی، بردباری اور تجربے کی بناء پر اشفاق صاحب کے لئے انتہائی قابلِ بھروسہ شخصیت ہیں۔وہ اشفاق صاحب کی آمد سے پہلے دفتر میں موجود ہوتے ہیں اور جب تک اشفاق صاحب وہاں سے رخصت نہیں ہو جاتے وہ اپنی سیٹ پر جمے بیٹھے رہتے ہیں۔فیض صاحب، اشفاق صاحب کے بعد اس کمپنی کی سب سے اہم شخصیت ہیں اور ـــــ"

"آپ مجھے بتا رہے تھے کہ جب آپ اشفاق صاحب کو لینے دفتر پہنچے تو فیض صاحب اپنی سیٹ پر موجود تھے؟" میں نے اس خیال سے قطع کلامی ضروری سمجھی کہ اگر مستقیم کو روکا نہ گیا تو وہ کسی غیر ضروری رُخ پر چلتے ہوئے وقت برباد نہ کر بیٹھے۔ میں کانسٹیبل خادم حسین کی واپسی سے پہلے تمام ضروری اور اہم امور نمٹا لینا چاہتا تھا۔ میں نے مزید کہا۔"جبکہ اسٹاف کے دیگر افراد ڈیوٹی مکمل کر کے وہاں سے رخصت ہو چکے تھے۔"

اس نے ایک لمحے تک سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔"اے۔این۔اے ٹریڈنگ کمپنی میں صبح دس بجے سے شام چھ بجے تک کام ہوتا ہے اسی لئے اس وقت فیض صاحب کے سوا کوئی اور شخص وہاں موجود نہیں تھا۔ بہر حال میں فیض صاحب کے پاس بیٹھ گیا اور انہیں بتایا کہ میں صاحب کو لینے کے لئے آیا ہوں۔انہوں نے سات بجے گھر جانا ہے۔"

فیض صاحب نے کہا۔"صاحب کو تو کسی دوست کا انتظار ہے۔میرا خیال ہے جب تک وہ اپنے دوست سے ملاقات نہیں کر لیتے، دفتر سے نہیں اٹھیں گے۔کیا یہ بات انہوں نے تمہیں نہیں بتائی تھی؟"

"بتائی تھی ـــــ" میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔"اور اسی وجہ سے میں اس طرف آنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔صاحب نے واضح طور پر مجھ سے کہا تھا کہ انہیں دفتر میں خاصی دیر ہو جائے گی لہٰذا وہ واپسی کے لئے خود کوئی بندوبست کر لیں گے۔ میں انہیں لینے کے لئے نہ آؤں۔"

"پھر ـــــ پھر تم کیوں چلے آئے؟" فیض صاحب نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

میں نے مناسب الفاظ میں انہیں، بیگم صاحبہ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتا دیا۔ وہ اُلجھن زدہ انداز میں حیرت کا اظہار کرتے رہے۔ جب میں خاموش ہوا تو انہوں نے کہا۔

''ہمارے دفتر میں ٹیلی فون کی تین لائنیں ہیں جن میں سے دو لائنیں میرے پاس ہیں اور تیسری ڈائریکٹ لائن صاحب کے گھر میں ہے۔ اگر وہ مجھ سے گھر کا نمبر ملواتے تو یہ بات مجھ سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے انہوں نے ڈائریکٹ لائن استعمال کر کے گھر فون کیا ہوگا۔''

''اس سے تو یہ بھی ظاہر ہوتا ہے ان کی ضروری میٹنگ ملتوی ہو گئی ہے۔'' میں نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ سات بجے دفتر سے اٹھنے کی بات نہ کرتے۔''

''ہوں!'' فیض صاحب نے معنی خیز نظر سے مجھے دیکھا اور بولے۔ ''ٹھہرو، میں ان سے بات کرتا ہوں۔ ابھی پتہ چل جائے گا، ان کا پروگرام کیا ہے؟''

پھر فیض صاحب نے انٹرکام پر صاحب سے بات کی۔ پتہ نہیں دوسری طرف سے اشفاق صاحب نے ان سے کیا کہا، میں فیض صاحب کے چہرے پر جھنجلاہٹ کی لکیریں اُبھرتے ڈوبتے دیکھتا رہا۔ چند لمحات کے بعد فیض صاحب نے انٹرکام کا ریسیور رکھ دیا۔

میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا کہا ہے انہوں نے؟''

''صاحب تمہیں اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔'' فیض صاحب نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''آپ کچھ بتائیں تو سہی۔'' میں نے اصراری انداز میں کہا۔

''جو بھی بتانا ہے، صاحب ہی بتائیں گے۔'' فیض صاحب نے ذو معنی انداز میں کہا۔

میں نے پھر ان سے کوئی سوال نہ کیا اور سیدھا صاحب کے کمرے میں پہنچ گیا۔ میں اپنی پشت پر دروازہ بند کر کے مڑا ہی تھا کہ اشفاق صاحب کے غصیلے چہرے سے سامنا ہوا۔ وہ خفگی آمیز لہجے میں مستفسر ہوئے۔

''میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا ـــــ اس کے باوجود تم مجھے لینے آ گئے۔ میں نے کہا تھا نا، میں ایک ضروری میٹنگ سے فارغ ہونے کے بعد خود ہی واپس آ جاؤں گا۔''

میں نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ ''صاحب جی! آپ کا حکم میرے ذہن میں نقش تھا اور میں اس طرف آنے کا کوئی ارادہ بھی نہیں رکھتا تھا۔ لیکن بیگم صاحبہ نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے، آپ نے مجھے بلوانے کے لئے فون کیا تھا۔''

''تمہاری ـــــ اس بیگم صاحبہ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' وہ جھلاہٹ آمیز انداز میں بولے۔ ''میری نگرانی کے لئے مختلف طریقے اپناتی رہتی ہے۔ میں نے صبح اسے بھی بتا دیا تھا کہ

آج ایک ضروری میٹنگ کی وجہ سے مجھے دفتر میں دیر ہو جائے گی اس کے باوجود بھی اس نے تمہیں چھاپہ مارنے کے لئے بھیج دیا۔" وہ لمحہ بھر کے لئے متوقف ہوئے پھر کرید نے والے انداز میں پوچھا۔

"سچ سچ بتاؤ مستقیم! اس جاسوسی کے لئے الماس نے تمہیں کتنے پیسے دینے کا وعدہ کیا ہے؟" الماس، اشفاق صاحب کی حسین و جمیل جوان بیوی کا نام تھا۔

"صاحب جی! ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔ "بیگم صاحبہ نے مجھ سے ایسی کوئی بات کی ہے اور نہ ہی میں اس قسم کا بندہ ہوں۔ آپ یقین کریں آپ جیسا سوچ رہے ہیں ویسا کچھ بھی نہیں۔"

وہ چند لمحات تک بڑی گہری اور کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے رہے پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے ـــــ میں نے تمہاری بات کا یقین کر لیا۔ تم میرے سچے وفادار ہو۔ تم کسی بھی مرحلے پر مجھ سے جھوٹ نہیں بولو گے۔ میں نے ابھی تم سے جو باتیں کی ہیں ان کا کسی سے ذکر نہیں کرنا۔ گاڑی کو تم ادھر ہی چھوڑ کر چھٹی کر جاؤ۔" وہ لمحہ بھر کو متوقف ہوئے پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور ہاں ـــــ تم یہاں سے سیدھے اپنے گھر جانا۔ بنگلے پر حاضری لگوا کر کسی قسم کی رپورٹنگ کرنے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے انہیں ان کی ہدایت پر عمل کرنے کا یقین دلایا اور دفتر سے نکل آیا۔ فیض صاحب کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے گاڑی کی چابیاں یہ کہتے ہوئے ان کے حوالے کر دی تھیں۔

"صاحب نے کہا ہے میں گاڑی کی چابیاں آپ کو دے کر چھٹی کر جاؤں۔"

راستے بھر میں بیگم صاحبہ اور صاحب جی کے بارے میں سوچتا رہا اور اُلجھتا رہا۔ اشفاق صاحب نے مجھ سے بڑی مبہم باتیں کی تھیں۔ انہوں نے بیگم صاحبہ کو فون کرنے کا اقرار کیا اور نہ ہی انکار۔ میں از حد اس بارے میں ان سے پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ اشفاق صاحب نے بیگم صاحبہ کے تعلق سے جاسوسی اور نگرانی کے حوالے سے جو کچھ کہا تھا وہ بھی میرے لئے نیا اور تعجب خیز تھا۔ میں نہیں جانتا تھا ان دونوں میاں بیوی کے درمیان حالات و واقعات کی کون سی کھچڑی پک رہی تھی۔ بہر حال، میں اپنے گھر آ گیا۔"

مستقیم نے بات ختم کر کے ایک طویل اور گہری سانس لی۔ اپنی دانست میں اس نے مجھے مکمل کہانی سنا دی تھی لیکن میرے نزدیک اس کہانی کے بہت سے پہلو ابھی تشنہ اور نامکمل تھے

لہٰذا میں نے چپ ہوتے ہی سوال داغ دیا۔

''آپ نے جو حالات بیان کئے ہیں ان کے مطابق آپ لگ بھگ سوا سات بجے دفتر سے نکلے تھے لیکن واقعات کی رو سے آپ اس روز رات نو بجے گھر پہنچے تھے۔ یہ دو گھنٹے آپ نے کہاں گزارے؟''

''میں اپنے ایک دوست سے ملنے چلا گیا تھا۔'' مستقیم نے خلا میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''ادھر گول مسجد کے قریب واقع لگژری اپارٹمنٹس کے گراؤنڈ فلور پر فاسٹ فوڈ اور دیسی اسپیشل کھانوں کا ایک عمدہ اور عالیشان ریسٹورنٹ کھلا ہے۔ میرا ایک دوست عبدالغفور وہاں ویٹر ہے۔ وہ جب بھی ملتا ہے مجھ سے یہی شکوہ کرتا ہے، میں اس کے پاس کبھی نہیں آیا۔ اس روز میرا ذہن خاصا اُلجھا ہوا تھا اس لئے سوچا کہ عبدالغفور سے مل لیتا ہوں۔ تھوڑی گپ شپ ہو گی تو ذہن تازہ ہو جائے گا۔ میں دیبال ریسٹورنٹ پہنچ گیا۔ ان دنوں کراچی میں فاسٹ فوڈ نیا نیا متعارف ہوا تھا لہٰذا دیبال ریسٹورنٹ میں زیادہ رش نہیں تھا۔ غفور فارغ ہی مل گیا تھا۔ پھر ہم باتوں میں اس قدر محو ہوئے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ میں کم و بیش پونے نو بجے دیبال ریسٹورنٹ سے نکلا اور نو بجے گھر پہنچ گیا ـــــ اور ساڑھے نو بجے پولیس نے میرے گھر سے مجھے گرفتار کر لیا۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''پولیس نے تم پر اشفاق علی کو قتل کر کے لوٹنے کا الزام لگایا ہے۔ تم پر کتنی رقم کی ڈکیتی کا شک کیا جا رہا ہے؟''

''پولیس والے کہتے ہیں میں نے صاحب جی کو قتل کیا اور ان کا بریف کیس اٹھا کر وہاں سے فرار ہو گیا۔'' وہ بڑے یتیمانہ انداز میں بولا۔ ''پولیس کے مطابق اس بریف کیس میں پچاس ہزار روپے کے کرنسی نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ لیکن وکیل صاحب! یہ ساری باتیں بالکل جھوٹی اور بے بنیاد ہیں۔ میں نے صاحب کی جان نہیں لی اور نہ ہی کسی رقم یا بریف کیس کو ہاتھ بھی لگایا ہے۔ میں نے آپ کو بتا دیا ہے، میرے اور صاحب جی کے درمیان کیا باتیں ہوئی تھیں۔ آپ یقین جانیں ـــــ'' اُس کی آواز بھرا گئی۔ چند لمحات کے توقف کے بعد وہ نم ناک آواز میں دوبارہ گویا ہوا۔ ''میں نہیں جانتا میرے دفتر سے نکلنے کے بعد وہاں کیا واقعات پیش آئے تھے۔ پتہ نہیں میں نے زندگی میں ایسی کون سی غلطی کی ہے جس کی سزا کے طور پر میں اس مصیبت میں پھنسا ہوں۔''

میں نے اس سے تسلی تشفی کی چند باتیں کیں اور یقین دلایا کہ وہ حوصلے کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھے۔ نامساعد حالات نے اسے جس مصیبت میں دھکیلا ہے، میں اس دلدل سے

اسے نکالنے کی پوری کوشش کروں گا۔ اس کا اعتماد بحال ہونے لگا تو میں نے اسے مقتول، مقتول کی خوبرو بیوہ، ڈاکٹر خاور، فیض احمد اور گھریلو ملازمین کے بارے میں کرید کرید کر مختلف انداز کے سوال کئے۔ اس کے بعض جوابات میں اسپارکنگ پوائنٹس بھی دیکھنے کو ملے لیکن میں سردست ان نکات کا ذکر نہیں کروں گا تاکہ کہانی کا سسپنس اپنی پوری تابناکی کے ساتھ برقرار رہے۔ تاہم میرا وعدہ ہے کہ عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب مواقع پر آپ کے ذوقِ تجسس اور تفریحِ طبع کے لئے مختلف انکشافات کرتا رہوں گا۔

کانسٹیبل خادم حسین کی واپسی پر مجھے یہ ضروری ملاقات موقوف کرنا پڑی۔ اس کے بعد میں تھانے میں ایک منٹ نہیں رکا۔ میں جس مقصد سے وہاں آیا تھا، اسے حاصل کرلیا تھا۔ فوزیہ اور اس کی بیٹی نرگس کو میں نے محمود آباد نمبر ایک میں ان کی گلی کے نکڑ پر ڈراپ کیا اور اپنے گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔

❀ ❀ ❀

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے چالان پیش کردیا۔

ان تین دنوں میں، میں نے بھی اچھی خاصی دوڑ دھوپ کی تھی۔ اس سلسلے میں عبدالرؤف نامی دراز قامت دانا و بینا شخص نے مجھ سے بھرپور تعاون کیا۔ حوالات میں ملزم سے ملاقات کرنے کے اگلے ہی روز میں نے عبدالرؤف کو اپنے دفتر میں بلاکر چند ضروری اور اہم نوعیت کی ذمے داریاں سونپ دی تھیں۔ عبدالرؤف خاصا مستعد اور تعلق والا آدمی تھا۔ مجھے اس سے بڑی اُمید تھی اور وہ خاصی حد تک میری توقعات پر پورا بھی اُترا۔ میں نے اس کے سپرد جو کام کئے تھے ان میں سے بیشتر اس نے کرڈالے تھے اور باقی کی تکمیل آئندہ دو چار دن میں ہونے کا یقین دلایا تھا۔ ملزم مستقیم کی گفتگو سے میں نے جو مفید نکات جمع کئے تھے اسی سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کا فریضہ میں نے عبدالرؤف کو سونپا تھا اور میں اس بندے کی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن تھا۔

پولیس نے ملزم کے خلاف جو استغاثہ دائر کیا وہ رپورٹ کئی صفحات پر مشتمل تھی۔ میں اس کی تفصیل میں جاکر آپ کا قیمتی وقت برباد کروں گا اور نہ ہی آپ کو کسی بوریت میں گھسیٹنے کا میرا ارادہ ہے۔ یہاں میں آپ لوگوں کی دلچسپی اور معلومات کی غرض سے استغاثہ کی رپورٹ کا خلاصہ بیان کرتا ہوں تاکہ دونوں طرف کے حالات آپ کے ذہن میں تازہ ہو جائیں اور عدالتی کارروائی کے دوران آپ کی سوچ کسی اُلجھن کا شکار نہ ہونے پائے۔

استغاثہ نے میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم مستقیم کو ایک انتہائی چالاک اور عیار شخص

قرار دیتے ہوئے الزام لگایا تھا کہ وہ کافی عرصہ سے کسی سنہرے موقع کی تلاش میں تھا۔ پھر وقوعہ کے روز اسے یہ موقع میسر آ گیا۔ وہ مقتول کے منع کرنے کے باوجود بھی اسے لینے کے لئے دفتر پہنچ گیا۔ اسے کسی طرح یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس روز شام کے وقت مقتول کے بریف کیس میں ایک خطیر رقم کے کرنسی نوٹ موجود ہوں گے۔ اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے باس کو قتل کرنے کے بعد وہاں سے فرار ہو گیا۔ بعدازاں رات ساڑھے نو بجے پولیس نے ملزم کو اس کے گھر سے گرفتار کر لیا۔

لاش کی دریافت کا سہرا فیض احمد کے سر باندھا گیا تھا۔ استغاثہ کے مطابق ملزم کے دفتر سے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد فیض احمد کو مقتول کے کمرے میں جانے کی ضرورت پیش آ گئی تھی اور اسی وقت پتہ چلا کہ اشفاق علی اپنی کرسی پر مُردہ بیٹھا ہوا ہے۔ بیٹھنے کی اس پوزیشن میں اس کی گردن بڑے بے ڈھنگے انداز میں ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی۔ اس روز مقتول پتلون اور کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ فیض احمد نے مقتول کے کوٹ کو عین دل کے مقام پر خون آلود پایا۔ مذکورہ مقام پر دو بڑے واضح سوراخ بھی نظر آ رہے تھے۔ ان سوراخوں کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ دو سفاک گولیوں نے ان روزنوں میں سے گزر کر مقتول کے دل تک رسائی حاصل کی ہو گی۔

اس منظر نے فیض احمد کو پریشان کرنے کے ساتھ ہی بے حد حیران بھی کیا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ انٹر کام پر اپنے باس سے گفتگو کر چکا تھا۔ اس کے بعد ملزم نے پانچ دس منٹ مقتول کے کمرے میں گزارے تھے اور گاڑی کی چابیاں اسے دیتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ اس دوران جبکہ ملزم مقتول کے کمرے میں موجود رہا، فیض احمد نے گولی چلنے کی یا اس سے مشابہ کوئی آواز نہیں سنی۔ وہ اسی امر پر حیرت زدہ تھا کہ کس وقت مقتول کو فائرنگ کا نشانہ بنایا گیا۔ تاہم پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے فیض احمد کی حیرت دور کر دی تھی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق، مقتول اشفاق علی کو سائلنسر لگے ریوالور سے فائرنگ کر کے ہلاک کیا گیا تھا۔ اس کے دل میں اترنے والی ریوالور کی دونوں مہلک گولیاں انتہائی خطرناک ثابت ہوئی تھیں اور مقتول جھٹ پٹ اِس جہانِ فانی سے اُس جہانِ ابدی میں منتقل ہو گیا۔ مقتول کی موت کا وقت اُنیس مئی کی رات، سات سے آٹھ بجے کے درمیان بتایا گیا تھا۔ جائے وقوعہ پر، خصوصاً کمرے کے دروازے کے اندرونی اور بیرونی ہینڈل پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے اور یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ میرا مؤکل وقوعہ کے روز دو مرتبہ اس کمرے میں آیا اور گیا تھا۔ وہاں اس کے فنگر پرنٹس کا پایا جانا ایک فطری بات تھی۔

اس کیس کا سب سے دلچسپ پہلو یہ تھا کہ ریمانڈ کی مدت کے دوران تمام تر سختی آزمانے کے باوجود بھی پولیس نہ تو ملزم کے قبضے سے لوٹے ہوئے پچاس ہزار روپے کے کرنسی نوٹ برآمد کرسکی تھی اور نہ ہی آلۂ قتل کا کوئی سراغ مل سکا تھا۔ اس سلسلے میں پولیس نے اپنی نالائقی کو چھپانے کے لئے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ ملزم نے آلۂ قتل کو کسی گٹر وغیرہ میں بہا دیا ہوگا کیونکہ اس کام کے لئے اسے اچھا خاصا وقت مل گیا تھا اور مالِ مسروقہ کو بھی اس نے نہایت ہی خفیہ طریقہ سے کہیں ٹھکانے لگا دیا ہوگا۔

اس کے علاوہ بھی استغاثہ کی رپورٹ میں بعض تکنیکی پوائنٹ شامل تھے جن کا یہاں پر ذکر کرنا ''خواہ مخواہ'' کے مترادف ہوگا۔ کیونکہ یہ باتیں آپ کی سمجھ میں آئیں گی اور نہ ہی ایسی خشک اور بور باتوں سے آپ کو کوئی دلچسپی ہوگی۔

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد ملزم کو عدالت میں پیش کیا گیا تو میں نے اپنے وکالت نامے کے ساتھ ہی ملزم کی درخواست ضمانت بھی دائر کر دی۔ جج نے میرے دائر کردہ کاغذات کا بغور جائزہ لیا تاہم وہ خاموش ہی رہا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ضمانت کے حق میں بولنا شروع کر دیا۔

''جنابِ عالی! میرا مؤکل اس معاشرے کا ایک شریف شہری ہے۔ اس کی امن پسندی اور صلح جوئی میں کوئی کلام نہیں۔ آج تک وہ کسی سنگین تو کیا چھوٹے موٹے جرم میں بھی ملوث نہیں پایا گیا۔ اس کی گرفتاری سراسر بد دیانتی پر مبنی ہے۔ لہٰذا میں معزز عدالت سے پُرزور استدعا کروں گا کہ وہ ملزم کی درخواست ضمانت کو منظور کرتے ہوئے انصاف کے تقاضے پورے کرے۔''

''یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے بڑی کراری آواز میں ضمانت کے خلاف اپنے زرّیں خیالات کا آغاز کیا۔ ''ملزم کس درجے کا شریف شہری ہے یہ تو اس کے ''کارنامے'' ہی سے ظاہر ہو رہا ہے۔'' اس نے لفظ کارنامے پر خاصا زور دیا تھا۔ ''ملزم کی امن پسندی اور صلح جوئی کو ثابت کرنے کے لئے وکیل صفائی کو بہت وقت ملے گا لہٰذا میں یہاں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ جائے وقوعہ پر ملزم کے فنگر پرنٹس اس انداز میں پائے گئے ہیں جو اس کے مجرم ہونے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ملزم کی گرفتاری میں کسی کی کوئی بد نیتی شامل نہیں۔ واضح رہے ملزم وہ شخص ہے جس نے مقتول کو آخری مرتبہ نہ صرف زندہ دیکھا ہے بلکہ اس سے مختصر گفتگو بھی کی لہٰذا میں اسی بات پر زور دوں گا کہ ملزم کی درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے مقدمے کی کارروائی کو آگے بڑھایا جائے۔'' وہ لمحہ بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے

ہوئے بولا۔

''میرے فاضل دوست نے بڑی عجیب بات کی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وکیل استغاثہ نے طنزیہ نظر سے میری طرف دیکھا اور دوبارہ روئے سخن کو جج کی طرف پھیرتے ہوئے کہنے لگا۔

''مجھے یقین تو نہیں ہے پھر بھی اگر بالفرضِ محال وکیل صفائی کی بات کو درست مان بھی لیا جائے تو یہ بات دعوے سے کیسے کہی جاسکتی ہے کہ جو شخص کبھی کسی چھوٹے موٹے جرم میں ملوث نہیں رہا وہ آئندہ زندگی میں کبھی کوئی جرم نہیں کرے گا۔ ہم کسی شخص کے ماضی کی روشنی میں اس کے مستقبل کا فیصلہ تو نہیں کر سکتے اگر وکیل صاحب کی تھیوری کو مستند فارمولا مان لیا جائے تو پھر ہر شخص کا پہلا جرم قابلِ معافی ہونا چاہیے کیونکہ قبل ازیں اس کا ماضی اس حوالے سے بے داغ ہی نظر آئے گا۔''

دلیل ختم کرتے ہی وہ فخریہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جنابِ عالی! میں نے کسی شخص کے مجرم ہونے یا نہ ہونے کے سلسلے میں کوئی اصول یا فارمولا پیش نہیں کیا بلکہ ایک عام اور معقول سی بات کی ہے۔ ملزم کے کردار اور معاشرتی رویے کو بے داغ اور اعلیٰ ثابت کرنے کے لئے میرے پاس بہت کچھ ہے جو عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر سامنے لاؤں گا۔ فی الحال میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میرا مؤکل عرصہ پانچ سال سے مقتول کے پاس ملازمت کر رہا تھا۔ اس دوران اسے بارہا ایسے مواقع میسر آئے ہوں گے جب وہ کوئی بھاری رقم خرد برد کرنے میں کامیاب ہوسکتا تھا۔ اگر وہ مجرمانہ ذہنیت کا مالک ہوتا تو اب تک اس کے کریڈٹ پر ایسے بہت سے کارنامے درج ہوتے۔ میں ایک مرتبہ پھر معزز عدالت کو بتانا چاہوں گا کہ میرے مؤکل کو ایک سوچی سمجھی اور گہری سازش کے تحت اس کیس میں ملوث کیا گیا ہے لہٰذا اس کی درخواست ضمانت کو منظور کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔''

وکیل استغاثہ نے تیز آواز میں کہا۔ ''یور آنر! وکیل صفائی کو اگر ملزم کے بے گناہ ہونے کا اتنا ہی یقین ہے تو انہیں یہ ثابت کرنے کے لئے پورا پورا موقع دیا جائے گا۔ ابھی تو اس کیس کی سماعت کا آغاز ہوا ہے۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں ملزم کو فوری طور پر ضمانت پر رہا کرنا انصاف کے تقاضوں کے منافی ہوگا۔''

آئندہ دس منٹ تک میرے اور وکیل استغاثہ کے درمیان ضمانت کے حق اور مخالفت میں گرماگرم بحث ہوتی رہی لیکن نتیجہ صفر کے برابر ہی برآمد ہوا۔ جج پوری توجہ سے ہمارے دلائل

سنتا رہا اور بالآخر اس نے میرے مؤکل کی ضمانت کی درخواست کو نامنظور کرتے ہوئے عدالت کی باقاعدہ کارروائی کے لئے تاریخ دے دی۔

میرے لئے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ قتل کے ملزم کی ضمانت بمشکل ہوتی ہے اور اس کام کو تقریباً ناممکن ہی سمجھا جاتا ہے۔ میں اپنی اس روز کی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن تھا۔

اس روز عدالت میں ملزم کی بیوی فوزیہ کے علاوہ عبدالرؤف بھی موجود تھا۔ نرگس کو مصلحتاً فوزیہ پڑوس میں چھوڑ آئی تھی۔ اس کا یہ اقدام سمجھ داری پر مبنی تھا۔ نرگس معصوم سوچ کی مالک ایک ننھی سی گڑیا تھی۔ باپ کو عدالت کے کٹہرے میں دیکھ کر خواہ مخواہ اس کا ذہن پریشان ہو جاتا۔ فوزیہ نے اسے اپنے ساتھ نہ لا کر عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔

میں عدالت کے کمرے سے باہر نکلا تو عبدالرؤف اور فوزیہ میرے دائیں بائیں چلنے لگے۔ فوزیہ نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ ''وکیل صاحب! مستقیم کی ضمانت تو نہیں ہو سکی۔ اب کیا ہو گا؟''

''اب جو بھی ہو گا وہ تمہارے اور تمہارے شوہر کے حق میں اچھا ہی ہو گا۔'' میں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا پھر اسے قتل کے ملزم اور اس کی ضمانت کے مسائل سے آگاہ کرنے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔ ''انشاء اللہ اس کیس کا فیصلہ آپ کے شوہر کی آزادی کا پیغام ثابت ہو گا۔ بس آپ اپنے حوصلے کو تھام کر رکھیں۔ آئندہ پیشی پر صورت حال خاصی مختلف نظر آئے گی۔''

''بیگ صاحب! ایک خوشی کی خبر ہے۔'' عبدالرؤف نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے میرے ذمے جو کام لگایا تھا وہ ہو گیا۔'' بات ختم کرتے ہی وہ مجھے مذکورہ کام کی تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔

میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''رؤف صاحب! آپ ایک سچے سماجی کارکن ہیں۔ مجھے یقین ہے آپ بہت ترقی کریں گے۔''

وہ عاجزی سے بولا۔ ''بیگ صاحب! بس کیا کروں، مجھے اپنے بزنس سے زیادہ فرصت نہیں ملتی ورنہ جی تو چاہتا ہے اپنے شب و روز کو خدمتِ خلق کے لئے وقف کر دوں۔''

''آپ جتنا کر رہے ہیں وہ بھی بہت ہے۔'' میں نے کہا پھر فوزیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''یہ بہت ہی گھبرائی ہوئی ہیں۔ آپ کا تو اکثر و بیشتر تھانے کچہری سے واسطہ پڑتا رہتا ہو گا۔ انہیں حوصلہ دیں کہ زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

فوزیہ نے ممنونیت بھری نظروں سے مجھے دیکھا تاہم خاموش ہی رہی۔
میں ان سے رخصت ہو کر دوسری عدالت کی جانب بڑھ گیا۔

❁ ❁ ❁

استغاثہ کی طرف سے نصف درجن سے زائد گواہوں کی فہرست عدالت میں پیش کی گئی تھی لیکن میں یہاں پر نہایت ہی اہم گواہوں کے بیانات اوران پر ہونے والی جرح کا احوال پیش کروں گا۔مخصوص صفحات کے کوٹے کو ذہن میں رکھنا پڑتا ہے۔"

جج نے عدالتی کارروائی شرع کی اورفردِ جرم پڑھ کر سنائی۔

ملزم نے صحتِ جرم سے صاف انکار کر دیا۔

اس کے بعد ملزم کا بیان ریکارڈ کیا گیا جو میری ہدایات اور مشوروں کا آئینہ دار تھا۔ بیان کی تکمیل پر وکیل استغاثہ نے ملزم پر بڑی کڑی جرح کی مگر میرا مؤکل نہایت ہی ہمت اور تحمل سے وکیلِ مخالف کے سوالات کے سامنے ڈٹا رہا۔اپنی باری پر میں نے ایک دوسرسری سوالات کے بعد جرح موقوف کر دی۔

جج نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے گواہوں کو پیش کرنے کا حکم جاری کیا۔اسی وقت میں بول اٹھا۔میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے معتدل لہجے میں کہا۔

"جنابِ عالی! اس سے پہلے کہ استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع کیا جائے، میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ پولیس کی طرف سے عدالت میں جو استغاثہ دائر کیا گیا ہے اس میں بعض باتیں خاصی اُلجھی ہوئی اور نامکمل نظر آتی ہیں۔"

تفتیشی افسر یا آئی۔او ہر پیشی پر عدالت میں موجود ہوتا ہے۔اس کیس کا انکوائری آفیسر ایک سب انسپکٹر تھا۔ میں نے عدالت سے جو درخواست کی تھی اس کی تکمیل یا شنوائی میں کسی قسم کی کوئی قباحت نہیں تھی لہٰذا جج کے اشارے پر مذکورہ سب انسپکٹر وٹنس باکس (گواہوں والے کٹہرے) میں آکر کھڑا ہو گیا۔

میں سبک خرامی سے چلتے ہوئے کٹہرے کے پاس پہنچا اور سب انسپکٹر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آئی۔او صاحب! کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟"

وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔"حمید شاہ!"

"کیا میں آپ کو صرف شاہ صاحب ــــــ یا شاہ جی کہہ کر مخاطب کر سکتا ہوں؟"

"اس میں کوئی حرج نہیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

میں نے سوال کیا۔ ’’شاہ جی! پولیس رپورٹ میں میرے مؤکل کو عیار اور چالاک شخص قرار دیا گیا ہے۔ کیا اس سلسلے میں آپ کا کوئی ذاتی تجربہ ہے؟‘‘

’’میں سمجھا نہیں۔‘‘ وہ اُلجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے آسان الفاظ میں سمجھانے کی کوشش کی۔ ’’میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کبھی آپ کے ساتھ ملزم نے کوئی عیاری یا چالاکی دکھانے کی کوشش کی؟‘‘

’’جی نہیں۔‘‘ وہ برہمی سے بولا۔ ’’مجھے ذاتی طور پر ایسا کوئی تجربہ نہیں ہوا۔‘‘

’’اس کے باوجود بھی آپ نے اپنی رپورٹ میں میرے بے گناہ مؤکل کو انتہائی موقع پرست، عیار اور چالاک شخص ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟‘‘

’’ملزم نے جو کارنامہ انجام دیا ہے اس سے اس کی چالاکی اور عیاری کو سمجھا جا سکتا ہے۔‘‘ وہ اُلجھن زدہ انداز میں بولا۔ ’’حالات و واقعات سے سب کچھ ظاہر ہو رہا ہے۔ اس کے لئے کسی ذاتی تجربے کی ضرورت نہیں۔‘‘

’’ہوں!‘‘ میں نے تیز نظر سے اسے گھورا اور جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

’’حمید شاہ صاحب! آپ نے حالات و واقعات کی بات کی ہے۔ استغاثہ کی رپورٹ اور حالات و واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جائے وقوعہ کے متعدد مقامات پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔ انہی فنگر پرنٹس کی بناء پر آپ نے میرے مؤکل کو ملزم گردانتے ہوئے گرفتار کیا ہے۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟‘‘

’’ایک حد تک آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔‘‘ وہ ڈپلومیٹک انداز میں بولا۔ ’’ملزم کی گرفتاری کی ایک بنیاد تو وہاں پائے جانے والے اس کے فنگر پرنٹس ہیں اور دوسری بڑی اور قوی وجہ اس کا مقتول سے اس کی زندگی میں آخری مرتبہ ملاقات کرنا ہے۔ جب وقوعہ کے روز ملزم، مقتول کے کمرے میں داخل ہوا تو اس وقت تک مصدقہ طور پر مقتول زندہ تھا۔ فیض احمد نامی دیرینہ ملازم سے باقاعدہ انٹرکام پر اس کی بات ہوئی تھی۔ ملزم کے وہاں سے رخصت ہو جانے کے بعد جب فیض احمد کو مقتول کے کمرے میں جانے کی ضرورت پیش آئی تو اس نے مقتول کو مُردہ حالت میں پایا۔ اس سے بڑے واضح انداز میں ثابت ہو رہا ہے کہ مقتول کے ساتھ جو بھی اندوہناک واقعہ پیش آیا اس میں سراسر ملزم کا ہاتھ ہے۔‘‘

انکوائری آفیسر نے اپنی بات ختم کر کے ستائش طلب نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا۔ میری نگاہ بھی وکیل مخالف کی جانب اٹھ گئی۔ اس وقت بڑے معنی خیز انداز میں زیرلب مسکرا رہا تھا۔

میں واپس تفتیشی افسر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''شاہ صاحب! آپ نے میرے مؤکل کو قاتل ٹھہرانے کے سلسلے میں اپنے بیان کے ایک حصے کو فیض احمد نامی شخص کے ساتھ منسلک کر دیا ہے۔ چلو، یہ بھی اچھا ہے۔ جب فیض احمد نامی یہ شریف آدمی استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے کٹہرے میں آ کر کھڑا ہو گا تو اس سے بھی سوال جواب ہو ہی جائیں گے۔ فی الحال ہم فنگر پرنٹس کی بات کرتے ہیں۔'' میں لحہ بھر کو سانس لینے کی غرض سے متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آپ نے بتایا ہے اور جیسا کہ استغاثہ کی رپورٹ میں بھی اس بات کا مفصل ذکر موجود ہے کہ جائے وقوعہ یعنی مقتول کے کمرے میں متعدد مقامات پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں، خصوصاً دروازے کے اندرونی اور بیرونی ہینڈل کو ہائی لائٹ کیا گیا ہے۔ آپ سے میرا صرف اتنا سا سوال ہے ـــــ'' میں نے ڈرامائی انداز میں لحاتی توقف کیا پھر کہا۔ ''کیا جائے وقوعہ پر میرے مؤکل کے علاوہ بھی کسی انسان کے فنگر پرنٹس پائے گئے ہیں؟''

یہ پیچیدہ، آسان سوال سن کر وہ گڑبڑا گیا پھر سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جی ـــــ جی ہاں ـــــ مقتول کے کمرے میں ملزم کے علاوہ دوسرے لوگوں کی انگلیوں کے نشانات بھی ملے ہیں۔''

''پھر آپ نے ان لوگوں میں سے کسی کو قاتل ڈکلیئر کیوں نہیں کر دیا؟'' میں نے خاصے جارحانہ انداز میں کہا۔ ''کیا آپ نے تمام افراد کے فنگر پرنٹس کو چیک کر کے متعلقہ افراد سے بھی پوچھ گچھ کی تھی یا ایک طے شدہ پروگرام کے تحت آپ کو صرف میرے مؤکل کے فنگر پرنٹس کی تلاش تھی تاکہ نہ ہینگ لگے اور نہ پھٹکری ـــــ اور رنگ بھی چوکھا چڑھ جائے۔''

میں نے آخری جملہ نہایت ہی معنی خیز اور طنزیہ انداز میں ادا کیا تھا۔ وٹنس باکس میں کھڑا تفتیشی افسر تلملا کر رہ گیا پھر تھوک نگلتے ہوئے اس نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''وکیل صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ ـــــ'' میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ اپنی برہمی کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''ہم نے متعدد فنگر پرنٹس میں سے آپ کے مؤکل کے فنگر پرنٹس کا انتخاب اس لئے کیا ہے کہ یہ سب کے اوپر پائے گئے تھے یعنی ان کے اوپر کسی اور کے فنگر پرنٹس نہیں ملے۔ خاص طور پر دروازے کا اندرونی اور بیرونی ہینڈل اس امر کا بین ثبوت ہے اور ـــــ اس کی وجہ بھی کوئی ڈھکی چھپی نہیں، مقتول کی زندگی میں ـــــ'' وہ لمحے بھر کو معنی خیز انداز میں متوقف ہوا پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔ ''مقتول کی زندگی

میں، اس کے کمرے میں جو آخری شخص داخل ہوا وہ یہی ـــــــ یہی شخص تھا ـــــــ ملزم مستقیم!'' بات ختم کرتے ہی اکیوزڈ باکس (ملزموں کے کٹہرے) میں کھڑے میرے مؤکل کی جانب اشارہ کیا۔

میں نے اس کی اداکاری کو نظر انداز کرتے ہوئے متحمل لہجے میں کہا۔ ''آئی۔او صاحب! جیسا کہ سننے میں اور بعض اوقات دیکھنے میں بھی آیا ہے کہ پولیس کی تفتیش کے آگے کسی کی پیش نہیں جاتی۔ پتھر بولنے پر اور ہاتھ خود کو چور چور کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور ـــــــ''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ قطع کلامی کے توسط سے تردیدی لہجے میں بولا۔ ''ہمارے بارے میں اس قسم کی ظالمانہ کارروائیاں مشہور کر دی گئی ہیں۔ ہم تفتیش کے سلسلے میں جرائم پیشہ افراد پر تھوڑی سختی ضرور کرتے ہیں لیکن ہم ویسے ظالم اور جلاد ہرگز نہیں ہیں جس طور ہمیں بدنام کیا جاتا ہے۔''

''آپ نے میری پوری بات سنی نہیں اور بولنا شروع کر دیا۔'' میں نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ''چلیں ہم مبینہ ظالمانہ کارروائیوں کی بجائے آپ کی مروجہ تفتیش کا ذکر کرتے ہیں۔ ملزم عدالتی ریمانڈ پر سات روز کے لئے آپ کی کسٹڈی میں رہا ہے۔ آپ نے اقبالِ جرم کروانے اور ڈکیتی کی رقم کا سراغ لگانے کے لئے اس پر اپنا ہر مروجہ تفتیشی حربہ آزمایا ہو گا لیکن حیرت کی بات ہے کہ میرے مؤکل نے اقرارِ جرم کیا اور نہ ہی پچاس ہزار روپے کے بارے میں آپ کو کچھ بتایا حالانکہ رقم کے سلسلے میں آپ نے اُسے ایک تگڑی آفر بھی کی تھی۔'' میں نے معنی خیز انداز میں اس کی آنکھوں میں جھانکا اور تھوڑے توقف کے بعد دہرایا۔ ''وہی ففٹی ففٹی والی آفر!''

مجھے اپنے مؤکل کی زبانی پتہ چلا تھا کہ پچاس ہزار کی رقم برآمد کروانے کے لئے پولیس والوں نے اسے ایک پیش کش کی تھی کہ اگر وہ انہیں بتا دے کہ اس نے پچاس ہزار روپے کہاں چھپائے ہیں تو اس رقم میں سے پچیس ہزار روپے خفیہ طور پر وہ اسے دے دیں گے۔ ابھی میں نے تفتیشی افسر سے اسی پیشکش کا ذکر کیا تھا۔ وہ میری بات سن کر بھڑک اٹھا اور خاصے ناگوار لہجے میں بلا۔

''ہم نے ملزم کو کسی قسم کی کوئی آفر نہیں کی تھی اور ـــــــ'' وہ خاصا جذباتی ہونے لگا۔ ''اور جہاں تک ہماری تفتیش اور ملزم کے اقبالِ جرم نہ کرنے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں تو ابھی ابتداء ہوئی ہے۔ استغاثہ ثابت کر دے گا کہ اسی شخص نے پچاس ہزار روپے کی خاطر اپنے مالک کو قتل کیا اور رقم سے بھرا ہوا بریف کیس لے کر جائے واردات سے فرار ہو گیا تھا۔'' بات

کے اختتام پر اس نے نفرت بھری نظر سے میرے مؤکل کی جانب دیکھا۔
میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''استغاثہ اور ڈیفنس جو کچھ بھی ثابت کریں گے وہ تو سامنے آ ہی جائے گا۔ فی الحال تو استغاثہ کی رپورٹ بڑی بے بسی سے یہ کہتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ـــــ ملزم نے آلۂ قتل کو کسی گٹر وغیرہ میں بہا دیا ہوگا اور مالِ مسروقہ کو بھی اس نے نہایت ہی خفیہ طریقے سے کہیں ٹھکانے لگا دیا ہے۔ کیونکہ اس کام کے لئے اسے اچھا خاصا وقت مل گیا تھا۔ وقت سے یاد آیا ـــــ''
میں نے اس انداز میں توقف کیا جیسے کوئی نہایت ہی اہم بات کرنے جا رہا ہوں۔ تفتیشی افسر اور وکیل استغاثہ نے بیک وقت چونک کر میری طرف دیکھا۔ دونوں کے چہرے اور آنکھوں میں اُلجھن واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
''ملزم لگ بھگ سوا سات بجے جائے وقوعہ سے رخصت ہوا تھا اور اس کی گرفتاری رات ساڑھے نو بجے عمل میں آئی تھی۔ اس حساب کتاب کی مدد سے واقعی اچھا خاصا وقت مل گیا تھا۔ کیا آپ نے ملزم سے یہ جاننے کی کوشش کی کہ اس نے مذکورہ وقت کہاں اور کیسے گزارا تھا؟''
''جی ہاں، معلوم کیا تھا۔'' تفتیشی افسر نے اثبات میں سر ہلایا۔
میں نے پوچھا۔ ''پھر اس نے کیا جواب دیا؟''
''ملزم نے ہمیں بتایا تھا کہ دفتر سے رخصت ہونے کے بعد وہ اپنے ایک دوست سے ملنے کسی ریسٹورنٹ میں چلا گیا تھا۔ عبدالغفور نامی اس کا وہ دوست مذکورہ ریسٹورنٹ میں بیرا گیری کرتا ہے۔'' تفتیشی افسر نے جواب دیا۔ ''ملزم کے مطابق وہ لگ بھگ پونے نو بجے اس ریسٹورنٹ سے روانہ ہوا تھا۔''
''آپ غالباً دیبال ریسٹورنٹ کا ذکر کر رہے ہیں؟''
''جی ہاں ـــــ میری مراد اسی ریسٹورنٹ سے ہے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔
میں نے پوچھا۔ ''آئی۔ او صاحب! کیا آپ نے ملزم کے کہے پر اعتبار کر لیا تھا یا اس سلسلے میں عبدالغفور سے بھی کوئی پوچھ تاچھ کی تھی؟''
''کمال ہے ـــــ ہم ملزم کی بات کا کیسے یقین کر لیتے؟'' وہ منہ بگاڑ کر بولا۔ ''اگر ایسا کرنے لگیں تو پھر ہوگئی تفتیش!'' وہ لحہ بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ملزم کے اس انکشاف پر ہم نے عبدالغفور کو تھانے بلا کر کڑی پوچھ گچھ کی تھی۔ اس نے ملزم کے بیان کی تصدیق کر دی۔ ہم نے اپنی تسلی کرنے کے بعد اسے چھوڑ دیا۔''
''جبکہ میرے خیال میں اگر آپ ایک سمجھ دار تفتیشی افسر ہوتے تو عبدالغفور کو ہرگز ہرگز

جانے نہ دیتے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔''اس شخص کو شامل تفتیش رکھ کر عدالت تک پہنچانا آپ کے لئے سودمند ثابت ہوسکتا تھا۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر برہمی کے تاثرات بڑے واضح نظر آ رہے تھے۔ شاید ''سمجھ دار تفتیشی افسر'' کے حوالے سے میرا تبصرہ اُسے پسند نہیں آیا تھا۔ بگڑے ہوئے لہجے میں اس نے مجھ سے استفسار کیا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا وکیل صاحب! آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

''میں اپنی طرف سے تو کچھ بھی نہیں کہنا چاہ رہا۔'' میں نے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔''بلکہ آپ کے کہے کو یاد دہانی کے طور پر استعمال کر رہا ہوں ـــــــ اگر آپ کی یادداشت اچھی ہے تو یقیناً آپ استغاثہ کی رپورٹ کے یہ الفاظ نہیں بھولے ہوں گے ـــــــ ملزم نے آلۂ قتل کو کسی گٹر میں بہا دیا ہوگا اور مالِ مسروقہ کو بھی اس نے نہایت ہی خفیہ طریقے سے کہیں ٹھکانے لگا دیا ہوگا کیونکہ اس کام کے لئے اسے اچھا خاصا وقت مل گیا تھا ـــــــ!''

میں نے تھوڑا توقف کر کے باری باری معنی خیز نظروں سے جج، وکیل استغاثہ اور آئی۔او کی طرف دیکھا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔''ملزم کو آپ کے بہ قول جو اچھا خاصا وقت مل گیا تھا وہ اس نے اپنے دوست عبدالغفور کے ساتھ خوش گپیوں میں گزار دیا اور دوسری طرف آپ ہی کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ اسی ''اچھے خاصے وقت'' میں ملزم نے آلۂ قتل یعنی سائلنسر لگے ریوالور اور لوٹی ہوئی رقم کو بھی ٹھکانے لگایا ہے۔ اگرچہ آپ کے دونوں دعووں میں گہرا تضاد پایا جاتا ہے لیکن پھر بھی اگر ایک منٹ کے لئے آپ کی بات کو سچا سمجھ لیا جائے تو پھر آپ کی باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ملزم نے اپنے دوست کے تعاون اور مہربانی سے مذکورہ بالا دونوں عظیم کام سرانجام دیئے ہوں گے لہٰذا اس صورت میں عبدالغفور نامی اس شخص کو آلۂ قتل اور لوٹے ہوئے کرنسی نوٹوں کی بازیابی سے پہلے چھوڑ دینے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ آپ اس سلسلے میں کچھ کہنا پسند فرمائیں گے آئی۔او صاحب؟''

''جی ضرور کہنا پسند فرماؤں گا!'' وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔''اور یہ کہنا چاہوں گا کہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے وکیل صاحب کہ آپ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں نہیں ہیں ورنہ پتہ نہیں کتنے بے چاروں کا کباڑا اب تک ہو چکا ہوتا؟''

''اس لاکھ لاکھ شکر ادا کرنے پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔''اللہ کا کرم اور میری خوش قسمتی ہے کہ میں آپ کے محکمے سے وابستہ نہیں ہوں انکوائری آفیسر حمید شاہ صاحب!''

اس کی سمجھ بوجھ پتہ نہیں، میری بات کی گہرائی کو ناپ سکی کہ نہیں البتہ وہ معاندانہ نظر سے مجھے گھور کر رہ گیا۔ اس گھورنے میں ناپسندیدگی اور ناگواری بہ درجہ اتم موجود تھی۔ میں نے اس کی بے ہودہ نگاہ کو توجہ کے قابل نہ سمجھا اور جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے سوال کیا۔

''آئی۔او صاحب! آپ کو اس واقعے کی اطلاع کتنے بجے دی گئی تھی؟''

''لگ بھگ آٹھ بجے رات۔'' اس نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''اور یہ اطلاع آپ کو کس نے دی تھی؟''

''مقتول کے دیرینہ ملازم فیض احمد نے تھانے فون کیا تھا۔''

''اور آپ جائے وقوعہ پر کب پہنچے تھے؟''

''ساڑھے آٹھ بجے۔''

''او۔کے!'' میں نے سرسری انداز میں کہا اور جرح کا سلسلہ موقوف کر دیا۔

استغاثہ کی کمزوریوں اور خامیوں کے حوالے سے جو باتیں میرے ذہن میں کھٹک رہی تھیں، میں انہیں بڑی خوبصورتی سے عدالت کے ریکارڈ پر لے آنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس جرح کے دوران میں بلاتوقف جج کے چہرے کے تاثرات کو بھی نوٹ کرتا رہا تھا۔ جج نے گہری دلچسپی سے اس کارروائی کو دیکھا اور سنا۔ علاوہ ازیں وہ مناسب موقع پر، اپنے سامنے میز پر رکھے ہوئے کاغذات میں وقفے وقفے سے اہم پوائنٹس بھی نوٹ کرتا رہا تھا گویا میں نے کافی حد تک اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔

اتنا وقت باقی نہیں بچا تھا کہ کسی اور گواہ کو کٹہرے میں بلایا جاتا۔ لہٰذا جج نے آئندہ پیشی کے لئے تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ اِز ایڈجرنڈ!''

آئندہ پیشی دس روز بعد کی تھی۔

❁ ❁ ❁

اس پیشی پر کوئی قابلِ ذکر کارروائی نہ ہو سکی۔ استغاثہ کی جانب سے تین گواہوں کو یکے بعد دیگرے پیش کر کے استغاثہ کو مضبوط اور میرے مؤکل کو کمزور کرنے کی جزوی کوشش کی گئی۔ اس عدالتی کارروائی میں کوئی ایسی قابلِ بیان بات نہیں جسے تحریر کر کے میں قارئین کے صبر کو آزماؤں۔ لہٰذا ہم ـــــــ یعنی میرے ساتھ ساتھ آپ بھی خاموشی سے آگے بڑھتے ہیں۔

اگلی پیشی پر استغاثہ کا ایک اور اہم گواہ اور ''اے۔این۔اے'' ٹریڈنگ کمپنی کا دیرینہ ملازم فیض احمد کٹہرے میں موجود تھا۔ وکیل استغاثہ جب اپنے پتے کھیل چکا تو میں جرح کے لئے

گواہ والے کٹہرے کے قریب چلا گیا۔ استغاثہ کے اس گواہ سے میری بہت ساری امیدیں وابستہ تھیں۔ میں نے سماجی کارکن عبدالرؤف کے تعاون سے جو سنسنی خیز معلومات اکٹھا کی تھیں ان میں فیض احمد کے حوالے سے بھی چند اہم اور برننگ پوائنٹس شامل تھے۔ مجھے اس گواہ کی گواہی کا شدت سے انتظار تھا۔

فیض احمد کی عمر لگ بھگ پچاس سال رہی ہوگی۔ جسم قدرے مائل بہ فربہی۔ رنگ سانولا اور آنکھوں پر نظر کا چشمہ۔ وہ اپنے چہرے مہرے سے ایک سمجھ دار اور بردبار شخص دکھائی دیتا تھا۔ نگاہوں سے جھلکتی ذہانت اور سنجیدگی میں ایک خاص قسم کی تمکنت پائی جاتی تھی جو صرف دیکھنے والی آنکھ ہی کو محسوس ہوسکتی تھی۔ فیض احمد نے ہلکے نیلے رنگ کا شلوار سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''فیض صاحب! آپ کو اے۔ این۔ اے ٹریڈنگ کمپنی میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''کم و بیش بیس سال۔'' اس نے جواب دیا۔

''ماشاء اللہ! یہ اچھی خاصی مدت ہے۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''اگر کوئی شخص اتنے طویل عرصے کے لئے کسی ایک جگہ پر ٹک کر کام کرتا رہے تو اس کا بڑا واضح مطلب یہی ہوتا ہے کہ کمپنی والے اس کی کارکردگی سے مطمئن ہیں، ان پر بھروسہ کرتے ہیں اور وہ خود بھی وہاں کام کر کے بہت خوش ہے۔'' میں نے لمحہ بھر کو توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پتہ چلا ہے، مقتول آپ پر اندھا اعتماد کرتا تھا۔ کمپنی کے ظاہری اور خفیہ معاملات سے آپ کو پوری آگاہی تھی۔ آپ نے کوئی خاص تعلیم حاصل نہیں کی۔ (میں نے اس کے اَن پڑھ ہونے کو خوب صورت الفاظ کا جامہ پہنا دیا تھا) اس کے باوجود بھی مقتول کمپنی کے انتہائی اہم اور سنجیدہ معاملات میں آپ سے ضرور مشورہ کرتا تھا۔ اس کی نظر میں آپ ایک صائب الرائے شخص تھے۔ دفتر کا تمام تر اسٹاف مقتول کے بعد آپ کو کمپنی کی سب سے اہم شخصیت تصور کرتا تھا۔ کیا آپ مجھ سے اتفاق کرتے ہیں؟''

اگر وہ مجھ سے اتفاق کرتا تو ایک طرح سے یہ اس کے لئے نادیدہ جال میں قدم رکھنے کے مترادف ہوتا۔ اس نے ایک لمحہ بھی غور و فکر نہیں کیا اور بڑے وثوق سے بولا۔

''آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں یہ ان کا بڑا پن تھا کہ مجھے اس قدر قابلِ بھروسہ سمجھتے تھے۔ میں واقعی کمپنی کے ہر قسم کے معاملات سے بخوبی واقف ہوں۔''

''تھینک یو فیض صاحب!'' میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔

''ملزم اس کمپنی میں کب سے کام کر رہا تھا؟''

''اسے ہمارے ہاں کام کرتے ہوئے پانچ، سوا پانچ سال ہو گئے ہیں۔''

''کیا اس دوران اس نے کمپنی میں کسی قسم کی کوئی چھوٹی یا بڑی چوری کی؟''

''نہیں جناب! ایسا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔''

''کسی شخص سے اس کا شدید نوعیت کا جھگڑا ہوا ہو؟'' میں نے تیز نظر سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''اتنا شدید کہ نوبت مار پیٹ تک پہنچ گئی ہو؟''

''مجھے نہیں یاد پڑتا کہ کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہو ——'' اس نے معتدل لہجے میں جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے ملزم بنیادی طور پر امن پسند اور صلح جو شخص ہے؟''

''ہاں، ایسا کہہ سکتے ہیں۔'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ''لیکن اشفاق صاحب کے قتل کا جو واقعہ پیش آیا ہے اس نے تو صورتِ حال ہی کو بدل کر رکھ دیا ہے۔''

میں نے اس کے آخری جملے پر زیادہ توجہ نہیں دی اور سوالات کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''فیض صاحب! وقوعہ والا دن تو آپ کو اچھی طرح یاد ہوگا، خاص طور پر شام کا وہ وقت جب ملزم مقتول کو لینے کے لئے دفتر پہنچا تھا؟''

''جی ہاں، وہ تمام واقعات کسی دستاویزی فلم کی مانند میرے ذہن میں تازہ ہیں۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''یہ بہت ہی اچھی بات ہے۔'' میں نے ذو معنی انداز میں کہا پھر کٹہرے میں کھڑے استغاثہ کے گواہ فیض احمد سے استفسار کیا۔ ''اس روز لگ بھگ سات بجے شام ملزم دفتر پہنچا، میرے مؤکل کے مطابق اس وقت سات بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ اس وقت تک دفتر کا سارا عملہ چھٹی کر کے گھر جا چکا تھا، صرف آپ ہی دفتر میں موجود تھے یا پھر مقتول اپنے کمرے میں بیٹھا کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ ملزم نے آپ کو بتایا کہ وہ ٹھیک سات بجے مقتول کو لے کر گھر جائے گا۔ آپ نے ملزم سے کہا کہ صاحب کو کسی دوست کا انتظار ہے۔ وہ جب تک اپنے دوست سے ملاقات نہیں کر لیں گے، دفتر سے نہیں اٹھیں گے۔ اس پر ملزم نے بلاوے کے اس فون کا تذکرہ کیا جو مقتول نے اپنی بیوی الماس کو کیا تھا۔ آپ نے ایسے کسی فون سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس پر ملزم اُلجھن کا شکار ہونے لگا تو آپ نے انٹرکام پر مقتول سے اس کی بات کروا دی جس کے نتیجے میں مقتول نے ملزم کو اپنے کمرے میں بلا لیا تھا۔ یہاں تک اگر میں نے کوئی غلط بات کہی ہو تو آپ مجھے ٹوک دیں!''

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بڑے اعتماد سے بولا۔ ”وکیل صاحب! آپ نے حالات و واقعات کی جو ترتیب بیان کی ہے بالکل ویسے ہی پیش آیا تھا۔“

”یہاں تک تو سب ٹھیک ہے۔“ میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس کے بعد مقتول کے کمرے میں جو کچھ ہوا اس پر ڈیفنس اور استغاثہ کے درمیان شدید اختلاف ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ مقتول نے ملزم سے اپنی خفگی کا اظہار کیا تھا۔ جب اس نے آنے سے منع کر دیا تھا تو وہ اسے لینے کے لئے کیوں پہنچ گیا؟ ملزم نے بیگم صاحبہ کا حوالہ دے کر اپنی پوزیشن صاف کرنا چاہی۔ اس پر مقتول نے اپنی بیگم کے لئے یہ الفاظ استعمال کئے ـــــ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میری نگرانی کے مختلف طریقے اپناتی رہتی ہے۔ میں نے صبح اس پر واضح کر دیا تھا کہ ایک ضروری میٹنگ کی وجہ سے آج مجھے دفتر میں دیر ہو جائے گی اس کے باوجود بھی اس نے تمہیں چھاپہ مارنے کے لئے یہاں بھیج دیا۔ کیا الماس نے تمہیں میری جاسوسی کا کام سونپ دیا ہے؟“

میں نے لحاتی توقف کیا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میرے مؤکل نے کسی طرح مقتول کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور معذرت کرتے ہوئے اس کے کمرے سے نکل آیا مگر استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ ملزم نے سائلنسر لگے ریوالور سے مقتول کے سینے میں دو گولیاں اتار کر اس کا کام تمام کیا اور رقم والا بریف کیس اٹھا کر وہاں سے چلتا بنا۔ اس اختلافی صورتِ حال کی روشنی میں، میرا آپ سے صرف اتنا سا سوال ہے فیض صاحب!“ میں نے سچویشن کو پُرتاثر بنانے کے لئے تھوڑا وقفہ دیا، پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں استغاثہ کے گواہ سے سوال کیا۔

”فیض صاحب! اچھی طرح سوچ کر بتائیں، جب ملزم مقتول کے کمرے سے برآمد ہوا تو اس کے ہاتھ میں کوئی بریف کیس تھا؟“

”آں، ہاں ـــــ نن ـــــ نہیں۔“ وہ بری طرح گڑبڑا کر رہ گیا پھر قدرے سنبھل کر بولا۔ ”وہ دراصل بات یہ ہے کہ میں نے غور نہیں کیا تھا اس لئے وثوق سے اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”آپ بھی عجیب بات کر رہے ہیں فیض صاحب! ایک ناقابل یقین سی بات۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”بریف کیس اچھا خاصا حجم رکھتا ہے۔ وہ کوئی جیبی قلم یا دستی گھڑی نہیں ہوتی کہ آپ کو اس پر غور کرنے کا موقع نہ ملا ہو اور خاص طور پر اس صورت میں کہ ملزم نے مقتول کے کمرے سے نکلنے کے بعد آپ کی میز کا رخ کیا تھا اور گاڑی کی چابیاں آپ کے سپرد کرتے

ہوئے کہا تھا کہ صاحب نے اسے چھٹی دے دی ہے۔'' میں نے چند سیکنڈ کا توقف کیا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت دفتر میں، آپ دونوں کے سوا عملے کا کوئی فرد موجود نہیں تھا لہٰذا اس بات میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ آپ نے لامحالہ ملزم کو دفتر سے رخصت ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا۔ اگر میرے مؤکل نے کوئی بریف کیس اٹھا رکھا تھا تو یہ ممکن نہیں تھا، آپ کی نظر سے پوشیدہ رہتا۔''

وہ میرے اس سنسناتے ہوئے استفسار پر بوکھلا کر رہ گیا پھر امداد طلب نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگا۔ وکیل استغاثہ اپنے گواہ کو منجدھار میں گھرا دیکھ کر فوراً مدد کو لپکا۔

''یور آنر! مجھے سخت اعتراض ہے۔'' وکیل استغاثہ نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے فاضل دوست استغاثہ کے معزز گواہ کو خواہ مخواہ ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب کہ گواہ بڑے واضح الفاظ میں بتا چکا ہے کہ اس نے ملزم پر توجہ نہیں دی تھی اس لئے بریف کیس کے حوالے سے وہ وکیل صفائی کے سوال کا جواب دینے سے قاصر ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ملزم بریف کیس کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوا تھا۔''

میں نے طنزیہ لہجے میں بہ آواز بلند کہا۔ ''اللہ کا شکر ہے کہ آپ تو جواب دینے سے قاصر نہیں ـــــــ'' میرا اشارہ سیدھا سیدھا وکیل استغاثہ کی طرف تھا۔ میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔ ''یور آنر! معترض وکیل استغاثہ، بریف کیس کے ساتھ ملزم کی جائے وقوعہ سے رخصتی کو اتنے وثوق سے بیان کر رہے ہیں جیسے وہ بذاتِ خود وہاں موجود تھے۔''

جج نے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

''جناب! ظاہر ہے، میں جائے واردات پر تو موجود نہیں تھا۔'' اس نے متاملانہ انداز میں کہا۔ ''لیکن حالات کا تجزیہ کرنے کے لئے عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی بھی سمجھ دار آدمی ان حالات و واقعات سے واقف ہوگا تو اسی نتیجے پر پہنچے گا جو میں نے بیان کیا ہے۔''

میں نے سرسری مگر چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔ ''مجھے یہ سن کر از حد خوشی ہوئی کہ میرے فاضل دوست ایک عقل مند انسان ہیں۔ بہرحال ـــــــ'' میں معنی خیز انداز میں بات ادھوری چھوڑ کر استغاثہ کے گواہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''فیض صاحب! چلیں، میں آپ کی بات کا یقین کر لیتا ہوں کہ آپ نے غور نہیں فرمایا کہ وقوعہ کے روز ملزم جائے واردات سے بریف کیس کے ساتھ رخصت ہوا تھا یا خالی ہاتھ۔ لیکن اب میں آپ سے جو سوالات کرنے والا ہوں ان کا بہت سمجھ کر اور ٹھیک ٹھیک جواب دینا ہوگا۔

''غور نہیں کیا تھا'' والا معاملہ استعمال نہیں ہو گا فیض صاحب!''

وہ اُلجھن زدہ مگر خاموش نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ میں عبدالرؤف کی کڑی محنت کے نتیجے میں حاصل ہونے والی معلومات کو کام میں لاؤں۔ استغاثہ کے گواہوں سے ''سوال و جواب'' بہت کھیل لیا تھا۔ اب پانسہ پلٹنے کا موقع تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں موجود خیالات کو ایک جگہ مجتمع کیا اور ذرا مختلف زاویے سے فیض احمد کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''فیض صاحب!'' میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں گواہ کو مخاطب کیا۔ ''وقوعہ کے روز مقتول دفتر میں بیٹھا اپنے کسی دوست کا انتظار کر رہا تھا جس سے وہ کوئی نہایت ہی اہم میٹنگ کرنے والا تھا۔ یہ میٹنگ طویل بھی ہو سکتی تھی اسی سبب اس نے ملزم کو بڑے واضح الفاظ میں منع کر دیا تھا کہ وہ اسے لینے کے لئے دفتر نہ آئے۔ آپ سے میں صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ وقوعہ کے روز مقتول اپنے کس دوست کا انتظار کر رہا تھا؟''

ان لمحات میں وہ مجھے خاصی مشکل میں دکھائی دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرے سوال نے اسے کڑی آزمائش میں ڈال دیا ہو۔ وہ متذبذب نظر آیا تو میں نے اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں یہ اضافہ بھی کر دیا۔

''فیض صاحب! آپ مقتول اور اس کے دفتر کے داخلی اور خارجی امور سے پوری طرح آگاہ ——— بلکہ ان میں آپ کا غالب عمل دخل بھی ہے لہٰذا یہ سوچنا کہ آپ کو نہیں معلوم تھا کہ وقوعہ کے روز مقتول سے کون ملنے کے لئے آنے والا تھا، ایک احمقانہ خیال ہو گا۔ مجھے یقین ہے، آپ اس شخصیت سے اچھی طرح واقف ہیں جو اس روز وہاں آنے والی تھی۔ کیا آپ معزز عدالت کو اس شخصیت کے بارے میں کچھ بتائیں گے؟''

وہ خاصا مضطرب اور متذبذب نظر آنے لگا۔ میرے سوال نے اُسے ''نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن'' جیسی صورتِ حال سے دوچار کر دیا تھا۔ اس موقع پر ایک مرتبہ پھر وکیل استغاثہ نے اپنی موجودگی کا یقین دلاتے ہوئے حقِ استغاثہ ادا کرنے کی پوری کوشش کی۔

''آبجیکشن یور آنر!'' اس نے چیخ سے مشابہ احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''وکیل صفائی غیر متعلقہ موضوعات کو زیرِ بحث لا کر معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں ایسی حرکت سے سختی سے روکا جائے۔''

میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''جنابِ اعلیٰ! میں نے ''ملاقاتی شخصیت'' کے حوالے سے انتہائی متعلق اور بروقت سوال کیا ہے کیونکہ میں اپنے ذرائع سے اس شخصیت کے بارے میں خاصی معلومات حاصل کر چکا ہوں۔ مذکورہ شخصیت اس کیس سے، ایک خاص زاویے سے جڑی ہوئی

ہے اس لئے اسے غیر متعلق کہنا مناسب نہیں ہوگا۔ اگر ضرورت پیش آئی تو میں اس شخصیت کو گواہی کے لئے عدالت تک لانے کی زحمت بھی دے سکتا ہوں۔ کیونکہ وہ بہرحال، مقتول سے گہری ہمدردی رکھتا تھا۔''

''اگر آپ کو اتنا سب کچھ معلوم ہے تو پھر آپ خود ہی اس پراسرار شخصیت کی نقاب کشائی کر دیں۔'' وکیل استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''خواہ مخواہ استغاثہ کے گواہ کو کیوں پریشان کر رہے ہیں؟''

میں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہوئے کہا۔ ''استغاثہ کے گواہ فیض احمد کو میں نے نہیں بلکہ آپ نے پریشانی میں ڈالنے کے لئے اس عدالت تک پہنچایا ہے ورنہ اس کیس کے بارے میں بھلا آپ سے زیادہ کون جانتا ہے، سب کچھ آپ ہی یہاں تشریف لا کر بیان فرما دیتے!'' میرے لہجے میں وکیل استغاثہ کے لئے حد درجہ کڑواہٹ بھری ہوئی تھی، اسی انداز کو آگے بڑھاتے ہوئے میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

''استغاثہ کا گواہ فیض احمد شہادت کے لئے گواہوں والے کٹہرے میں اگر آن کر کھڑا ہو ہی گیا ہے تو اسے میرے سوال کا جواب بھی دینا ہوگا ـــــ اور میرا خیال ہے مجھے یہ سوال دہرانے کی ضرورت تو نہیں!''

جج نے جب دیکھا کہ میں اور وکیل استغاثہ آپس میں اُلجھ پڑے ہیں تو اس نے استغاثہ کے گواہ سے مخاطب ہوتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''مسٹر فیض! آپ وکیل صفائی کے سوال کا جواب دیں۔''

فرار کی کوئی راہ نہ پا کر اس نے جزبز ہوتے ہوئے کہا۔ ''طیب نادری!''

''طیب نادری۔'' میں نے انجان بنتے ہوئے تفریح لینے والے انداز میں کہا۔ ''غالباً آپ حکیم طیب نادری کی بات کر رہے ہیں؟''

''جی ہاں ـــــ جی ہاں ـــــ وہی حکیم صاحب ـــــ'' وہ بے ساختہ بول اٹھا۔

''حکیم نادری صاحب ایک مستند معالج ہیں۔ خاص طور پر امراضِ پوشیدہ و پیچیدہ کا بڑا کامل اور شافی علاج کرتے ہیں۔'' میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ''پچھلے کچھ عرصے سے مقتول بھی ان کے زیر علاج تھا اور وہ اپنے مریض کے لئے ایک خاص الخاص نسخہ بھی تیار کرنے والے تھے جس میں مگرمچھ کے پھیپھڑے اور افریقی گوریلے کی چربی بھی استعمال ہوتی ہے۔ یہ دونوں نایاب اور قیمتی اشیاء منگوانے کے لئے مقتول نے حکیم صاحب کو پچاس ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ وقوعہ کے روز مقتول یہی پچاس ہزار روپے بریف کیس میں بند کئے اپنے محسن

مسیحا حکیم طیب نادری کی آمد کا منتظر تھا کہ نہ رہا بانس اور نہ ہی بج سکی بانسری۔ کسی شقی القلب شخص نے دو مہلک اور بے آواز گولیاں مقتول کے سینے میں اتار کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا کر دیا اور ـــــ پچاس ہزار روپے والا بریف کیس لے کر چلتا بنا۔ استغاثہ اس سفاک کارنامے کو میرے موکل سے منسوب کر رہا ہے جبکہ حقیقت اس سے قطعی مختلف ہے۔ خیر۔'' میں نے لمحے بھر کو توقف کیا اور اضافہ کرتے ہوئے گواہ سے پوچھا۔ ''آپ تو مجھے صرف اتنا بتائیں کہ میں نے حکیم صاحب اور مقتول کے خفیہ علاج کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس میں کچھ غلط تو نہیں؟''

''نہیں جناب ـــــ!'' اس نے تھوڑے پس و پیش کے بعد بالآخر میری بات کی تصدیق کر دی۔ ''آپ نے کچھ بھی غلط نہیں کہا۔ مجھے مر کر اپنی قبر میں جانا ہے اس لئے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اشفاق صاحب اس نوعیت کے علاج کے لئے مجبور تھے۔ لگتا ہے آپ نے حکیم صاحب سے ذاتی طور پر ملاقات کر کے یہ ساری معلومات جمع کی ہیں!''

میں نے اس کے مؤخر الذکر جملے پر کوئی توجہ نہ دی اور مقتول کے حوالے سے ایک اور ردا چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، فیض صاحب! آپ نے بالکل سچ کہا ہے۔ مجبوری انسان سے بہت کچھ کروا دیتی ہے اور اپنے کسی خاص مرض کا علاج کروانا تو عین کارِ ثواب بھی ہے۔ خاص طور پر جب کوئی انسان بڑھاپے میں کسی جوان انسان کو شریکِ حیات بنا بیٹھے تو یہ مجبوری اور ضرورت کچھ زیادہ ہی خوف ناک انداز میں سامنے کھڑے ہو کر تقاضا کرنے لگتی ہے۔ بہرحال ـــــ'' میں نے ایک گہری سانس چھوڑی اور کہا۔ ''آپ یہ بتائیں کہ آیا حکیم صاحب وقوعہ کے روز مقتول سے ملاقات کے لئے دفتر پہنچے تھے یا نہیں؟''

سماجی کارکن عبدالرؤف بہت ہی چلتا پرزہ قسم کا آدمی تھا۔ سماجی سرگرمیوں میں ملوث افراد کے سماج کے اندر بہت دور تک تعلقات ہوتے ہیں۔ رؤف نے اپنے ذرائع استعمال کر کے یہ معلوم کر لیا تھا کہ مقتول اور حکیم طیب نادری میں ایک خاص حوالے سے ان دنوں خفیہ ملاقاتیں ہو رہی تھیں۔ قبلہ حکیم صاحب پوشیدہ و پیچیدہ امراض کے علاج میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کی شہرت کسی تعارف کی محتاج نہیں تھی تاہم مزید تصدیق کے لئے رؤف ایک رات حکیم صاحب سے جا کر مل بھی لیا تھا اور حکیم صاحب نے اس سلسلے میں اسے پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا تھا۔ اگر مقتول کو وہ جان لیوا حادثہ پیش نہ آیا ہوتا تو شاید حکیم صاحب ''رازداری'' کے تقاضے نبھاتے ہوئے زبان نہ کھولتے لیکن مقتول کی موت کے بعد حکیم صاحب بھی چاہتے تھے کہ جلد از جلد مقتول کا قاتل قانون کی گرفت میں آ جائے لہٰذا وہ سماجی کارکن عبدالرؤف سے بھرپور تعاون

کرنے پر آمادہ تھے اور ان کا یہ کارآمد تعاون رؤف کے توسط سے مجھ تک پہنچ گیا تھا بلکہ اس سلسلے میں مجھے گواہ کا جواب بھی معلوم تھا!

گواہ فیض احمد نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''اُس روز حکیم صاحب، اشفاق صاحب سے ملنے نہیں آسکے تھے بلکہ ساڑھے سات بجے ان کا فون آ گیا۔ انہیں ایمرجنسی میں کہیں جانا پڑ گیا تھا اس لئے وہ دفتر پہنچنے سے قاصر تھے۔ میں نے وہ فون کال اشفاق صاحب کو دے دی تھی۔''

''یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ساڑھے سات بجے حکیم طیب نادری اور مقتول کے درمیان مختصر ٹیلی فونک گفتگو ہوئی تھی؟''

''جی ـــــ جی ہاں ـــــ'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

اگلے ہی لمحے وہ پریشان نظر سے مجھے تکنے لگا۔ اس کے تاثرات سے یہ اندازہ ہوتا تھا جیسے اسے کچھ غلط کہہ دینے کا احساس ہو رہا ہو ـــــ کیا غلط؟ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی مگر میں اس موقع پر کوئی غلطی کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ حکیم نادری کی ''شفا'' کے سبب ایک نادر موقع میرے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس سے فوری فائدہ نہ اٹھانا حماقتِ عظیم کے مترادف ہوتا۔

میں نے خاصے پُرجوش انداز میں اپنی فائلوں پر ہاتھ مارا اور باآواز بلند کہا۔ ''دی پوائنٹ اِز ٹو بی نوٹیڈ یور آنر!''

وکیل استغاثہ نے چونک کر جج کی طرف دیکھا۔ یقیناً میرا پوائنٹ اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا۔ جج بھی ایک لمحے کے لئے مجھے متذبذب نظر آیا، مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے اس نے کہا۔

''بیگ صاحب! آپ جس پوائنٹ کو عدالت کے ریکارڈ پر لانا چاہتے ہیں ذرا اس کی وضاحت کر دیں۔''

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور نہایت ہی مستحکم لہجے میں کہا۔ ''استغاثہ کی رپورٹ، گواہ فیض احمد کے بیان اور حالات و واقعات کی روشنی میں یہ بات تصدیق شدہ ہے کہ میرا مؤکل وقوعہ کے روز ٹھیک سوا سات بجے گاڑی کی چابیاں فیض احمد کے حوالے کر کے دفتر سے نکل گیا تھا۔ ابھی ابھی استغاثہ کے گواہ فیض احمد نے معزز عدالت کے روبرو اس بات کا اقرار کیا ہے کہ حکیم طیب نادری کی کال ساڑھے سات بجے آئی تھی اور گواہ نے وہ کال مقتول کے ایماء پر اسے تھرو کر دی تھی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ساڑھے سات بجے مقتول نے حکیم صاحب سے

مختصر ٹیلی فونک گفتگو کی تھی۔ گفتگو ٹیلی فونک ہو، سیلولر ہو یا پھر بالمشافہ، اس کے لئے گفتگو کرنے والوں کا زندہ ہونا بہت ضروری ہے۔ اس کا مطلب ہے، میرے مؤکل کے جائے واردات سے رخصت ہونے کے پندرہ منٹ بعد بھی مقتول اپنے دفتر میں زندہ سلامت بیٹھا تھا۔ لہٰذا میں بڑے زور و شور سے یہ کہنا چاہوں گا کہ میرا مؤکل بے گناہ ہے۔ اسے ایک سوچی سمجھی اور خطرناک سازش کے تحت اس کیس میں ملوث کیا گیا ہے۔ معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ وہ میرے مؤکل کو باعزت بری کرے، اس کیس کے اصل مجرم کو قانون کی گرفت میں لانے کے لئے استغاثہ پر زور ڈالے۔''

میرے ان سنسنی خیز الفاظ سے سناٹا چھا گیا۔ جج نے میز پر رکھے پین ہولڈر سے ایک قلم نکالا اور اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ کرنے لگا۔ گویا وہ ''پوائنٹ از ٹو بی نوٹیڈ'' کو عملی صورت میں ڈھال رہا تھا۔ چند لمحات تک عدالت کے کمرے میں سکوت کا سا عالم رہا پھر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ حاضرین عدالت کی سرگوشیاں بڑھنے لگیں تو مجبوراً جج کو ''آرڈر، آرڈر پلیز!'' کا ہتھیار استعمال کرنا پڑا۔ اگلے ہی لمحے ماحول میں ایک گمبھیر خاموشی سرایت کر گئی۔

جج نے نگاہ اٹھا کر دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''بیگ صاحب! عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں صرف پندرہ منٹ باقی ہیں۔ آپ استغاثہ کے گواہ مسٹر فیض احمد سے کچھ اور پوچھنا پسند کریں گے؟''

''بس ایک آخری انکشاف جنابِ عالی!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں گواہ سے ایک دو سوال کر کے اسے فارغ کر دوں گا اور مجھے یقین ہے، گواہ کے جواب بڑے انکشاف انگیز ہوں گے۔''

جج نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے مجھے اجازت مرحمت فرما دی۔ ''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔''

میں نے وٹنس باکس میں کھڑے استغاثہ کے گواہ فیض احمد سے پوچھا۔ ''فیض صاحب! استغاثہ کی رپورٹ میں اس بات کا ذکر ہے کہ وقوعہ کے روز ملزم سوا سات بجے دفتر سے رخصت ہو گیا تو آپ کو کسی کام کی غرض سے مقتول کے کمرے میں جانے کی ضرورت پیش آ گئی تھی اور اسی وقت آپ کو پتہ چلا کہ آپ کا باس دارِ فانی سے رخصت ہو چکا ہے۔'' میں نے لمحاتی وقفہ کیا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے مطابق ساڑھے سات بجے حکیم صاحب اور مقتول کے درمیان ٹیلی فونک رابطہ ہوا۔ یقیناً آپ کو ساڑھے سات بجے کے بعد ہی مقتول کے کمرے میں جانے کی ضرورت پیش آئی ہو گی۔ کیا آپ بھری عدالت کو بتائیں گے کہ آپ

حکیم صاحب کے فون کے کتنی دیر بعد مقتول کے کمرے میں گئے تھے اور کون سی ضرورت آپ کو اندر لے گئی تھی؟''

''آپ کے پہلے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ حکیم صاحب کے فون کے فوراً بعد ہی مجھے مقتول کے کمرے میں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔'' استغاثہ کے گواہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''دوسرے سوال کے جواب میں، میں یہ کہوں گا کہ کوریئر کمپنی کے ایک نمائندے نے مجھے کمرے میں جا کر اشفاق صاحب کی خبر لینے کو کہا تھا۔''

''کوریئر کمپنی ــــــ!'' میں نے عجیب سے لہجے میں دہرایا۔ ''یہ کوریئر والے اس کیس میں کہاں سے ٹپک پڑے فیض صاحب؟''

میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے فیض احمد نے ٹھہرے ہوئے انداز میں بتایا کہ جیسے ہی حکیم صاحب کی کال ختم ہوئی، ہائی ولاسٹی کوریئر کمپنی کا ایک نمائندہ ایک بڑا سا پیکٹ لے کر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے فیض احمد کو بتایا کہ وہ مقتول کے لئے ایک پیکٹ لے کر آیا ہے۔ فیض نے کہا کہ وہ پیکٹ ریسیو کر لیتا ہے لیکن کوریئر کمپنی کا نمائندہ اس بات پر مصر رہا کہ وہ پیکٹ نہایت ہی قیمتی اور اہم ہے۔ وہ یہ پیکٹ اسی شخص کے حوالے کرے گا جس کے نام سے آیا ہے۔ اگر اشفاق علی صاحب اس وقت دفتر میں موجود نہیں ہیں تو کوئی بات نہیں، وہ کل آ جائے گا۔ فیض احمد شش و پنج میں پڑ گیا۔ مقتول اس وقت دفتر میں موجود تھا بلکہ اب تو وہ اٹھنے ہی والا تھا۔ لمحاتی سوچ بچار کے بعد اس نے کوریئر کمپنی کے نمائندے کو مقتول کے کمرے میں بھیج دیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ واپس آیا اور فیض کو بتایا کہ وہ جس اشفاق علی کے لئے یہ پیکٹ لے کر آیا تھا، وہ تو اپنی کرسی میں مردہ پڑا ہوا ہے۔ یہ سنتے ہی فیض احمد کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ اضطراری انداز میں دوڑتے ہوئے مقتول کے کمرے میں گھس گیا۔ کوریئر کمپنی کے نمائندے نے غلط نہیں کہا تھا۔ اس کا باس واقعی اسے داغِ مفارقت دے گیا تھا۔ چند لمحات تک تو اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ کیا کرے۔ اور جب حواس بحال ہوئے تو اس کے ذہن میں یہ خیال اُبھرا کہ اسے فوری طور پر بیگم صاحبہ کو اس واقعے کی اطلاع دینا چاہئے۔ چنانچہ اس نے بنگلے پر فون کر کے مقتول کی بیوہ الماس کو اس اندوہناک صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد بوڑھے مقتول کی جوان بیوہ وہاں پہنچ گئی۔ اس کے بعد بیگم الماس کے ایماء پر فیض احمد نے تھانے کا نمبر ملا کر پولیس کو اس واردات کی اطلاع دے دی۔

فیض احمد کا طویل جواب اختتام پذیر ہوا تو میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''آپ کوریئر کمپنی کے اس نمائندے کا حلیہ بیان کر سکتے ہیں؟''

''وہ ایک دُبلا پتلا اور دراز قامت نوجوان لڑکا تھا۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''اس نے لباس کے اوپر پیراشوٹ کی جیکٹ پہن رکھی تھی، آنکھوں پر سیاہ سن گلاسز اور ہاتھوں پر دستانے تھے۔ اس کے گیٹ اپ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی بائیک پر سوار ہو کر وہاں پہنچا تھا۔''

مارکیٹنگ سے متعلق اور آؤٹ ڈور کے فرائض انجام دینے والے وہ افراد جو سارا دن بائیک کی ''پشت'' پر سوار رہتے ہیں انہیں اپنی تک سک درست رکھنے کے لئے اس قسم کی جیکٹ، گلوز اور گلاسز استعمال کرنا پڑتے ہیں ـــــ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گواہ سے پوچھا۔

''فیض صاحب! جب آپ مقتول کے کمرے سے باہر نکلے تو کیا کوریئر کمپنی کا وہ دراز قامت نمائندہ دفتر میں موجود تھا؟''

''وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ''پتہ نہیں، وہ کس وقت دفتر سے نکل گیا تھا۔''

میں نے عدالت میں موجود انکوائری آفیسر کی طرف دیکھا اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''آئی۔ او صاحب! آپ تو خواہ مخواہ اتنے عرصے سے میرے بے چارے بے گناہ مؤکل کو رگڑا دے رہے ہیں۔ سن لیں، آپ کا معزز گواہ کیسے کیسے انگشت بدنداں انکشاف کر رہا ہے۔ وقوعہ کے روز کسی ''ہائی ولاسٹی'' کوریئر کمپنی کا ایک جیمس بانڈ ٹائپ نمائندہ بھی جائے وقوعہ پر پہنچا تھا۔ کچھ غور فرمایا آپ نے اس سلسلے میں؟''

تفتیشی افسر کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز عدالت کے کمرے میں اُبھری۔ ''یہ تو ایک نئی صورتِ حال سامنے آ رہی ہے۔''

''صورتِ حال نئی نہیں آئی۔ او صاحب!'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''بس ذرا تاخیر سے سامنے لائی جا رہی ہے۔ اس وجہ سے استغاثہ کی رپورٹ میں اس کوریئر کمپنی اور اس کے پیکٹ بردار نمائندے کا دور دور تک کوئی ذکر سننے کو نہیں ملتا۔ خیر ـــــ اس کو کہتے ہیں ـــــ دیر آید، درست آید!''

جج نے بڑی بے چینی سے پہلو بدلا اور اضطراری لہجے میں استغاثہ کے گواہ سے پوچھا۔ ''مسٹر فیض! آپ نے پولیس کو اس بارے میں پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟''

''جنابِ عالی! مجھے بیگم صاحبہ نے منع کر دیا تھا۔'' وہ بڑی معصومیت سے بولا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

❁ ❁ ❁

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں مقتول کی بیوہ الماس بڑے طمطراق

سے کھڑی تھی۔ اس نے نہایت ہی قیمتی اور عمدہ قسم کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ میں نے اُس کے حُسن و جمال کی جو تعریفیں سن رکھی تھیں وہ اس سے کہیں بڑھ کر تھی۔

الماس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور اپنا مختصر سا مگر انتہائی جذباتی بیان ریکارڈ کروایا، پھر وکیل استغاثہ کی ہلکی پھلکی جرح کا سامنا کرنے لگی۔ گزشتہ پیشی پر میں نے فیض احمد پر جرح کے اختتام میں، اپنے مؤکل کے لئے جو حفاظتی دیوار کھڑی کی تھی اس نے وکیل استغاثہ کو کافی حد تک پریشان کر دیا تھا اور یہ پریشانی اس وقت اس کے سوالات سے بھی پوری طرح عیاں تھی۔ وہ اپنے حصے کا کام نمٹا کر فارغ ہوا تو میں جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا۔ آج میں دل میں یہ سوچ کر عدالت میں داخل ہوا تھا کہ الماس پر جرح کے دوران میں اس کیس کا پانسہ پلٹ کے رکھ دوں گا۔

مقتول ضعیف کی جوان بیوہ دل کشی اور دل ربائی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ میں چند لمحات تک بڑی محویت سے اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا، پھر واپس آ گیا اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے جرح کا آغاز کر دیا۔

''بیگم اشفاق!'' میں نے شروع ہی سے اسے کڑے ہاتھوں لیا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ مقتول سے شادی سے پہلے آپ فضائی میزبانی فرمایا کرتی تھیں؟''

عبدالرؤف نے جہاں دیگر معلومات مجھے مہیا کی تھیں وہیں مقتول کی خوب صورت بیوہ الماس کے بارے میں بھی بہت کچھ بتایا تھا۔ وہ میرے اس غیر متوقع اور اچانک سوال پر تھوڑا جز بز ہو کر رہ گئی تاہم سوال کا جواب دینا بھی لازم تھا اس لئے معتدل لہجے میں بولی۔

''جی ہاں ـــــ یہ سچ ہے۔ میں ایک معروف ایئر لائن میں ایئر ہوسٹس ہوا کرتی تھی۔ اشفاق کا اکثر و بیشتر ملک سے باہر آنا جانا ہوتا تھا۔ ہمارے درمیان پہلے دوستی ہوئی لیکن جلد ہی ہمیں یہ احساس ہو گیا کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے ہیں۔ اگرچہ ہماری عمروں میں بہت زیادہ تفاوت تھا لیکن جب اشفاق نے مجھے شادی کی پیشکش کی تو میں انکار نہ کر سکی۔ میری محبت نے مجھے مجبور کر دیا۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو آپ نے سنا ہی ہو گا کہ محبت پر کسی کا زور نہیں چلتا!''

اس کے الفاظ کا کھوکھلا پن پوری طرح عیاں تھا۔ وہ اداکاری کے ذریعے صورت حال کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اس کا بیان توجہ سے سماعت کیا اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''ہاں، میں نے یہ سن رکھا ہے کہ محبت پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ البتہ یہ جب چاہے اور جس پر چاہے زور چلا سکتی ہے ـــــ اور میرا خیال ہے آپ کے معاملے میں کچھ ایسا ہی

ہوا ہے۔"

وہ میرے طنز کی گہرائی تک پہنچ نہیں پہنچی یا نہیں پہنچی البتہ ایک خاص قسم کی جذباتی کیفیت میں وہ غیر ارادی طور پر اپنا زیریں ہونٹ کاٹنے لگی۔ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''الماس صاحبہ! مقتول ''اے۔این۔اے'' نامی جو ٹریڈنگ کمپنی چلاتا تھا کیا اس میں آپ کا بھی کچھ حصہ ہے؟''

''جی ہاں ——— میں اس بزنس میں فورٹی نائن پرسینٹ کی پارٹنر ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اے۔این۔اے'' دراصل اشفاق اینڈ الماس کا مخفف ہے۔ یہ ٹریڈنگ کمپنی اشفاق نے شادی کے بعد میری محبت میں قائم کی تھی اور مجھے اس میں برابر کا شریک رکھا تھا۔ اس سے پہلے وہ ایک اور بزنس کرتے تھے بلکہ اب بھی ——— وہ بزنس چل رہا ہے ——— دونوں بزنس کا اسٹاف بھی مشترکہ ہے۔"

''آپ کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے مقتول آپ سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔''

''اس میں کوئی شک نہیں۔'' وہ بڑے خفیف انداز میں اپنی زلفوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔ ''اور یہ معاملہ دوطرفہ تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''وقوعہ سے لگ بھگ تین ماہ قبل ڈاکٹر خاور نامی ایک شخص آپ کے بنگلے میں آ کر مہمان ہوا تھا۔ کیا وہ اب تک وہیں رہائش پذیر ہے؟''

''جی ہاں! ڈاکٹر خاور ابھی تک میرے بنگلے میں رہ رہا ہے۔'' وہ بڑی بہادری سے بولی۔ پھر وضاحت ضروری سمجھتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر خاور دراصل اشفاق کے ایک مرحوم دوست داور کا چھوٹا بھائی ہے۔ ان لوگوں کی فیملی سکھر میں آباد ہے۔ ایک روز اشفاق نے مجھ سے پوچھا کہ خاور کراچی میں آ کر جاب کرنا چاہتا ہے، کیا ہم اسے اپنے بنگلے میں رکھ لیں؟ اشفاق کی زبانی میں خاور کی فیملی اور ان کے حالات سے بہ خوبی آگاہ ہو چکی تھی۔ کسی زمانے میں داور نے اشفاق پر کوئی احسان کیا تھا۔ اشفاق نے ہمیشہ اس احسان کو یاد رکھا اور گاہے بہ گاہے اس کا تذکرہ بھی کرتا رہتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ آج کل ان کے مالی حالات گڑبڑ ہیں۔ کسی زمانے میں سکھر میں ان کے ٹھاٹ باٹ ہوا کرتے تھے، سیاست کی منہ زور آندھی نے وہ ساری شان و شوکت ختم کر دی تھی۔ اس وقت اس فیملی کو واقعی اشفاق کی مدد کی ضرورت تھی چنانچہ میں نے اشفاق کے استفسار کے جواب میں کہہ دیا کہ ہم اس وسیع وعریض بنگلے میں صرف دو افراد ہی تو رہتے ہیں بلکہ بالائی منزل تو بالکل خالی پڑی ہوئی ہے۔ تم خاور کو کراچی بلا لو اور اسے کسی

اچھے سے ہسپتال میں سیٹ بھی کرا دو۔ اس وقت ان لوگوں کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر خاور ہمارے بنگلے کی بالائی منزل پر رہ لے گا۔ چنانچہ وہ سکھر سے یہاں منتقل ہو گیا۔''

''اور اب تک یہیں ''منتقل'' ہے۔'' میں نے بے خیالی کے سے انداز میں کہا۔

الماس نے کٹہرے میں کھڑے کھڑے ایک پاؤں کا بوجھ دوسرے پاؤں پر منتقل کیا تاہم میرے اس مختصر سے تبصرے پر کچھ کہنا ضروری نہ سمجھا اور خاموش نظر سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے اپنے کام کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ اب میں نے سوالات کے زاویے کو خاصا ترچھا کر لیا تھا اور یہ موقع کی ضرورت بھی تھی۔

''بیگم اشفاق! آپ کی میرے مؤکل سے کیا دشمنی ہے؟''

''میں اس چھوٹے آدمی سے کیوں دشمنی کروں گی؟'' وہ تڑخ کر بولی۔

''اس کا مطلب ہے آپ کی اس سے دوستی ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

وہ بپھرے ہوئے انداز میں بولی۔ ''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں وکیل صاحب! کیا یہ شخص اس قابل ہے کہ میں اس سے دوستی یا دشمنی رکھوں؟'' وہ یک دم غصے میں آ گئی تھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''میں یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آپ کی نشان دہی بلکہ ایماء پر پولیس میرے مؤکل کی تلاش میں نکلی تھی۔''

''جو حالات و واقعات اس وقت درپیش تھے، میں نے انہی کی روشنی میں پولیس کو گائیڈ کرنے کی کوشش کی تھی۔'' وہ برہمی سے بولی۔ ''میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو اس سچویشن میں یہی کرتا۔''

''سچویشن ـــــــ حالات و واقعات ـــــــ!'' میں نے بڑبڑانے والے انداز میں زیر لب دہرایا پھر روئے سخن استغاثہ کی معزز گواہ، مقتول کی بیوہ الماس کی طرف پھیرتے ہوئے کہا۔ ''بیگم اشفاق! وقوعہ کے روز آپ نے دوپہر کے بعد فون کر کے دفتر سے ملزم کو گاڑی سمیت بنگلے پر بلا لیا تھا۔ کیا آپ کو اس سے کوئی ضروری کام پڑ گیا تھا؟''

''جی ہاں، ڈاکٹر خاور کو اس روز گاڑی کی اشد ضرورت پیش آ گئی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میری اپنی گاڑی مکمل چیک اپ اور سروس کے لئے گیرج گئی ہوئی تھی اس لئے میں نے اشفاق کو فون کر کے اس کی گاڑی اور ڈرائیور کو بلا لیا تھا۔''

''آپ کے استعمال میں کون سی گاڑی ہے؟''

''میں اپنی گاڑی ہی استعمال کرتی ہوں۔''
''میں گاڑی کا میک پوچھ رہا تھا۔''
''ٹویوٹا کرولا۔''
''اور مقتول کی گاڑی کا میک؟''
''سنی!'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ کو یہ بات معلوم تھی کہ دفتر سے روانہ کرتے وقت مقتول نے ملزم کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ شام میں اسے لینے نہ آئے۔ اس کی کسی دوست سے اہم میٹنگ تھی جس میں تاخیر ہو جانا لازمی بات تھی۔ مقتول نے کہا تھا کہ وہ خود ہی کسی طرح واپس آ جائے گا؟''

''نہیں ــــــ میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''لیکن اپنی موت سے چند منٹ قبل مقتول نے ملزم سے یہ کہا تھا کہ وہ صبح بنگلے سے نکلتے وقت اپنی اس میٹنگ کے بارے میں آپ کو بتا چکا تھا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ اسے واپسی میں دیر ہو جائے گی؟''

وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اشفاق نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔ شام میں جبکہ ملزم، ڈاکٹر خاور کے ساتھ گھر سے باہر گیا ہوا تھا تو اشفاق کا فون آ گیا اور اس نے مجھ سے کہا کہ اگر ملزم سات بجے سے پہلے واپس آ جائے تو میں اسے دفتر بھیج دوں۔'' وہ لمحے بھر کو رکی، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جہاں تک اشفاق کے اس کی موت سے قبل کسی بیان کی بات ہے تو میں اس سلسلے میں یہی کہوں گی کہ یہ ملزم کے ذہن کی اختراع ہے۔ اس بات کو ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ اشفاق نے ملزم سے ایسا کچھ کہا تھا۔ یہ شخص دروغ گوئی بھی تو کر سکتا ہے؟'' بات ختم کرتے ہی اس نے اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم کی جانب اشارہ کیا۔

میں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ ''اس بات کو یقیناً ثابت کیا جا سکتا ہے۔'' الماس نے ہراساں نظر سے میری طرف دیکھا۔ میں نے پُراعتماد لہجے میں اپنی بات کو آگے بڑھایا۔ ''اگر یہ حقیقت بند کمرے میں ہونے والی مقتول اور ملزم کی گفتگو تک محدود ہوتی تو دوسری بات تھی۔ آپ یہ کہہ کر جان چھڑا سکتی تھیں کہ ملزم اوّل درجے کا جھوٹا ہے اور مقتول سے تصدیق ممکن نہیں لیکن ــــــ'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن دو گواہ ایسے بھی موجود ہیں جو اس بات کی شہادت دے سکتے ہیں۔ ایک استغاثہ کا گواہ فیض احمد جو وقوعہ کے روز دیگر اسٹاف کے چھٹی کر جانے کے باوجود بھی دفتر میں موجود تھا

——— اور اس لئے موجود تھا کہ اس روز مقتول کو دیر تک دفتر میں بیٹھنا تھا۔ مقتول کی اپنے ایک طبیب دوست حکیم طیب نادری سے خصوصی ملاقات پر ایک اہم میٹنگ تھی۔ جب ملزم کم و بیش دس منٹ کم سات پر مقتول کو لینے دفتر پہنچا تو فیض احمد نے اس سے کہا تھا کہ وہ مقتول کو لینے کیوں آ گیا۔ مقتول نے دراصل فیض احمد کو بھی بتا رکھا تھا کہ ملزم اسے لینے نہیں آئے گا۔ فیض احمد کے حیرت بھرے استفسار پر ملزم نے فون کے حوالے سے وضاحت کرنا چاہی کہ مقتول نے اپنی بیگم کو فون کر کے اسے سات بجے دفتر پہنچنے کو کہا ہے تو فیض احمد نے ایسے کسی فون کی تصدیق نہیں کی۔''

میں نے سانس لینے کی غرض سے لحاتی توقف کیا پھر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''دوسرا گواہ اس معاشرے کا ایک معزز شخص اور مقتول کا معالجِ خصوصی حکیم طیب نادری ہے۔ اس مسئلے پر میری حکیم صاحب سے تفصیلی بات ہو چکی ہے۔'' یہ جملہ میں نے دانستہ اپنی بات کو زیادہ مؤثر بنانے کے لئے شامل کیا تھا ورنہ حکیم صاحب سے میری نہیں بلکہ سماجی کارکن عبدالرؤف کی ملاقات ہوئی تھی۔ ''اگر عدالت گواہی کی ضرورت محسوس کرے گی تو میں حکیم صاحب کو یہاں لانے کا بندوبست کر دوں گا۔ وہ بیان دیں گے کہ وقوعہ کے روز ان کی مقتول سے کس قسم کی ملاقات طے تھی اور یہ بھی واضح کریں گے کہ اس روز مقتول کو حکیم صاحب کے ساتھ ہی دفتر سے اٹھ کر گھر جانا تھا مگر کسی ہنگامی صورتِ حال کے باعث وہ ملاقات نہ ہو سکی۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ ممکن نہیں رہتا کہ مقتول آپ کو فون کر کے ڈرائیور کو سات بجے دفتر بھیجنے کی بات کرے۔ کیا اس سلسلے میں آپ کوئی وضاحت کرنا پسند فرمائیں گی؟''

''میں کسی بھی سلسلے میں کوئی وضاحت کرنا ضروری نہیں سمجھتی۔'' وہ اُکھڑے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اشفاق نے فون کر کے گاڑی بھیجنے کے لئے کہا اور میں نے ملزم کو دفتر بھیج دیا۔ وہاں دفتر میں کیا واقعات پیش آئے ان سے مجھے کوئی غرض نہیں۔''

''صرف آپ کے انکار کرنے سے بات نہیں بنے گی بیگم اشفاق!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''غرض تو آپ کو رکھنا پڑے گی۔ ابھی آپ نے میرے بہت سے کڑے سوالات کے جواب بھی دینا ہیں۔''

وکیل استغاثہ موقع محل کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے بول اٹھا۔ ''مجھے سخت اعتراض ہے جنابِ عالی! میرے فاضل دوست غیر ضروری باتوں کو زیرِ بحث لا کر معزز گواہ کو زچ اور عدالت کے قیمتی وقت کو برباد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں اس بات کی ہدایت کی جائے کہ گواہ سے صرف اور صرف متعلقہ سوالات ہی کریں۔''

میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یور آنر! میں نے اب تک گواہ سے کوئی بھی غیر ضروری یا غیر تعلق سوال نہیں کیا۔ میں گراؤنڈ بنا رہا ہوں اس عمارت کے لئے جو آگے چل کر میں استغاثہ کے خلاف تعمیر کرنے والا ہوں۔''

جج نے مجھے جرح جاری رکھنے کی ہدایت دے دی۔

میں نے مقتول کی بیوہ الماس سے سوال کیا۔ ''وقوعہ کے روز فیض احمد نے فون کر کے آپ کو مقتول کے قتل کی اطلاع دی تھی اور آپ فوراً دفتر پہنچ گئی تھیں۔ پھر آپ کی ہدایت پر فیض احمد نے متعلقہ تھانے فون کر کے پولیس کو بلا لیا تھا ــــــ'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد دوبارہ بولنا شروع کیا۔

''اس کیس کا تفتیشی افسر مسٹر حمید شاہ اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہے۔ تفتیش کے دوران اور اس کے بعد بھی اب تک آپ کی اس سے کئی مرتبہ ملاقات ہو چکی ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ نے اپنے سب سے زیادہ ہمدرد سے اس کیس کے ایک نہایت ہی اہم پہلو کو پوشیدہ رکھا ہوا ہے۔ کیوں، آخر کیوں؟''

''کون سا پہلو؟'' وہ بے ساختہ چلاّ اُٹھی۔

میں نے تفتیشی افسر کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا پھر گواہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''وقوعہ کے روز جب ملزم دفتر سے رخصت ہو گیا تو پندرہ منٹ بعد حکیم طیب نادری کا فون آ گیا۔ حکیم صاحب نے مقتول سے معذرت کی کہ وہ کسی ایمرجنسی کے باعث آج اس سے ملنے نہیں آ سکیں گے۔ اس فون کے بعد مقتول دفتر سے اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ہائی ولاٹی کوریئر کمپنی کا ایک فعال نمائندہ کوئی پیکٹ ڈیلیور کرنے وہاں پہنچ گیا اور ــــــ اُسی نمائندے نے مقتول کے کمرے کا چکر لگانے کے بعد یہ انکشاف کیا کہ وہ کسی اور ہی دنیا کا باسی ہو چکا ہے۔ بہر حال ــــــ'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر تھوڑا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''فیض احمد نے آپ کو اس نمائندے کی ہنگامی آمد اور طوفانی شد کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا تھا لیکن آپ نے اُسے تاکید کی کہ یہ بات پولیس تک نہیں پہنچنی چاہئے ــــــ اور واقعی یہ بات گزشتہ پیشی تک سب سے پوشیدہ تھی۔ وہ تو میری جرح کے آگے گواہ فیض احمد کو اپنی زبان پر کنٹرول نہیں رہا اور انہوں نے حقیقتِ حال اُگل دی۔ بعد ازاں جج کے استفسار پر گواہ فیض احمد نے بھری عدالت میں یہ اقرار کیا کہ انہوں نے آپ کی وجہ سے یہ بات پولیس تک نہیں جانے دی تھی۔ آپ نے فیض احمد کو منع کر دیا تھا ــــــ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر

میں ــــــ"

"وہ جھوٹا ہے ــــــ بکواس ــــــ" میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ چیخ اٹھی۔ "اس نے وقوعہ کے روز مجھ سے کوریئر کمپنی کے کسی نمائندے کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ یہ کہانی اس نے بعد میں گھڑی ہے۔ اگر وہ مجھے بتا دیتا تو میں اس بات کو چھپانے کے لئے اسے پابند کیوں کرتی؟ میرا کسی کوریئر کمپنی سے کیا واسطہ؟ میں ــــــ میں ایسا کیوں کروں گی ــــــ کیا ضرورت پڑی ہے مجھے ایسا کرنے کی؟"

غصے کی شدت اور جذبات کی حدت نے اسے قابو سے باہر کر دیا تھا۔ میں نے اس کی برہمی اور جاہ و جلال کو درخورِ اعتنا نہ سمجھتے ہوئے جارحانہ انداز میں کہا۔

"بیگم اشفاق! آپ جس شخص کو جھوٹا اور بکواس کہہ رہی ہیں وہ بیس سال سے مقتول کے ساتھ منسلک تھا اور کمپنی کے خارجی و داخلی امور میں اس کی شمولیت اور مشاورت کو ناگزیر سمجھا جاتا تھا۔ مقتول اس پر اندھا اعتماد کرتا تھا اور وہ بھی مقتول کے ہزارہا سربستہ رازوں کا امین تھا ــــــ بہ شمول حکیم طبیب نادری سے علاج والا راز!"

اتنا کہہ کر میں تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوا، حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور بہ آوازِ بلند دوبارہ بولنا شروع کر دیا۔ "انسان اگر جھوٹ بولتا ہے یا کسی حقیقت کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے پیش نظر کوئی نہ کوئی بڑا فائدہ ضرور ہوتا ہے یا پھر وہ کسی عظیم نقصان سے بچنے کے لئے یہ رویہ اپناتا ہے۔ اب ہم آپ کا اور فیض احمد کا جائزہ لیتے ہیں۔" میں نے ایک مرتبہ پھر لحاتی توقف کیا۔ ایک گہری اور طویل سانس خارج کی اور بڑے منطقی و مدلل انداز میں بولنا شروع کیا۔

"اگر فیض احمد نے ہائی ولاسٹی کوریئر کمپنی کے نمائندے کے حوالے سے جھوٹ بولا ہے تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس دروغ گوئی نے اسے کیا فائدہ پہنچایا یا کس بڑے نقصان سے بچایا؟ اس کیس کو عدالت میں لگے ہوئے آٹھ ماہ سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے لیکن فیض احمد کے حوالے سے ہمیں کسی بھی متذکرہ بالا سوال کا جواب نہیں ملتا جبکہ ــــــ اگر ہم آپ کا جائزہ لیں تو آپ بڑے مزے میں دکھائی دیتی ہیں۔ آپ نے کوریئر کمپنی والے نمائندے کی حقیقت کو چھپا کر بہت کچھ حاصل کر لیا ہے ــــــ!"

"یہ کیا بکواس ہے؟" وہ غصے کی شدت سے چلائی۔ "آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں، میں کتنی طاقتور اور با رسوخ ہوں۔ آپ جیسے دو ٹکے کے وکیلوں کو تو میں چٹکیوں میں اُڑا سکتی ہوں۔ میں ــــــ میں ــــــ" اس کے منہ سے باقاعدہ کف خارج ہونے لگا۔

میں بڑی دلچسپی اور خاموشی سے اس کی ہذیانی کیفیت سے لطف اندوز ہونے لگا لیکن وکیل استغاثہ میری تقلید میں خاموش رہ سکتا تھا اور نہ ہی یہ اس کے لئے حظ اٹھانے کے لمحات تھے لہٰذا وہ پورے طمطراق سے اس کی مدد کو لپکا۔ چیخ سے مشابہ آواز میں اس نے اعتراض جڑ دیا۔

''آبجیکشن یور آنر! وکیل صفائی حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔ یہ تو سیدھا سیدھا معزز گواہ کے کردار پر کیچڑ اچھالنے والی بات ہے۔''

''میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی جنابِ عالی!'' میں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر جج کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ''میرا انداز ایسا ہی تھا جیسے میں یہ ظاہر کرنے کی سعی کر رہا ہوں کہ میرے ہاتھ آلودہ نہیں ہیں۔ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے میں نے قدرے تیز آواز میں کہا۔ ''حقائق کو سامنے لانے پر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔''

''آپ کون سے حقائق سامنے لا رہے ہیں؟'' غصے کی شدت نے جوان بیوہ کو چیخنے پر مجبور کر دیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وکیل استغاثہ والا کارنر بہ نفس نفیس اسی نے سنبھال لیا ہو۔ دھاڑ سے مشابہ آواز میں مستفسر ہوئی۔ ''کیا اس قسم کی یادہ گوئی کو آپ وکالت کا نام دیتے ہیں؟ آپ کو میری طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔ اگر میں مخالفت پر اتر آئی تو آپ کہیں نظر بھی نہیں آئیں گے۔''

ناکامی اور جھنجلاہٹ کی شدت نے اس کے حواس کو مختل کر کے رکھ دیا تھا۔ اگر وہ اس وقت پوری طرح ہوش میں ہوتی تو اتنے غیر محتاط الفاظ استعمال نہ کرتی۔ مخالفین کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جیت کے بہت قریب لے آتا ہے اگر میں اس موقع کو کیش نہ کرتا تو یہ ایک حماقت ہوتی لہٰذا مقتول کی دلکش بیوہ کی گہری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس لہجے میں طنز کی بھرپور کاٹ شامل تھی۔

''بیگم اشفاق علی! آپ کی طاقت کا اندازہ مجھے بہ خوبی ہو رہا ہے۔'' پھر میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے اضافہ کیا۔

''یور آنر! گواہ کے سنگین الفاظ میں میرے لئے خطرناک دھمکی موجود ہے۔ میں معزز عدالت سے درخواست کروں گا کہ اگر میرے ساتھ کسی قسم کا کوئی حادثہ پیش آ جائے تو اس کا ذمے دار صرف اور صرف مقتول اشفاق علی کی بیوہ کو سمجھا جائے۔'' میں جملہ ادھورا چھوڑ کر استغاثہ کی گواہ الماس کو تکنے لگا۔

جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے استفسار کیا۔ ''بیگ صاحب! آپ اپنے مؤکل کے حق میں جو دلائل دے رہے تھے وہ سلسلہ ادھورا رہ گیا ہے۔ کیا اس بارے میں آپ کو

کچھ کہنا ہے؟''

جج کے اس سوال سے میری حماقت جھلکتی تھی۔ میں دوبارہ سرگرم ہو گیا اور با آوازِ بلند دلائل کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولنا شروع کیا۔

''جنابِ عالی ــــــ!'' میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔''اب تک معزز عدالت کے سامنے جو حالات و واقعات پیش کئے گئے ہیں ان کی روشنی میں میرا مؤکل سراسر بے گناہ و بے قصور دکھائی دیتا ہے۔ جو باتیں اب تک سامنے لائی جا چکی ہیں میں ان کو دہرا کر معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد نہیں کروں گا۔ استغاثہ کی کمزور رپورٹ اور تفتیشی افسر کے ادھورے جوابات نے سب کچھ عیاں کر دیا ہے۔ یہاں پر میں نہایت ہی اہم پوائنٹس کا ذکر کروں گا۔''

میں لمحہ بھر کو متوقف ہوا تو بہ شمول وکیل استغاثہ سب کی نظریں مجھ پر ٹِک گئیں۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور دفاع کے عمل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! وقوعہ کے روز ملزم ڈاکٹر خاور کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر اسے مختلف علاقوں میں گھماتا رہا تھا اور شام کو چھ بجے وہ نارتھ ناظم آباد کے ایک بنگلے پر پہنچے تھے۔ ڈاکٹر خاور کی ہدایت پر ملزم اسے مذکورہ بنگلے پر چھوڑ کر واپس آ گیا تھا۔ ملزم کی نشان دہی اور میری تحقیق کے مطابق، مذکورہ بنگلے میں باقاعدہ کوئی فیملی آباد نہیں بلکہ عمران علی نامی ایک نوجوان اکیلا رہتا ہے جو کسی کوریئر کمپنی میں ملازم ہے ــــــ ہائی ولاسٹی کوریئر کمپنی نہیں۔ ''ہائی ولاسٹی'' ایک فرضی نام تھا۔''

میں لمحہ بھر کو رکا پھر اپنے دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔''عمران علی نامی یہ نوجوان حلیے، وضع قطع اور قد کاٹھ کی رو سے ہائی ولاسٹی کوریئر کمپنی کے اس نمائندے سے گہری مطابقت رکھتا ہے جو وقوعہ کے روز مقتول کے لئے کوئی بڑا سا پیکٹ لے کر اس کے دفتر پہنچا تھا۔ میں تفتیشی افسر کو دعوت دوں گا کہ وہ ڈاکٹر خاور اور عمران علی کے درمیان استوار دوستانہ روابط کی حقیقت جاننے کی کوشش کرے۔ انشاء اللہ اس سے اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔''

میں سانس لینے کے لئے تھوڑی دیر کو رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔''یور آنر! میرا مؤکل اس امر کی روشنی میں مکمل طور پر بے گناہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وقوعہ کے روز جب وہ جائے وقوعہ سے رخصت ہوا تو مقتول زندہ تھا۔ نہ صرف زندہ تھا بلکہ اس کی استغاثہ کے گواہ فیض احمد اور حکیم طیب نادری سے بات بھی ہوئی تھی۔ حالات و واقعات کے مطابق، ملزم سوا سات بجے جائے واردات سے رخصت ہو گیا تھا۔ حکیم صاحب نے ساڑھے سات بجے فون کر کے مقتول کو بتایا کہ وہ ملاقات کے لئے نہیں آ سکے گا۔ یعنی ساڑھے سات بجے تک مقتول زندہ تھا۔ اس

کے بعد صرف ہائی ولاسٹی کوریئر کمپنی کا نمائندہ ہی وہاں پہنچا اور اسی نمائندے کی زبانی فیض احمد کو پتہ چلا کہ اس کا باس دارِ فانی سے رخصت ہو چکا ہے۔ یہ حقیقت استغاثہ کے گواہ فیض احمد نے مقتول کی بیوہ کے ایماء پر پولیس سے چھپائی تھی لیکن میری محنت کے نتیجے میں یہ حقیقت آشکار ہو چکی ہے۔ اگر استغاثہ واقعی مقتول کے قاتل تک پہنچنا چاہتا ہے تو اسے ہائی ولاسٹی (تیز رفتاری) سے ڈاکٹر خاور اور عمران علی پر کام کرنا چاہئے ـــــ اور مقتول کی بیوہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔"

"مجھے ـــــ مجھے ـــــ کیوں ـــــ" گواہوں والے کٹہرے میں کھڑی الماس حلق کے بل چلا اُٹھی۔ "میرا اس معاملے سے کیا تعلق ہے ـــــ آپ مجھے ڈاکٹر کے ساتھ کیوں نتھی کر رہے ـــــ" گھبراہٹ اور جذبات کی شدت سے اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔

میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "آپ کو اس معاملے میں اس لئے نتھی کیا جا رہا ہے کہ آپ نے استغاثہ کے گواہ فیض احمد کو ایک سنگین جھوٹ بولنے پر مجبور کیا ہے۔ گویا ایک اہم حقیقت کو چھپا کر تفتیش کو غلط رخ پر ڈالنے کی کوشش کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے اصل قاتل کو بچانے کی بھرپور تگ و دو کی ہے اور یقیناً آپ نے یہ سب کسی بڑے فائدے کے لئے کیا ہوگا۔ میں ـــــ"

"بیگ کے بچے! تمہاری تو ایسی کی تیسی ـــــ" الماس نے پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا۔ "اگر تم نے مزید کوئی بکواس کی تو میں تمہارا منہ نوچ لوں گی۔ تم میری ـــــ میری ـــــ"

"آرڈر ـــــ آرڈر ـــــ!" اسی لمحے جج کی گمبھیر آواز عدالت کے کمرے میں گونج اٹھی۔ وہ براہِ راست استغاثہ کی گواہ الماس سے مخاطب تھا۔ "بی بی! اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ ورنہ میں توہین عدالت کے جرم میں تمہیں سیدھا جیل بھجوا دوں گا۔"

ضعیف مقتول کی جوان بیوہ کے اُبال میں تھوڑی کمی واقع ہوئی اور وہ چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ معاندانہ نظر سے مجھے گھورنے لگی۔ میں نے اپنا فرض نبھاتے ہوئے استغاثہ کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کا فیصلہ کر لیا اور عبدالرؤف سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں کہا۔

"الماس صاحبہ! ابھی تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کے رو بہ رو آپ نے بتایا ہے کہ ڈاکٹر خاور کے مالی حالات بہت خراب تھے۔ کسی زمانے میں اس کا جو خاندانی ٹھاٹ باٹ تھا وہ اب قصۂ پارینہ بن کر رہ گیا ہے یہاں تک کہ ڈاکٹر خاور کی فیملی کو مقتول کی مدد کی سخت ضرورت تھی چنانچہ اسی مدد کے خیال سے مقتول نے ڈاکٹر خاور کو اپنے پاس کراچی بلا لیا تھا۔" میں لمحہ بھر کو رکا

پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اس وقت عدالت میں جس کیس کی سماعت ہو رہی ہے وہ وقوعہ اُنیس مئی کا ہے۔ میں اس بات کو ثابت کر سکتا ہوں کہ ڈاکٹر خاور نے دس جون کو یونیورسٹی روڈ پر ایک پلاٹ خریدا تھا جس کی مد میں اس نے ساٹھ ہزار روپے ادا کئے تھے۔ کیا اضافی دس ہزار روپے آپ نے اُسے دیئے تھے؟ اور یہ بھی بتائیں کہ باقی کے پچاس ہزار رپے اس کے پاس کہاں سے آئے؟''

''یہ ـــــ یہ ـــــ یہ تو آپ ـــــ'' وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''آپ ڈاکٹر خاور ہی سے پوچھیں ـــــ میرا اس معاملے سے کیا تعلق؟''

''ڈاکٹر خاور کو بھی عدالت میں بلا کر یہ استفسار ضرور کیا جائے گا کہ مالی تنگی اور دگرگوں حالات میں اس نے ایک پلاٹ کی خریداری کے لئے ساٹھ ہزار روپے کا بندوبست کہاں سے کیا۔ آپ سے تو میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ آخر کو ڈاکٹر خاور آپ کا مہمان تھا ـــــ بلکہ اب تک وہ ایک مہمان کی حیثیت سے آپ کے بنگلے میں ٹھہرا ہوا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

بات ختم کرتے ہی میں نے تیز نظروں سے اس کی آنکھوں میں گھورا ـــــ وہ تلملا کر رہ گئی پھر نفرت بھرے لہجے میں بولی۔

''آپ کے فضول سوالات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔''

اس کا یہ رویہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ دانستہ حقیقت سے آنکھیں چرا رہی ہے۔ عدالت نے الماس کے اس عمل کو خاص طور پر نوٹ کیا۔ میں دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں نے چبھتے ہوئے انداز میں اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''بیگم اشفاق! آپ کے شوہر کو اُنیس مئی کی شام قتل کیا گیا۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتائیں گی کہ آپ نے عدت کی مدت کب پوری کی؟''

''میں ان بے ہودہ رسموں کو نہیں مانتی۔'' وہ جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں چیخی۔

عدالت میں چہ میگوئیوں کا شور بلند ہوا۔ استغاثہ کی گواہ نے انتہائی غلط حرکت کی تھی۔ عدت کے حوالے سے اس نے جن الفاظ کا استعمال کیا تھا انہوں نے حاضرین عدالت میں ایک کھلبلی سی مچا دی۔ ہر طرف سے مخالفانہ آوازیں بلند ہونے لگیں۔

جج نے اپنی مخصوص آواز کے بل بوتے پر وہاں موجود افراد کو خاموش کرا دیا تاہم ان کے چہرے تمتمائے ہوئے تھے اور ہر آنکھ سے اشتعال جھلکتا تھا۔ عدالت کا وقت ختم ہونے میں چند منٹ باقی تھے مگر جج نے لوگوں کے مشتعل جذبات کے پیش نظر عدالت برخاست کرنے کا

اعلان کر دیا۔

❁ ❁ ❁

آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے مؤکل کو باعزت بری کر دیا۔

میں نے گزشتہ عدالتی کارروائی میں جو دھماکا خیز انکشافات کئے تھے ان کی روشنی میں جج نے ڈاکٹر خاور، عمران علی اور الماس کو شامل تفتیش کر کے پولیس کو جلد از جلد نیا چالان پیش کرنے کی تاکید کر دی۔ اس نئے چالان کے نتیجے میں جو حقائق سامنے آئے ہوں گے ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے آپ معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے ہوں گے۔

جاتے جاتے اتنا ضرور کہوں گا ـــــــ

نوجوان اور حسین وجمیل بیویوں کے بوڑھے شوہروں کو اپنے ماحول پر گہری نگاہ رکھنی چاہئے۔ خاص طور پر اگر وہ کسی نامحرم، جوان مرد کو اپنے یہاں مقیم کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہوں تو اس سوچ سے پہلے ہزار بار سوچ لینا چاہئے ورنہ ـــــــ پھر ایسے ہی نتائج برآمد ہوتے ہیں جیسا کہ اس کیس میں دیکھنے کو ملا۔ انسانی جبلت بڑی خطرناک شے ہے، فطرت کے تقاضے ہر حال میں پورے ہو کر رہتے ہیں۔ آتش بدن کی منہ زوری اور سرکشی سے انکار ممکن نہیں۔

خوددار

زندگی بڑی خوبصورت اور انمول شے ہے۔
اسے عجیب اور دلچسپ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کی کہانیاں اس سے بھی بڑھ کر دلچسپ اور تحیر آمیز ہوتی ہیں جو کبھی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ ایک کہانی کا انجام، دوسری کہانی کا نقطہ آغاز بن جاتا ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک روئے زمین پر ایک بشر بھی موجود ہے۔ کیونکہ جہاں بشر ہوگا وہاں لازمی شر بھی ہوگا اور یہی شر دراصل کہانیوں کو جنم دیتا ہے۔

آج میں جو کہانی آپ کے ذوقِ مطالعہ کی نذر کر رہا ہوں اس میں شر کی کارروائی اور کارفرمائی اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان کے لئے اس میں عبرت کا سامان موجود ہے لیکن افسوس کہ آج کا انسان بہت مصروف ہو گیا ہے۔ اس نے خود کو محض ''کرنے'' تک محدود کر لیا ہے۔ اس کے پاس دیکھنے اور سننے کی فرصت ہے اور نہ ہی غور و فکر کرنے کا وقت۔ عبرت پکڑنا تو اس کے بعد کا مرحلہ ہے!

اس تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

ایک روز میں حسب معمول اپنے چیمبر میں بیٹھا پیشہ ورانہ تقاضے نبھا رہا تھا کہ میری سیکرٹری نے انٹرکام پر دو افراد کی آمد کے بارے میں بتایا۔ میں نے پانچ منٹ پہلے ہی ایک کلائنٹ کو فارغ کیا تھا لہٰذا سیکرٹری سے کہہ دیا۔

''ٹھیک ہے فوزیہ! انہیں اندر بھیج دو۔''

اگلے ہی لمحے وہ دونوں اندر تھے۔

ان میں سے ایک کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ وہ پچپن کے پیٹے میں تھا۔ وہ چھوٹے قد کا مالک ایک باریش شخص تھا۔ جسم متناسب اور صحت مناسب۔ اس نے صاف ستھرا شلوار سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ دوسرے شخص کی عمر کا

اندازہ میں نے پچیس کے قریب لگایا۔ وہ ایک قد آور اور اسمارٹ نوجوان تھا۔ مگر بہ فربہی بدن کے باوجود بھی وہ چاق و چوبند اور پُرعزم دکھائی دیتا تھا۔ ان دونوں افراد کی صورتوں میں گہری مشابہت پائی جاتی تھی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق، اگر وہ سگے بھائی نہیں تھے تو پھر باپ بیٹا ضرور تھے۔ بعدازاں میرا یہ اندازہ صد فی صد درست ثابت ہوا۔

انہوں نے میرے چیمبر میں داخل ہوتے ہی یکے بعد دیگرے مجھے سلام کیا۔ میں نے پیشہ وارانہ مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا اور سلام کے جواب کے بعد انہیں بیٹھنے کو کہا۔ وہ میری میز کے سامنے بچھی کرسیاں کھینچ کر بہ آہستگی بیٹھ گئے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے سوالیہ نظروں سے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیا اور پوچھا۔ ''جی فرمایئے! میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

باریش شخص نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وکیل صاحب! میرا نام حمید اللہ ہے اور یہ میرا بیٹا وحید اللہ ہے۔'' اس نے پہلو میں براجمان نوجوان کی طرف دیکھا پھر دوبارہ میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں نظامی صاحب نے آپ کا ایڈریس دیا ہے۔ انہوں نے یقین دلایا ہے کہ آپ ہمارے مسئلے کو حل کردیں گے۔''

میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا اور کاغذ قلم سنبھالنے کے بعد سوال کیا۔ ''کون نظامی صاحب؟''

''منیر نظامی۔'' حمید اللہ نے جواب دیا۔ ''وہ جو بینک میں ہوتے ہیں۔''

''اچھا، اچھا ــــــ وہ نظامی صاحب!'' میں نے جلدی سے کہا۔

اس نے یاد دلایا تو مجھے فوراً یاد آ گیا۔ منیر نظامی ایک ویلفیئر بینک کا انتظام و انصرام چلاتا تھا۔ مذکورہ بینک ایک مخصوص کمیونٹی کے زیرسایہ کام کرتا تھا یعنی اس کمیونٹی سے تعلق رکھنے والے افراد کی فلاح و بہبود کے لئے تھا۔ یہ بینک آسان شرائط اور نہایت ہی کم مارک اپ پر اپنی کمیونٹی کے ضرورت مند اور کم زور افراد کو چھوٹے چھوٹے قرضے دیتا تھا۔ اس بینک کے کرتا دھرتا منیر نظامی سے میری اچھی یاد اللہ تھی۔ نظامی نہایت ہی مخلص، ہمدرد اور شریف النفس انسان تھا۔ اس کی یہی خوبیاں ہمارے تعلقات کی اصل وجوہ بھی تھیں۔

میں نے یکے بعد دیگرے ان کے چہروں کو دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا آپ لوگوں کا تعلق بھی اسی مخصوص کمیونٹی سے ہے؟''

''نہیں وکیل صاحب!'' حمید اللہ نے نفی میں گردن ہلائی اور قدرے افسردگی سے بولا۔ ''اگر ہم بھی اسی کمیونٹی سے ہوتے تو شاید یہ مسئلہ کھڑا ہی نہ ہوتا۔ کمیونٹی کے بڑے بیٹھ کر اس مسئلے کا کوئی حل نکال لیتے اور ہمیں قانون کی مدد حاصل کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔''

''اوہ!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور سرسری لہجے میں کہا۔ ''خیر، بتائیں۔ آپ کا مسئلہ کیا ہے؟''

''میں کیا بتاؤں ـــــــ آپ بھی یہ بات بڑی اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ کمیونٹی سسٹم کے بہت زیادہ فائدے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر کمیونٹی سے تعلق رکھنے والے نچلے درجے کے کمزور لوگ اس بری طرح متاثر نہیں ہوتے جیسا کہ کمیونٹی سسٹم سے باہر دیکھنے کو ملتا ہے۔ کمیونٹی کے کرتا دھرتا اپنے غریب اور کمزور تعلق داروں کی فلاح و بہبود کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ دنیا کا سب سے زیادہ متوازن، معقول اور طاقت ور کمیونٹی سسٹم اسلام نے متعارف کرایا ہے لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے خود کو طبقوں، فرقوں اور لسانی گروہوں میں تقسیم کر کے اس سسٹم کا شیرازہ بکھیر دیا ہے اور ـــــــ اس دانستہ حماقت کا مزہ بھی چکھ رہے ہیں۔ کاش ـــــــ!''

میرے سوال کے جواب میں حمید اللہ نے عجیب سے لہجے میں بتایا۔ ''وکیل صاحب! مسئلہ ہمارا نہیں، سائرہ بیگم کا ہے۔''

'میں یہی سمجھا کہ سائرہ بیگم نامی کوئی عورت حمید اللہ کی قریبی رشتے دار ہو گی۔ لہٰذا پوچھ لیا۔ ''سائرہ بیگم آپ کی کیا لگتی ہیں؟''

''ابھی تو کچھ بھی نہیں لگتیں۔'' وہ پہلے سے بھی زیادہ عجیب انداز میں بولا۔ ''بس لگنے ہی والی ہیں۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں حمید صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ ''پلیز اپنی بات کی تھوڑی وضاحت کر دیں۔''

جواب دینے سے قبل حمید اللہ نے مشورہ کرنے والی نگاہ سے اپنے بیٹے وحید اللہ کی جانب دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور انھی نظروں میں الفاظ کی خاموش ترسیل ہوئی۔ پھر حمید اللہ میری طرف دیکھتے ہوئے قدرے گمبھیر لہجے میں بولا۔

''وکیل صاحب! میرا خیال ہے، میں آپ کو کھل کر بتاتا ہوں تاکہ یہ سارا معاملہ آپ پر واضح ہو جائے۔ اس طرح آپ زیادہ بہتر انداز میں سائرہ بیگم کی مدد کر سکیں گے۔''

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ کا خیال بالکل درست ہے حمید صاحب!''

وہ چند لمحات تک خاموش رہنے کے بعد بتانے لگا۔

''میں ایک بینک کے آڈٹ ڈیپارٹمنٹ میں طویل عرصہ ملازمت کر چکا ہوں لیکن آج کل ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہوں ـــــــ'' وہ لمحہ بھر کو متوقف ہوا، مذکورہ بینک کا نام بتایا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اس بینکاری کے سبب ہی منیر صاحب سے میری دوستی ہوگئی جو اب تک کامیابی سے جاری ہے۔ چنانچہ منیر نظامی کے مشورے پر میں اپنا کیس ــــــ میرا مطلب ہے، سائرہ بیگم کا کیس لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔''

وہ اتنا بتا کر رکا تو میں خاموش، سوالیہ نظر سے اسے دیکھتا چلا گیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اکثر افراد کی باتوں میں باقاعدہ ربط وضبط باقی نہیں رہتا۔ وہ بات کو کہیں سے شروع کر کے کہیں بھی لا کھڑا کرتے ہیں اور پھر خود کہیں بھی نکل جاتے ہیں۔ کچھ یہی حال حمید اللہ کا بھی تھا۔

چند لمحات کے توقف کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔ ''سائرہ بیگم دراصل وحید اللہ کی ہونے والی ساس ہیں۔ میں نے اپنے بیٹے کی منگنی سائرہ بیگم کی اکلوتی بیٹی صبا سے کر دی ہے۔ انشاء اللہ ایک سال کے اندر ہی شادی بھی ہو جائے گی۔ اسی لئے ــــــ اسی لئے میں نے کہا تھا، سائرہ بیگم بس لگنے ہی والی ہیں۔ میری سمدھن اور میرے بیٹے کی ساس۔''

بات ختم کرتے ہی وہ امید افزا مگر متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، اب آپ کی بات کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی ہے ــــــ آگے بتائیں، آپ کی ہونے والی سمدھن سائرہ بیگم کو کون سا گمبھیر مسئلہ درپیش ہے؟''

اس کی آنکھوں میں امید کی کرن چمک اٹھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اسے یقین ہو چلا ہو کہ میں اس کی ہونے والی سمدھن کا مسئلہ حل کر دوں گا ــــــ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔

''وکیل صاحب! سائرہ بڑی مظلوم عورت ہے۔ اس نے زندگی بھر بے انتہا دکھ اٹھائے ہیں۔ اگر صبا کا سہارا نہ ہوتا تو وہ پتہ نہیں کب کی مر کھپ گئی ہوتی۔ اکیلی جان کا آخر مسئلہ ہی کیا ہوتا ہے۔ لیکن اولاد کا درد، ماں کو مر مر کر بھی جینا سکھا دیتا ہے۔ سائرہ بھی اب تک محض صبا کے روشن مستقبل کی خاطر زندہ ہے۔ اس نے انتہائی کسمپرسی کی حالت میں اپنی بیٹی کی پرورش کی ہے۔ خیر، اب تو صبا نہ صرف یہ کہ پل بڑھ کر جوان ہو گئی ہے بلکہ تعلیم یافتہ ہونے کے سبب ایک مقامی پرائیویٹ فرم میں ملازمت بھی کر رہی ہے۔ سائرہ بیگم نے جیسے تیسے اپنی بیٹی کی تعلیم وتربیت اور پرورش کر دی۔ تعلیم کے حصول کے دوران ہی صبا ٹیوشنز وغیرہ کر کے گھر کے اخراجات میں بھی ماں کا ہاتھ مضبوط کرتی رہی۔ بہرحال، یہ تو قصۂ پارینہ ہے ــــــ''

حمید اللہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوا تو میں نے پوچھ لیا۔ ''یہ تو بہ قول آپ کے قصہ پارینہ ہوا۔ اب ذرا قصہ تازہ ترینہ بھی بیان کر دیں۔''

اس نے الجھی ہوئی نظر سے میری طرف دیکھا۔ ''قصہ تازہ ترینہ'' کے الفاظ نے اسے

تذبذب میں ڈال دیا تھا۔ میں نے فوراً وضاحت کر دی۔ ''میرا مطلب ہے اس وقت آپ کی ہونے والی سمدھن جس مسئلے سے دوچار ہے کچھ اس کی بابت بھی بتائیں۔''

''اس کی بابت ـــــ'' اس نے خیال افروز انداز میں دہرایا پھر چند لمحے کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''میں محسوس کر رہا ہوں، سائرہ بیگم کا مشکل وقت ختم ہو چکا ہے۔ اب اس کے اچھے دن شروع ہونے والے ہیں اگر اسے آپ کا تعاون حاصل ہو گیا تو سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔''

اس کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر پراسرار انداز میں خاموش ہو گیا۔ میں نے صورتِ حال کی کیفیت کی روشنی میں کہا۔ ''ظاہر ہے، وہ جس بیٹی کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی خاطر مشکلات اٹھاتی آئی ہے وہ اس کی توقعات کے مطابق، پل بڑھ اور پڑھ کر جوان ہو چکی ہے۔ بلکہ عنقریب اس کی آپ کے فرزند سے شادی بھی ہونے والی ہے۔ اولاد کی شادی والدین کے لئے آخری فریضہ ہوتا ہے۔ صبا کی شادی کے بعد ایک طرح سے سائرہ بیگم کا منصوبہ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ والدین کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات ـــــ اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے!''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں آپ کی بات کی تائید کرتا ہوں وکیل صاحب!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''لیکن سائرہ بیگم کی مشکلات کے خاتمے اور اچھے دن کے آغاز سے میری مراد کچھ اور تھی۔''

''جی کیا مراد تھی آپ کی؟'' میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''وکیل صاحب! میں دراصل یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس ظالم اور سفاک شخص کی وجہ سے سائرہ بیگم نے ساری زندگی تکالیف اٹھائی ہیں، اب اسی کے سبب اسے راحت اور سکون ملنے والا ہے کیونکہ وہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا اور اسی سلسلے میں ہمیں آپ کی قانونی مدد درکار ہے۔''

کافی دیر سے میرے ذہن میں ایک سوال گردش کر رہا تھا۔ مزید کسی استفسار سے قبل میں نے حمید اللہ سے یہی سوال پوچھ لیا۔

''آپ نے ابھی تک اپنے سمدھی ـــــ یعنی ہونے والے سمدھی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

''اصل فساد کی جڑ تو یہی شخص ہے ـــــ بلکہ تھا۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے اس ظالم شخص کی موت کا ذکر کیا ہے۔ زندگی بھر اس شخص کی ذات سے

ان ماں بیٹی کو کوئی خوشی ملی اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی فائدہ پہنچا ہے لیکن اس شیطان صفت شخص کی موت صبا اور سائرہ بیگم کو کافی فائدہ پہنچا سکتی ہے اور میں آپ کے توسط سے انہیں فائدہ پہنچانا چاہتا ہوں۔"

"اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو آپ کوئی جائیداد وغیرہ کا کیس میرے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے دوٹوک لہجے میں استفسار کیا۔

اس نے گردن کو اثباتی جنبش دی اور بولا۔ "آپ بالکل کوئی غلطی نہیں کر رہے وکیل صاحب! یہ جائیداد ہی کی تقسیم اور منتقلی کا گمبھیر معاملہ ہے۔ اس معاملے کو آپ ہی خوش اسلوبی سے سنبھال سکتے ہیں۔ میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں کہ حق دار کو اس کا حق مل جائے۔"

ایک لمحے کے لئے میرے ذہن میں حمید اللہ کی چالاکی کے حوالے سے ایک خطرناک سوال اُبھرا۔ حالات و واقعات کے مطابق قانونی طور پر ابھی تک سائرہ بیگم اور صبا اس کی کچھ نہیں لگتی تھیں جب تک وحید اللہ اور صبا کی شادی نہ ہو جاتی، اصولاً انہیں رشتے دار کہنا تکنیکی اعتبار سے درست نہیں تھا۔ چنانچہ یہ بھی سوچا جا سکتا تھا کہ حمید اللہ اپنے کسی فائدے کی خاطر سائرہ بیگم کی مدد کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ سائرہ بیگم کو شوہر کی طرف سے جو کچھ بھی ملتا وہ صبا ہی کا ہوتا۔ جب صبا وحید اللہ کی بیوی بن جاتی تو یہ "سب کچھ" وحید اللہ کے تصرف میں چلا جاتا۔ اس دنیا میں چونکہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ یہاں حرص و ہوس کے پجاریوں کی کمی ہے اور نہ ہی لالچی اور خودغرض افراد کا کوئی کال ——— یہ تو ہم کا کارخانہ ہے، یہاں وہی ہے جو اعتبار کیا ——— لہٰذا اس انداز میں سوچنے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی تھی تاہم میں نے اس امکان کو ذہن کے ایک گوشے میں محفوظ کیا اور حمید اللہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"اگر سائرہ بیگم کے شوہر کا انتقال ہو گیا تو جائیداد کی تقسیم یا منتقلی کا کیا مسئلہ ہے۔ ظاہر ہے وہ شخص جو کچھ چھوڑ کر مرا ہے وہ اس کی اولاد اور بیوی ہی کا ہے۔"

"یہی تو مسئلہ ہے وکیل صاحب!" وہ پریشانی سے بولا۔ "سائرہ کا شوہر اقتدار حسین نامی وہ سفاک شخص جو کچھ چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوا ہے اس پر کوئی اور سانپ ——— بلکہ ناگن بنا بیٹھا ہے۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟"

حمید اللہ نے جتنے اُلجھے ہوئے انداز میں وہ بات کی تھی اس سے میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے دونوں کہنیوں کو میز پر ٹکایا اور قدرے آگے کو جھکتے ہوئے کہا۔ "میں کچھ نہیں سمجھا۔ آپ تھوڑی وضاحت کر دیں تو مہربانی ہوگی۔"

وہ تفصیل میں جاتے ہوئے بولا۔ "لگ بھگ بیس سال قبل اقتدار حسین نے اپنی بیوی

سائرہ بیگم کو گھر سے نکال دیا تھا۔ اس وقت صبا صرف تین سال کی تھی۔ بیوی تو کسی غیر کی اولاد ہوتی ہے لیکن اس بے حس کو اپنے جگر کے ٹکڑے کا بھی خیال نہ آیا۔ صبا تو اس کا اپنا خون تھا۔ سائرہ کے ساتھ ہی اس نے صبا کو بھی بے دخل کر دیا۔ اس زمانے میں اقتدار حسین کے مالی حالات کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے۔ وہ ناظم آباد کے ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہتا تھا اور شاید کسی مل میں کام کرتا تھا۔'' حمید اللہ نے یہاں تک پہنچنے کے بعد توقف کیا پھر مزید بتانے لگا۔ میں اس کی سنائی ہوئی کہانی کو اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔

سائرہ اپنی بچی کو سینے سے چمٹائے، آنسو بہاتے ہوئے باپ کے گھر پہنچ گئی۔ سائرہ کا باپ فرید الدین ایک ٹیکسٹائل مل میں مشین آپریٹر تھا۔ اس نے بیٹی کے آنسو پونچھے اور حتیٰ الامکان کوشش کی کہ سائرہ کا گھر برباد نہ ہو۔ سائرہ کی ماں زندہ نہیں تھی۔ وہ یہ دُکھ دیکھنے اور سہنے سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔ فرید الدین نے اپنے داماد کو منانے کے لئے سمجھانے بجھانے کے علاوہ منت سماجت اور خوش آمد درآمد سے بھی کام لیا لیکن اقتدار حسین پر اس کی کوشش کا ذرا اثر نہ ہوا۔ اس نے دوٹوک انداز میں یہ کہتے ہوئے بات ختم کر دی۔

''فرید الدین! شکر کرو کہ میں تمہاری بیٹی کو طلاق نہیں دے رہا ہوں اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو توفیق ہوئی، میں اس کی مالی مدد بھی کرتا رہوں گا۔ بس، میں اسے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔''

''قصور!'' اقتدار حسین نے ایک خاص انداز میں منہ بگاڑ کر کہا۔ ''اس کے قصور کی تفصیل بہت طویل ہے۔ بس اتنا سمجھ لو، یہ مجھے بہت زیادہ تنگ کرتی ہے۔ ایک چھت کے نیچے ہمارا گزارا ممکن نہیں ہے۔''

عورت کی زندگی میں اس کی قسمت اور میکہ بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اگر قسمت اچھی نہ ہو اور اتفاق سے میکہ بھی کمزور ہو تو پھر اس کی زندگی عذاب بن کر رہ جاتی ہے۔ سائرہ اس دو طرفہ مصیبت میں گرفتار تھی۔ فرید الدین ایک کمزور اور بے وسیلہ انسان تھا۔ اس کی عمر کا آخری حصہ شروع ہو چکا تھا اور وہ بیمار بھی رہنے لگا تھا۔ گھر میں اس کے سوا اور کوئی تھا بھی نہیں لہٰذا وہ اقتدار حسین جیسے شیطان کی کمینگی کا مقابلہ نہ کر سکا۔

اگر سائرہ کا میکہ مضبوط ہوتا تو اقتدار کی مجال نہیں تھی کہ ایسی بدمعاشی کرتا اور اگر وہ طلاق کی دھمکی بھی دیتا تو کوئی اس سے ڈرنے والا نہیں تھا۔ سائرہ کی عمر ایسی تھی کہ با آسانی کہیں بھی اس کی دوسری شادی ہو جاتی۔ بدقسمتی، کمزوری اور والدین کی شرافت نے ایک ساتھ اس پر حملہ کیا اور وہ سوچ بچار کے بعد ایک فیصلے پر پہنچ گئی۔ پھر اس نے اپنے فیصلے سے فرید الدین کو بھی

آگاہ کر دیا۔

''ابو! آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔ اگر اقتدار مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتا تو کیا، کیا جا سکتا ہے؟ یہ تو میری بدنصیبی کا کمال ہے۔ میں نے زندگی میں کبھی شادی نہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے۔ چاہے دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے لیکن میں شادی کے بارے میں سوچوں گی بھی نہیں۔ اپنی بچی کی پرورش ہی اب میرا مشن ہے اس لئے آپ اقتدار کی خوشامد نہ کریں۔ میں طلاق کا طوق نہیں پہننا چاہتی۔ آپ مجھے اپنے پاس ہی رکھ لیں۔ یقین جانیں، میں آپ پر بوجھ نہیں بنوں گی۔ چھوٹی موٹی ملازمت کر کے میں اپنے اخراجات کا بندوبست کر ہی لوں گی۔''

سائرہ کے آخری جملوں نے فریدالدین کے جگر کو پاش پاش کر دیا۔ بیٹیاں کبھی بھی اپنے باپ کے لئے بوجھ نہیں ہوتیں۔ وہ تو ان کے دل کا ٹکڑا ہوتی ہیں ـــــ جگر کا گوشہ ہوتی ہیں۔ فریدالدین کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے سائرہ کو اپنے سینے میں بھینچ لیا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''میری بچی! یہ تم نے کیا کہہ دیا؟ تم میرے لئے بوجھ کیسے بن سکتی ہو؟ میں تو تمہاری بھلائی کے لئے سوچ رہا تھا۔ اسی لئے اس خبیث کی منت ساجت میں لگا ہوا تھا۔ میری کوشش تھی کہ تمہارا گھر نہ اجڑے لیکن اُس شقی القلب شخص کے اندر انسانیت نام کو نہیں۔ جو بندہ اپنے خون کا احساس نہ کرے وہ تمہارا کیا خیال رکھ سکتا ہے۔ میں اس مردود کی فطرت کو سمجھ گیا ہوں۔ تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ میرے ساتھ رہو۔ میں نے تمہیں پال پوس کر اتنا بڑا تو کر دیا ہے تو اس کے بعد بھی تمہارا اور تمہاری بچی کا خیال رکھ سکتا ہوں۔ تمہیں اس سلسلے میں قطعاً فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ کسی نوکری وغیرہ کے بارے میں سوچنا بھی نہیں۔ میں ہوں نا!''

وہ سائرہ کو سینے سے لگائے تھپکتا رہا اور اسی قسم کی شفقت سے بھری ہوئی پدرانہ باتیں کرتا رہا۔ سائرہ نے بھی بابل کے سینے میں منہ دبا کر خوب دل کی بھڑاس نکالی۔ جب وہ دونوں ایک دوسرے کے درد کو سمجھ گئے اور یہ بات بھی ان کی عقل میں آ گئی کہ وہی ایک دوسرے کے درد کا مداوا بھی ہیں تو وہ نارمل ہو گئے۔ چند روز بعد سائرہ نے گھر پر ہی سلائی وغیرہ کا کام شروع کر دیا۔ گھر میں اس کی والدہ کی سلائی مشین رکھی تھی اور اسے یہ ہنر بھی آتا تھا۔ لہٰذا گھر میں آمدنی کا ایک اور دروازہ کھل گیا۔

کچھ عرصہ بعد پتہ چلا کہ اقتدار حسین نے ناظم آباد کا علاقہ چھوڑ دیا ہے اور گلشن میں کہیں جا کر آباد ہو گیا ہے۔ اس نے سائرہ سے علیحدگی کرتے وقت فریدالدین سے وعدہ کیا تھا کہ وہ حسبِ توفیق اس کی مالی مدد کرتا رہے گا۔ سائرہ کو اگرچہ اس کے اس وعدے کا قطعی اعتبار نہیں

تھا مگر فریدالدین کے دل میں موہوم سی امید ضرور تھی لیکن جب اقتدار نے پلٹ کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھا تو فریدالدین کی یہ کمزور امید ''اناللہ'' ہوگئی۔ ویسے جب سے سائرہ نے سلائی کا کام شروع کیا تھا، مالی تنگی اس گھر سے رخصت ہوگئی تھی۔ محلے والے اسے پیش آنے والے سفاک حالات سے بہ خوبی آگاہ تھے اور اس سے گہری دلی ہمدردی بھی رکھتے تھے لہٰذا بچوں اور عورتوں کے کپڑے سلائی کے لئے اس کے پاس آنے لگے۔ وہ بازار سے نصف ریٹ پر سلائی کر رہی تھی اس لئے گاہکوں کو بھی فائدہ تھا اور اس کا اپنا روزگار بھی چل نکلا تھا۔ جب گھر میں پیسہ آنے لگے اور معاشی مسائل حل ہو جائیں تو خوشحالی خود بخود خیمہ زن ہو جاتی ہے۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ سائرہ ایک لمحے کے لئے بھی صبا کی تعلیم و تربیت سے غافل نہیں ہوئی۔ صبا نے وقت مقررہ پر میٹرک، انٹر اور گریجویشن کرلیا۔ میٹرک کے بعد صبا نے ٹیوشنز وغیرہ کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا جو گریجویشن تک جاری رہا۔ گریجویشن کے بعد اس نے باقاعدہ ایک مقامی پرائیویٹ فرم میں ملازمت کرلی تھی اور ــــــ ایک سال کے اندر اس کی شادی حمیداللہ کے بیٹے وحیداللہ سے ہونے والی تھی۔

اس بیس سالہ طویل مدت کے دوران سائرہ بیگم کو اپنے شوہر اقتدار حسین کے بارے میں اُڑتی اُڑتی سننے کو ملتی رہی۔ گلشن اقبال میں منتقل ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد اس نے ایک اسٹیٹ ایجنٹ کی بیوہ سے شادی کر لی تھی۔ اس طرح وہ اسٹیٹ ایجنٹ بن گیا۔ چند سال بعد یہ سننے میں آیا کہ اس کی فہمیدہ نامی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔ کچھ عرصے بعد خبر ملی، اقتدار حسین نے کسی سلمٰی نامی مال دار خاتون سے شادی کر لی ہے۔ سلمٰی اپنے بنگلے کی فروخت کے سلسلے میں اس سے ملی اور پتہ نہیں، اقتدار نے کیسا چکر چلایا کہ وہ اس سے شادی کرنے پر تیار ہوگئی۔ اتفاق سے سلمٰی نامی یہ عورت بھی بیوہ تھی ــــــ ایک صاحب ثروت بیوہ!''

سلمٰی اقتدار کے لئے کامیابی کی سفیر ثابت ہوئی اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ اسٹیٹ ایجنٹ سے کار ڈیلر بن گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی رہائش میں بھی نمایاں تبدیلی واقع ہوئی۔ کار ڈیلر بنتے ہی وہ گلشن اقبال سے اٹھ کر پی ای سی ایچ سوسائٹی میں آگیا۔ اس کا شوروم اور آفس خالد بن ولید روڈ پر تھا۔ اقتدار بڑی تیزی سے اوپر کی سمت بڑھ رہا تھا کہ فہمیدہ خاتون کی طرح اچانک سلمٰی کا بھی انتقال ہوگیا۔

کچھ ہی عرصہ بعد شیریں نامی ایک خوبرو، کم عمر حسینہ اقتدار کی زندگی میں داخل ہوئی۔ اسی عورت کے لئے حمیداللہ نے ''ناگن'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ شیریں ایک سال تک اقتدار کی بیوی رہی اور چند روز قبل اقتدار حسین کا انتقال ہوگیا۔

سائرہ اپنے شوہر کی روز افزوں ترقی سے پوری طرح آگاہ تھی لیکن اس نے کبھی اقتدار سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بلندی کے زینے پھلانگتے ہوئے چاہے کامیابی کے آسمان کو چھو لیتا، وہ پھر بھی کسی امید سے اس کی جانب دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ وہ یہ کسی بھی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ ایسے منحوس شخص کا سایہ بھی اس کی بیٹی پر پڑے۔ حالانکہ صبا، اقتدار کی بھی بیٹی تھی لیکن سائرہ نے جس کسمپرسی میں اس کی پرورش کی تھی، اسے تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ کر کے پروان چڑھایا تھا اور اس دوران بے حس باپ نے کبھی بھولے سے بھی پلٹ کر ان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ ان حالات و واقعات کا تقاضا تھا کہ وہ اپنی یادداشت میں سے اقتدار حسین کا نام و نشان کھرچ ڈالے اور ــــــ اس نے واقعی ایسا ہی کیا تھا!

''یہ ہے ساری کہانی وکیل صاحب ــــــ!'' حمید اللہ نے بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''بتائیں، اس سلسلے میں، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''آپ قانون دان ہیں۔'' حمید اللہ نے بڑی رسانیت سے کہا۔ ''قانونی معاملات کو بڑی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ سائرہ اور اس کی بیٹی صبا کو ان کا حق مل جائے۔ انہوں نے گزشتہ بیس سال میں ان گنت تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ اقتدار حسین نے نہ صرف ایک عورت سے اس کا شوہر اور ایک بچی سے اس کا باپ چھین لیا تھا بلکہ اس کے ظالمانہ رویے نے ایک طویل عرصے تک انہیں سپردِ عذاب بھی کئے رکھا۔ اب اقتدار زندہ نہیں رہا۔ وہ لاکھوں بلکہ کروڑوں کی جائیداد اور کاروبار چھوڑ کر مرا ہے، اس کی تازہ ترین اور چوتھی بیوی ــــــ بلکہ چوتھی بیوہ، بلاشرکت غیرے اس کی تمام املاک پر قبضہ جما کر بیٹھ گئی ہے اور اس میں سے ایک سلائی یا سوئی بھی کسی کو دینے کی روادار نہیں۔ آپ قانون کا استعمال کر کے ایک یتیم بچی اور ایک بیوہ عورت کو ان کا جائز حق دلوا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کی فیس کے علاوہ جو بھی اخراجات ہوں گے وہ میں برداشت کرنے کو تیار ہوں۔''

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اگر یہ فرض کر لیا جاتا کہ حمید اللہ کی یہ تگ و دو صرف اور صرف اپنے بیٹے کو فائدہ پہنچانے کے لئے ہے تو بھی اس عمل کو غلط نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ اپنے مطلب کی خاطر ہی سہی، کسی کا بھلا کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ بات کو کہیں سے بھی گھمائیں، صبا کی زندگی سنورنے والی تھی۔

میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد اس سے پوچھا۔ ''کیا آپ نے اس سلسلے میں شیریں سے کوئی بات کی ہے؟''

''جی ہاں ــــــ میں اس سے ملاقات کر چکا ہوں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ ملاقات شیریں سے نہیں بلکہ اس کے ماموں سے سمجھ لیں۔ وہ دونوں موجود تھے لیکن شیریں نے ایک آدھ جملے کے سوا کچھ نہیں کہا، پورا وقت اس کا ماموں ہی چپڑ چپڑ بولتا رہا۔ وہ نہایت ہی چرب زبان اور کائیاں شخص ہے۔ شیریں بھی انتہائی بد دماغ اور مغرور عورت ثابت ہوئی۔ میں نے ان کے سامنے صورتِ حال کی وضاحت کرتے ہوئے درخواست کی کہ وہ صبا اور سائرہ کو ان کے جائز حق سے محروم نہ کریں۔ ان ماں بیٹی کی دکھ بھری داستان سننے کے بعد ان کا دل صرف اس حد تک پسیج سکا۔

''اگر آپ سمجھتے ہیں کہ وہ دونوں مظلوم ہیں تو ہم ہمدردی کے نام پر ان کی تھوڑی بہت مالی مدد کر سکتے ہیں۔'' شیریں کے چالاک ماموں نے کہا۔ ''میں اپنے ذاتی اکاؤنٹ سے انہیں پانچ دس ہزار روپے دے سکتا ہوں۔ باقی اقتدار حسین جو کچھ چھوڑ کر مرا ہے وہ تو سارا بے بی کا حق ہے۔''

بے بی سے اس کی مراد اس کی دلکش، مغرور بھانجی شیریں تھی۔ اس کی بات سن کر مجھے سخت غصہ آیا تاہم میں نے برداشت کا مظاہرہ کیا اور متحمل لہجے میں کہا۔

''میں آپ سے بھیک مانگنے نہیں آیا۔ جس طرح آپ کی بھانجی مرحوم کی بیوہ ہے بالکل اسی طرح سائرہ بھی اس کی بیوہ ہے۔ دونوں بیواؤں کو برابر حق ملنا چاہئے۔ آپ کو اس سلسلے میں خدا اور رسولؐ کے حکم کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔''

''برابری ــــــ مائی فُٹ!'' شیریں چیخ کر بولی پھر نفرت انگیز لہجے میں بولی۔ ''میں کسی سائرہ وائرہ کو نہیں جانتی۔ اقتدار نے کبھی اپنی کسی بیوی کا ذکر نہیں کیا۔'' وہ لمحے بھر کو رکی پھر ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے لگتا ہے، آپ کوئی فراڈ قسم کے آدمی ہیں۔ ہمیں بے وقوف بنا کر اقتدار کے ترکے سے کچھ ہتھیانا چاہتے ہیں۔''

بھانجی کے ان ریمارکس پر اس کا ماموں عقابی نظروں سے مجھے تاڑنے لگا پھر دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ ''آپ فوراً یہاں سے گو، وینٹ، گون ہو جائیں ــــــ ورنہ مجھے پولیس کو بلانا پڑے گا۔''

بات ختم کرتے ہی وہ ٹیلی فون کی جانب بڑھ گیا لیکن مجھے کسی بات کی پرواہ تھی اور نہ ہی پولیس وغیرہ کا خوف۔ اگر وہ پولیس کو بلا لیتا تو یہ اور بھی اچھا ہوتا۔ میں ایک سچائی کی انگلی تھام کر وہاں پہنچا تھا اس لئے مجھے کسی بات کا ڈر نہیں تھا لیکن شیریں کے ماموں کی دھمکی گیدڑ بھبکی ثابت ہوئی اور وہ ٹیلی فون کو چھوئے بغیر دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا، اس نے محض

مجھے ہراساں کرنے کے لئے یہ حرکت کی تھی۔

میں نے ماموں کونظر انداز کرتے ہوئے بھانجی سے کہا۔ ''شیریں صاحبہ! اگر مرحوم نے زندگی میں کبھی آپ سے اپنی پہلی بیوی کا ذکر نہیں کیا تو اس سے سائرہ بیگم کے وجود کی نفی نہیں ہو جاتی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تیئس چوبیس سال قبل مرحوم اقتدار حسین نے سائرہ بیگم سے پہلی شادی کی تھی اور صبا اس کی سگی بیٹی ہے۔'' میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر چبھتے ہوئے انداز میں اضافہ کیا۔

''آپ تو اقتدار حسین کی پہلی بیوی سے اپنی لاعلمی کا اظہار کر رہی ہیں اور خود کو مرحوم کی پہلی بیوی سمجھے بیٹھی ہیں۔ اگر آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس دوران دوسری اور تیسری بھی گزری ہیں تو پتہ نہیں، آپ کے دماغ کی کیا کیفیت ہوگی!''

''دوسری ـــــ تیسری ـــــ کیا مطلب ہے آپ کا؟'' شیریں جنگلی بلی کی مانند غرائی۔ ''یہ آپ مجھے کون سی فلمی کہانی سنا رہے ہیں!'' غصیلے تاثرات نے اس کے چہرے کو تمتما دیا تھا۔ وہ جتنی دلکش اور نظر فریب تھی، غصے کی حالت میں اتنی ہی زیادہ خوفناک نظر آنے لگتی تھی۔ اس کی شخصیت کی رنگینی، سنگینی میں بدل جاتی تھی۔ بہر حال، میں اس سے قطعی خوفزدہ نہیں ہوا۔

''یہ فلمی کہانی یا کسی ڈرامے کا سین نہیں ہے شیریں صاحبہ!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ ایک سفاک حقیقت ہے۔ سائرہ کے بعد مرحوم نے سلمیٰ نامی ایک مالدار بیوہ اور فہمیدہ نامی ایک اسٹیٹ ایجنٹ کی بیوہ سے بھی شادی کی تھی۔ فہمیدہ دوسری اور سلمیٰ مرحوم کی تیسری بیوی تھی۔ یہ دونوں خواتین اب مرحومہ ہو چکی ہیں۔ فار یور کائنڈ انفارمیشن ـــــ'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''شیریں صاحبہ! آپ مرحوم اقتدار حسین کی چوتھی بیوی تھیں!''

''میں اس فضولیات کو نہیں مانتی۔'' وہ بپھرے ہوئے انداز میں بولی۔ ''آپ خواہ مخواہ کی بکواس کر رہے ہیں۔''

''یہ سن کر مجھے غصہ تو بہت آیا۔'' حمید اللہ نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وکیل صاحب! میں نے حالات کا آئینہ دکھا کر ان دونوں ماموں بھانجی کو حقائق سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں انہیں سب کچھ سچ سچ بتا دیا تھا لیکن اس سنجیدہ گفتگو کا ایک لفظ بھی ان کے پلے نہ پڑا۔ میرے انکشافات پر بھانجی تلملا رہی تھی کہ ماموں نے حقارت آمیز انداز میں کہا۔

''آپ ہمیں سمجھانے کی بجائے جا کر اس سائرہ بیگم کو سمجھائیں۔'' اس کا لہجہ دھمکی بردار تھا۔ ''ہمیں اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ وہ اقتدار کی بیوی تھی یا نہیں۔ اسے یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ یہاں سے اسے کچھ ملنے والا نہیں۔'' وہ لمحہ بھر کو رکا پھر دوٹوک لہجے میں بولا۔ ''میں نے تھوڑی دیر پہلے پانچ دس ہزار روپے دینے کی جو پیشکش کی تھی، اب اسے واپس لیتا ہوں۔ آپ لوگ اس قابل نہیں ہو کہ ــــــ''

اس نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو مجھے بھی تاؤ آ گیا۔ میں نے اٹھتے ہوئے خاصے روکھے لہجے میں کہا۔ ''اگر آپ لوگوں نے اپنے رویے میں تبدیلی لا کر سائرہ کے معاملے کو سنجیدگی سے نہ لیا تو یہ قصہ گھر کی چار دیواری سے نکل کر عدالت تک بھی جا سکتا ہے۔''

''آپ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں یا کوتوالِ شہر کو دوڑائیں، ہمیں کوئی پرواہ نہیں۔'' ماموں نے فرعونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''ہم نے بہت تھانہ کچہری دیکھا ہے۔''

''ماموں بھانجی کے دوٹوک اور حتمی انکار نے مجھے پریشان کر دیا۔'' حمید اللہ نے بات کو سمیٹتے ہوئے بتایا۔ ''میں خلوصِ نیت سے سلمٰی اور صبا کی مدد کرنا چاہتا ہوں اس لئے موجودہ صورتِ حال سے مجھے فکر مند بھی ہونا چاہئے۔ میں نے اس الجھن کا ذکر منیر نظامی سے کیا۔ نظامی صاحب نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور مجھے آپ سے ملنے کا مشورہ دیا اور ــــــ اب میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہوں۔''

حمید اللہ نے گفتگو کو اختتام کی طرف گھما کر امید افزا نظر سے میری جانب دیکھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آپ نے جو حالات و واقعات بیان کئے ہیں اگر ان میں کوئی گڑبڑ نہیں تو صبا اور اس کی والدہ واقعی بے حد مظلوم اور محروم ہیں۔ قدم قدم پر ان کے ساتھ ناانصافی ہوتی رہی ہے۔ انہیں ان کا حق ضرور ملنا چاہئے۔''

وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''بس تو وکیل صاحب! آپ اس کیس کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ میں ہر قسم کے اخراجات اٹھانے کو تیار ہوں۔ آپ میرے بیان کی جیسے چاہیں تصدیق کر لیں میں کسی لالچ یا غرض کے لئے یہ کام نہیں کر رہا۔ ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ میرا بیٹا بینک میں اچھی پوسٹ پر کام کر رہا ہے۔'' اس نے گردن گھما کر اپنے پہلو میں بیٹھے وحید اللہ کی طرف دیکھا پھر میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں صرف اتنا چاہوں گا کہ ان ماں بیٹی کو انصاف مل جائے۔ وہ دونوں حالات کی چکی میں بہت پس چکیں۔ اب ان کے آرام و راحت کے دن ہیں۔ ان کا مجرم تو باقی نہیں رہا۔ اگر آپ اقتدار حسین کی

بیوہ شیریں کو قانون کی چکی میں پیس دیں تو یہ ایک طرح سے آپ کی بہت بڑی نیکی ہوگی۔"

"انصاف ملے گا ــــــ ضرور ملے گا۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "لیکن اس کیس کو لینے سے پہلے میں دو چیزوں کی تسلی کرنا چاہتا ہوں۔"

"کون سی دو چیزیں وکیل صاحب؟" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اس کی الجھن کو دور کرتے ہوہ کہا۔ "نمبر ایک یہ کہ میں سائرہ بیگم سے ایک بھرپور ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ یقیناً ہونا چاہئے کہ وہ بہ حیثیت مدعی اس کیس میں پوری طرح متحرک ہیں۔" میں لحہ بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور نمبر دو، سب سے اہم چیز یہ ہے کہ سائرہ بیگم کے پاس کوئی ایسا ثبوت ضرور ہونا چاہئے جس کی بناء پر وہ مرحوم اقتدار حسین کی بیوہ ہونے کا دعویٰ کر سکے۔"

حمید اللہ نے کہا۔ "وکیل صاحب! میں نے اس حوالے سے سائرہ بیگم سے تفصیلی بات کی تھی۔ یہ نکتہ میرے ذہن میں بھی تھا۔ آپ اس سلسلے میں مطمئن اور بے فکر ہو جائیں۔ سائرہ بیگم کے پاس نکاح نامے کا ایک پرت موجود ہے جس کی رو سے وہ خود کو مرحوم اقتدار کی بیوی ــــــ یا بیوہ ہونا ثابت کر سکتی ہیں اور جہاں تک ــــــ"

وہ سانس لینے کے لئے متوقف ہوا پھر ادھورے جملے کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔ "سائرہ بیگم سے ملاقات کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں آپ کو تھوڑی زحمت کرنا ہوگی۔ سائرہ کی طبیعت ان دنوں ٹھیک نہیں۔ وہ آپ کے دفتر نہیں آ سکیں گی۔ اگر آپ گھر پر ان سے ملاقات کے لئے وقت نکال سکیں تو آپ کی نوازش ہوگی۔"

حمید اللہ نے اتنے مخلصانہ انداز میں یہ درخواست کی کہ میں انکار نہ کر سکا۔ ویسے بھی یہ میرے لئے کچھ مشکل نہیں تھا۔ مجھے اپنے پیشے کے تقاضے نبھاتے ہوئے بعض اوقات ایسا بھی کرنا پڑتا تھا۔

میں نے حمید اللہ سے سائرہ بیگم کے گھر کا ایڈریس معلوم کیا اور آئندہ روز گھر جا کر اس سے ملاقات کرنے کا وعدہ کر لیا۔ پھر دو چار رسمی باتوں کے بعد ان باپ بیٹے کو اپنے دفتر سے رخصت کر دیا۔

❁ ❁ ❁

سائرہ بیگم کی رہائش پی آئی بی کے علاقے میں تھی۔ وہ دو کمروں کے ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہتی تھی۔ اس کا باپ فرید الدین اب بقید حیات نہیں تھا۔ کئی سال پہلے وہ بیٹی اور نواسی کو اس دنیا میں چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملا تھا۔

میری دستک کے جواب میں جس شخص نے دروازہ کھولا وہ میرے لئے نا آشنا تھا۔آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے، میں کس کا ذکر کر رہا ہوں۔ جی ہاں، وہ سائرہ کا ہونے والا سمدھی حمید اللہ تھا۔

''آیئے، آیئے وکیل صاحب!'' وہ میرے لئے راستہ چھوڑتے ہوئے بولا۔''ہم آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے۔''

حمید اللہ کو سائرہ کے گھر میں دیکھ کر مجھے شبہ ہوا کہ کہیں اس کا بیٹا وحید اللہ بھی تو یہاں موجود نہیں۔ بعد ازاں میرا یہ شبہ غلط ثابت ہوا۔ میں نے گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔

''میں نے اپنے آنے کے لئے کوئی خاص وقت تو نہیں بتایا تھا۔لگتا ہے آپ صبح ہی سے یہاں بیٹھے میری آمد کے منتظر ہیں۔''

''اب ایسی بھی بات نہیں۔'' وہ خجالت آمیز انداز میں بولا۔''میں تھوڑی دیر پہلے ہی آیا ہوں۔کل آپ سے ملاقات کے بعد میں بھی یہاں آیا تھا اور سائرہ بہن کو بتایا تھا کہ آپ نے ان کا کیس لینے کا وعدہ کرلیا ہے اور ـــــ یہ کہ آج آپ ان سے ملنے آئیں گے۔''

وہ لمحہ بھر کو سانس لینے کی غرض سے رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔''مجھے یہ تو معلوم ہے، صبح کے وقت آپ عدالت میں مصروف ہوتے ہیں لٰہذا زیادہ امید اسی وقت آنے کی تھی۔''

اس وضاحت کے ساتھ ہی وہ مجھے گھر کے اندرونی حصے میں لے گیا۔جیسا کہ میں بتا چکا ہوں وہ دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا کوارٹر تھا جس میں سے ایک کمرے کو ڈرائنگ روم بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔حمید اللہ نے مجھے اسی کمرے میں لا کر بٹھایا اور یہ کہہ کر ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔

''میں سائرہ بیگم کو آپ کی آمد کے بارے میں بتا کر آتا ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد میں تنقیدی نظر سے اس ڈرائنگ روم نما کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اس کمرے کو آراستہ کرنے کے لئے اگرچہ سستی اور کم قیمت چیزوں کو استعمال کیا گیا تھا تاہم اس سجاوٹ میں ایک خاص قسم کا حُسن اور آرٹ پایا جاتا تھا جو دیکھنے والی آنکھ کو متاثر کئے بنا نہیں رہتا تھا۔اس گھر میں صرف دو عورتیں رہتی تھیں۔ ظاہر ہے، یہ انہی میں سے ایک کے ذوق کا شاہکار تھا۔

مجھے وہاں بیٹھے ہوئے بہ مشکل پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ حمید اللہ ایک مرتبہ پھر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔اس مرتبہ اس کے ساتھ ایک معمر خاتون بھی تھیں۔اس بات میں کسی شک و

شبے کی گنجائش نہیں کہ وہ سائرہ بیگم تھی۔ سائرہ کی عمر تینتالیس چھیالیس سال رہی ہوگی تاہم مخدوش صحت کی وجہ سے وہ پچاس سے بالا نظر آتی تھی۔ اس کے نقوش اور چہرے کے خال و خط سے اندازہ ہوتا تھا کہ جوانی میں نہایت ہی حسین و جمیل رہی ہوگی۔ بہرحال، زمانے کی سختیوں اور نامساعد حالات کی چیرہ دستیوں نے اسے وقت سے بہت پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔

ڈرائنگ روم میں آنے کے بعد سائرہ بیگم نے مجھے سلام کیا اور بہ آہستگی ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ حمید اللہ نے ایک کرسی سنبھال لی۔ میں نے سائرہ کے سلام کا جواب دیا اور سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ حمید اللہ نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''سائرہ بہن! یہ مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہیں۔ نظامی صاحب نے ان کی بہت تعریف کی ہے۔ انشاء اللہ یہ اس کیس کو جیت کر دکھائیں گے۔''

سائرہ بیگم نے امید بھری نگاہ سے میری طرف دیکھا اور ڈائریکٹ ہوتی ہوئی بولی۔ ''بیگ صاحب! میں نے تو ساری زندگی اپنی مدد آپ کے تحت گزار دی ہے۔ کبھی ایک پیسے کی مدد کے لئے اقتدار حسین کی جانب نہیں دیکھا ـــــ اور نہ ہی اب میرا ایسا کوئی ارادہ تھا لیکن ـــــ'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئی پھر سانس درست کرتے ہوئے بولی۔

''حمید بھائی کا اصرار ہے کہ چلیں، اقتدار کی زندگی میں نہ سہی مگر اب ہمیں اپنے حق کے حصول کے لئے ضرور فائٹ کرنا چاہئے۔ یہ کہتے ہیں، اپنے لئے نہ سہی لیکن اپنی بیٹی کی خاطر میں ضرور اس مہم میں حصہ لوں۔ یہ بات میری سمجھ میں آ گئی ہے لہٰذا اس معاملے کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔''

میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''دیکھیں سائرہ بیگم! وکیل ایک معمار کی طرح ہوتا ہے۔ وہ صرف تعمیر کرتا ہے اور اس تعمیر کے لئے جگہ کی فراہمی کی ذمے داری مدعی پر عائد ہوتی ہے۔ میں آپ لوگوں کا کیس لڑنے کو تیار ہوں اور اس عمارت کی تعمیر کے لئے پلاٹ آپ مجھے فراہم کریں گی۔''

''میں آپ کی بات کچھ کچھ سمجھ رہی ہوں۔'' وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ ''تھوڑی وضاحت کر دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔''

میں نے اس کی فرمائش پوری کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ اور آپ کی بیٹی اس کیس میں مدعیان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ قانونی ضروریات کے مطابق آپ دونوں کو مجھ سے پورا پورا تعاون کرنا ہوگا۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ اس سلسلے میں آپ کے عدالت کے بھی چکر لگیں گے۔ آپ کو ہر بات کے لئے پہلے سے ذہنی طور پر تیار رہنا ہوگا۔''

''ظاہر ہے ـــــ'' اس نے بڑی سادگی اور دانش مندانہ بات کی۔ ''ہم کیس عدالت میں کر رہے ہیں تو گواہی اور پیروی کے لئے وہاں کے چکر تو لگانا ہی پڑیں گے۔''

''حمید اللہ صاحب نے مجھے بتایا ہے کہ لگ بھگ بیس سال پہلے مرحوم اقتدار حسین نے آپ کو گھر سے نکال دیا تھا۔'' میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یعنی آپ دونوں میں علیحدگی ہوئی تھی، طلاق نہیں۔''

''ہاں، یہ بات بالکل درست ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے نحیف سے لہجے میں بولی۔ ''میں قانون اور شریعت کی رو سے اقتدار کی آخری سانس تک اس کی بیوی رہی ہوں ـــــ اور اب بیوہ ہوں۔ میں نے نکاح نامے کو بہت ہی حفاظت سے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔''

''یہ آپ نے نہایت ہی عقل مندی کا کام کیا ہے۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''یہی نکاح نامہ ثابت کرے گا کہ آپ اقتدار حسین کی بیوی ہیں ـــــ بلکہ بیوہ ہیں۔ ایک بیوی ہی شوہر کے انتقال کے بعد بیوہ کہلاتی ہے۔ کسی مطلقہ عورت کو یہ استحقاق حاصل نہیں۔'' میں لمحے بھر کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ مجھے وہ نکاح نامہ دکھا سکتی ہیں جسے تیئس چوبیس سال سے آپ نے حفاظت سے سنبھال کر رکھا ہے؟''

''کیوں نہیں ـــــ ضرور!'' وہ بڑی رسان سے بولی پھر اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اگر ڈھنگ سے لڑا جائے تو ہمارے کیس میں بڑی جان ہے۔ میرے پاس تو اس بات کا بھی بڑا ٹھوس ثبوت موجود ہے کہ صبا، اقتدار حسین کی بیٹی ہے۔ میں نے اپنے نکاح نامے کی طرح اس کا برتھ سرٹیفکیٹ بھی سنبھال کر رکھا ہوا ہے جہاں ولدیت کے خانے میں اقتدار حسین کا نام درج ہے۔ صبا چونکہ ہسپتال میں پیدا ہوئی تھی اس لئے ڈیلیوری ڈاکٹر اور میڈیکل آفیسر کے دستخط بھی ثبت ہیں۔ اس سرٹیفکیٹ میں اقتدار کے اور بھی بہت سے کوائف درج ہیں مثلاً گھر کا ایڈریس، اس کی تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش وغیرہ۔ ان حقائق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''آپ نکاح نامہ کے علاوہ اپنی بیٹی کا برتھ سرٹیفکیٹ بھی مجھے دکھائیں۔ یہ تو آپ نے بہت کام کی بات بتائی ہے۔''

حمید اللہ بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ سائرہ گھر کے اندرونی حصے میں جانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ شاید حمید اللہ کا بھی یہی خیال تھا لیکن سائرہ نے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔

''حمید بھائی! آپ بیگ صاحب کو کمپنی دیں۔ میں یہ دستاویزات لے کر آتی ہوں۔'' لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ سجاتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''اب میں

اتنی بھی کمزور نہیں ہوں کہ گھر میں چل پھر بھی نہ سکوں۔''

حمید اللہ اپنی جگہ پر کھڑا رہ گیا اور سائرہ بیگم نے دروازے کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ ''ہاں ــــــ ہاں ــــــ آؤ بیٹی!'' سائرہ نے یہ کہتے ہوئے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا۔ اگلے ہی لمحے ایک لڑکی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔

سائرہ بیگم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب! یہ میری بیٹی صبا ہے۔'' پھر وہ صبا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''بیٹی! تم انکل حمید اور وکیل صاحب کے لئے چائے بناؤ، میں ابھی آتی ہوں۔''

سائرہ بیگم اپنی بیٹی کو یہ ہدایت دینے کے بعد ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔ صبا نے چائے اور دیگر لوازمات سے سجی ٹرے کو سینٹر ٹیبل پر رکھا پھر ضروری استفسار کے بعد ہم دونوں کے لئے چائے بنا دی۔ اس کے بعد وہ وہاں سے جانے کے ارادے سے دروازے کی طرف بڑھی تو حمید اللہ نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

''بیٹی! بیٹھ جاؤ۔ وکیل صاحب سے ہونے والی اس اہم ملاقات میں تمہاری موجودگی ضروری ہے۔''

وہ بغیر کسی حیل و حجت کے ایک کرسی پر ٹِک گئی۔

حمید اللہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے صبا سے کہا۔ ''بیٹی! مرزا امجد بیگ صاحب بہت ہی تجربہ کار اور قابل وکیل ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے ان کی قانونی کوششوں سے تم اپنے باپ کی اور سائرہ بہن اپنے شوہر کی جائیداد میں سے اپنا حصہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔''

صبا نے گردن اٹھا کر اُداس سی نظر سے مجھے دیکھا پھر خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔ ''ہمیں جس چیز کی اشد ضرورت تھی، زندگی بھر اس سے تو محروم ہی رہے۔ کیا مال و دولت اور زمین و جائیداد اس انمول شے کا نعم البدل ہو سکتے ہیں؟''

صبا نے ایک تیکھا اور فکر انگیز سوال کیا تھا۔ ظاہر ہے جس کا جواب یہی ہو سکتا تھا ــــــ نہیں! اس کا واضح اشارہ مرحوم اقتدار حسین کی طرف تھا۔ اگر ایک بچی کو زندگی بھر اس کا باپ نہ ملے، وہ پدرانہ شفقت سے محروم رہ کر جوان ہو جائے تو اس کے کرب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ صبا کے الفاظ سے کچھ ایسی ہی نوعیت کا کرب جھلکتا تھا۔ بات ختم کرتے ہی اس نے دوبارہ گردن جھکا لی تھی۔

میں گہری نظر سے صبا کا جائزہ لینے لگا۔ وہ ایک کم گو، حساس، سنجیدہ اور افسردہ لڑکی تھی۔

ممکن ہے اس کی افسردگی اور سنجیدگی ان ستم ظریف حالات کا نتیجہ ہو جن سے وہ ماں بیٹی ایک طویل عرصے سے نبرد آزما تھیں۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ بائیس اور تئیس کے درمیان قائم کیا۔ وہ سانولی رنگت کی ایک پُرکشش لڑکی تھی۔ میں نے سائرہ بیگم کو بھی دیکھا تھا۔ اس کا رنگ صاف شفاف تھا۔ معلوم ہوتا تھا، صبا نے نین نقش ماں سے لئے ہیں اور رنگت وغیرہ باپ کی طرف سے آئی ہے۔ حمید اللہ کی زبانی مجھے پتہ چلا تھا، اقتدار حسین معمولی نقوش کا حامل ایک سانولا شخص تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد سائرہ بیگم دوبارہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں اہم دستاویزات اٹھا رکھی تھیں ــــــ والدہ کی آمد پر صبا خاموشی کے ساتھ کرسی سے اٹھی اور وہاں سے رخصت ہوگئی۔ اس مرتبہ سائرہ بیگم یا حمید اللہ نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

میرے ہاتھ میں موجود چائے کی پیالی قریب الختم تھی۔ میں نے ایک بڑا سا گھونٹ لے کر پیالی کو میز پر رکھ دیا پھر سائرہ بیگم کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ’’لائیں، مجھے دکھائیں۔‘‘

اس نے بہ آہستگی وہ دستاویزات میرے ہاتھ میں دے دیں اور واپس اسی صوفے پر جا بیٹھی جہاں سے اٹھ کر وہ یہ کاغذات لینے گئی تھی۔

میں نے خاکی لفافے میں سے وہ دونوں چیزیں برآمد کر لیں۔ سب سے اوپر صبا کا برتھ سرٹیفکیٹ تھا۔ میں نے اس کا دوطرفہ جائزہ لیا۔ صبا ایک پرائیویٹ ہسپتال میں پیدا ہوئی تھی۔ اس ہسپتال کی اچھی خاصی شہرت تھی۔ ایسے ہسپتال اپنے ریکارڈ کو بڑے طریقے سلیقے سے مینیج کر کے رکھتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ اس سرٹیفکیٹ کو دیکھتے ہی ہو جاتا تھا۔ سامنے والی سائیڈ میں بچی کا نام مع ولدیت، ٹائم آف برتھ، پلیس آف برتھ اور ڈیٹ آف برتھ درج تھا۔ نیچے بچی کے والدین کا مکمل ایڈریس بھی موجود تھا۔ سرٹیفکیٹ کے عقبی جانب بچی کی ماں اور باپ سے متعلق کوائف درج تھے۔ ان کی تواریخ پیدائش، اضلاع پیدائش اور تعلیمی معیار وغیرہ۔ اس کے نیچے بچی کے پاؤں کا عکس لیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں ڈیلیوری ڈاکٹر اور میڈیکل کے دستخط بھی موجود تھے اور ہسپتال کی اُبھری ہوئی مہر بھی اس پر بنی ہوئی تھی۔ مذکورہ برتھ سرٹیفکیٹ سے ثابت ہوتا تھا کہ صبا، اقتدار حسین کی بیٹی ہے۔ وہی اقتدار حسین جو تازہ تازہ اللہ کو پیارا ہوا ہے اور ــــــ جو اپنے پیچھے لاکھوں کی پراپرٹی چھوڑ کر گیا ہے۔

سائرہ بیگم کا نکاح نامہ بھی اپنی جگہ ٹھوس اور مکمل تھا۔ وہ نکاح نامے کا وہ پرت تھا جو لڑکی کے ریکارڈ کے لئے بطور ثبوت اس کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ اس دستاویز کے مطابق شادی کے وقت سائرہ بنت فرید الدین کی عمر بائیس سال تھی جب کہ مرحوم اقتدار حسین ولد افتخار حسین

بتیس سال کا تھا۔ نکاح کی تاریخ چوبیس سال پہلے کی تھی۔ مہر پانچ ہزار عند الطلب لکھا گیا تھا۔ باقی مندرجات بھی مکمل اور درست تھے۔ میں نے نکاح کے گواہان کے بارے میں سائرہ بیگم سے استفسار کیا تو پتہ چلا ان افراد میں سے ایک زندہ ہے۔ اسی طرح نکاح خوان بھی بقید حیات تھا اور خاصا ضعیف ہو چکا تھا۔ نکاح نامے کے اختتام پر نکاح خواں اور نکاح رجسٹرار کے دستخط مع مہر موجود تھے۔ یہ نکاح نامہ بطور ثبوت اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ عدالت اس کو چیلنج نہیں کر سکتی تھی۔ بالفرض اگر ایسی کوئی صورتِ حال پیدا ہو بھی جاتی تو نکاح کے گواہ سلیمان شاہ اور نکاح خواں سید قاضی عبدالکریم کو شہادت کے لئے عدالت تک لایا جا سکتا تھا۔

قاضی عبدالکریم کا تعلق پی آئی بی کالونی ہی سے تھا جب کہ سلیمان شاہ لیاقت آباد المعروف بہ لالوکھیت کا رہنے والا تھا۔ سائرہ بیگم کی یہ تصدیق میرے لئے خاصی تقویت کا باعث تھی کہ مذکورہ دونوں افراد ابھی زندہ تھے۔

میں نے دونوں دستاویزات کو خاکی لفافے کے اندر ڈالا اور اسے میز پر رکھ دیا پھر سائرہ بیگم کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''یہ دونوں چیزیں میں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ ان کی فوٹو کاپیاں بعض فائلوں میں لگیں گی۔ بعد میں، میں انہیں آپ کو واپس کر دوں گا۔ اب اگر آپ واقعی یہ کیس مجھے دینا چاہتی ہیں تو اپنے فیصلے سے آگاہ کریں۔''

''فیصلہ تو میں نے یہی کیا ہے کہ آپ اس کیس کو لڑیں۔'' وہ پختہ لہجے میں بولی۔ ''حمید بھائی کی بات میری سمجھ میں آ رہی ہے۔ مجھے اپنے لئے کچھ نہیں چاہئے۔ پتہ نہیں اور کتنے دن کی زندگی باقی ہے۔ اگر اس قانونی چارہ جوئی سے میری بیٹی صبا کا کچھ بھلا ہو جاتا ہے تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔''

میں نے تیقن سے کہا۔ ''انشاء اللہ! آپ کی بیٹی کا ضرور بھلا ہوگا۔ لیکن ایک بات آپ کو ذہن میں رکھنا ہوگی کہ اس قسم کی جائیداد کی تقسیم وغیرہ کے مقدمات بڑی سست رفتاری سے آگے بڑھتے ہیں بلکہ یوں سمجھیں کہ رینگ رینگ کر چلتے ہیں۔ اس لئے آپ کو صبر و برداشت سے کام لینا ہوگا اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا یہ صبر و برداشت ضائع یا بے کار نہیں جائے گا۔''

سائرہ بیگم کے ہونٹوں پر خفیف سی معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں اچھی طرح جانتی ہوں، صبر و تحمل اور برداشت جیسے الفاظ کا کیا مفہوم ہے۔''

اس عورت نے کسی سہارے کے بغیر بیس سال اس طرح گزارے تھے کہ ایک بچی کو پڑھا لکھا کر اور تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ کر کے اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ نہ صرف اپنے

آپ کی ہو گئی تھی بلکہ اپنے ساتھ مزید دو تین افراد کو بھی پال سکتی تھی اور اس کوشش میں سائرہ بیگم نے زمانے کی جو سختیاں برداشت کی تھیں، جن جن مظالم پر صبر کیا تھا اور جس جس اشتعال انگیز صورت حال میں تحمل اور بردباری سے کام لیا تھا اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ان حالات و واقعات کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

حمید اللہ نے بڑی رسانیت سے کہا۔ ''بیگ صاحب! ہمیں کسی بات کی جلدی نہیں ہے۔ آپ اپنے انداز میں اور موقع محل کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے اس کیس کو ہینڈل کریں۔ ہم اس سلسلے میں آپ کو کسی بھی مرحلے پر تنگ یا پریشان نہیں کریں گے۔ آپ ہماری طرف سے فری ہینڈ سمجھیں۔''

میں نے سوالیہ نگاہ سے سائرہ بیگم کی جانب دیکھا۔ حمید اللہ اس کیس کے حوالے سے بہرحال ایک غیر متعلق شخص تھا۔ میں اس کی ایما یا اجازت پر کوئی عملی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ سائرہ بیگم نے میری نگاہ کا مطلب سمجھ لیا اور حمید اللہ کی بات کی تائید کرتے ہوئے بولی۔

''حمید بھائی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیگ صاحب!''

میں نے مطمئن ہونے کے بعد اپنا بریف کیس کھول لیا اور اس میں سے وکالت نامے کے علاوہ چند دیگر کاغذات نکال کر ان پر سائرہ بیگم کے دستخط لے لئے۔ ایک دو جگہ پر میں نے صبا سے بھی دستخط کروائے۔ پھر ان تمام کاغذات کو سمیٹ کر میں نے اپنے بریف کیس میں رکھ لیا۔ ان میں وہ براؤن لفافہ بھی شامل تھا جس کے اندر سائرہ بیگم کا نکاح نامہ اور صبا کا برتھ سرٹیفکیٹ رکھا ہوا تھا۔

اس کے بعد فیس وغیرہ کا معاملہ ٹھہرایا گیا جس میں کسی قسم کی کوئی اختلافی بات ہوئی اور نہ ہی کوئی دوسری مشکل پیش آئی۔ میں نے اپنی فیس وصول کر کے انہیں رسید دے دی۔

ان امور سے نمٹنے کے بعد میں نے سائرہ کی کہانی اس کی زبانی سنی۔ اس دردبھری کہانی میں ایسی خاص بات نہیں تھی جسے میں آپ کے سامنے بیان کروں۔ حمید اللہ نے دفتر میں گزشتہ روز مجھے سائرہ بیگم کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، سائرہ کا بیان اسی کا احاطہ کرتا تھا۔

میں سائرہ بیگم اور حمید اللہ کو کامیابی کا یقین دلا کر وہاں سے اٹھ گیا۔ حمید اللہ باہر مجھے گاڑی تک چھوڑنے آیا۔ وہ خاصا پُر اُمید دکھائی دیتا تھا۔ میں گاڑی میں بیٹھنے لگا تو اس نے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! اس کیس کے بارے میں آپ کی ماہرانہ رائے کیا ہے؟''

''میرے خیال اور رائے میں ہم یہ کیس جیت جائیں گے لیکن ——''

میں نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ تقریباً تڑپ کر بولا۔ ''لیکن کیا بیگ

صاحب؟''

''لیکن یہ کہ ـــــــ ہمیں اس سلسلے میں مل جل کر کوشش کرنا ہوگی۔''

''میں آپ سے ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار ہوں۔''

''تو کل سہ پہر میں آپ میرے دفتر آ جائیں۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے تعاون کے لئے میں کوئی عملی کام نکالتا ہوں۔''

''ضرور ـــــــ ضرور ـــــــ'' وہ گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

میں پنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہوگیا۔

❁ ❁ ❁

آئندہ روز حمید اللہ حسب وعدہ سہ پہر چار بجے میرے دفتر میں موجود تھا۔ اس دن کلائنٹس کا زیادہ رش نہیں تھا اس لئے میں نے فوراً اسے اپنے پاس بلا لیا۔ آج وہ اکیلا ہی آیا تھا۔ وحید اللہ اس کے ساتھ نہیں تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔ ''میں آ گیا ہوں بیگ صاحب! آپ بتائیں، کون سا کام میرے ذمے لگانا ہے؟''

''کام خاصا دوڑ دھوپ کا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر آپ واقعی اپنی ہونے والی سمدھن کی مدد کرنے جا رہے ہیں تو یہ زحمت آپ کو اٹھانا ہی ہوگی۔''

''میں اس نیک کام کے لئے ہر زحمت اٹھانے کو تیار ہوں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

میں نے سوچنے والے انداز میں تھوڑا توقف کیا پھر اسے تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ''سب سے پہلے تو آپ جا کر [illegible] شاہ اور قاضی عبدالکریم سے ملاقات کریں۔ انہیں موجودہ صورتِ حال کے بارے میں [illegible] اس بات کے لئے ذہنی طور پر تیار کرنے کی کوشش کریں کہ اگر ضرورت پیش آئی تو انہیں حق کی سربلندی کے لئے گواہی دینے عدالت تک جانا ہوگا۔ اگر آسانی سے یہ بات ان کی سمجھ میں آ جائے تو ٹھیک ہے ورنہ آپ انہیں میرے پاس لے آئیں، تکنیکی اُونچ نیچ میں انہیں سمجھا دوں گا۔''

میں سانس ہموار کرنے کی غرض سے لمحہ بھر کو متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کام سے فارغ ہونے کے بعد آپ ماموں بھانجی کا رخ کریں گے۔ آپ ایک مرتبہ ان کرداروں سے ناکام ملاقات کر چکے ہیں لہٰذا انہیں براہِ راست ٹچ کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ خفیہ طور پر ان کے بارے میں معلومات جمع کریں گے۔ علاوہ ازیں آپ کو مرحوم کی جائیداد اور کاروبار کو بھی اسٹیمیٹ کرنا ہے۔ آپ ایک معروف بینک کے آڈٹ ڈیپارٹمنٹ میں

طویل عرصہ کام کر چکے ہیں۔ اس شعبے میں آپ کے اچھے خاصے لنکس ہوں گے۔ اس سلسلے میں آپ منیر نظامی سے بھی مدد لے سکتے ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مرحوم اقتدار حسین اپنے پیچھے کیا چھوڑ کر مرا ہے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد ہی میں سائرہ بیگم اور صبا کو ان کا جائز حق دلوا سکتا ہوں۔''

حمید اللہ چند لمحات تک سوچنے والے انداز میں مجھے دیکھتا رہا پھر حتمی لہجے میں بولا۔ ''میں اس ذمے داری کو یقیناً پورا کروں گا لیکن اس کام کے لئے کچھ وقت درکار ہوگا۔''

''مثلاً ـــــ آپ کتنا وقت چاہتے ہیں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولا۔ ''کم از کم ایک ہفتہ۔''

''میں آپ کو دس دن دیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''گیارہویں دن اسی وقت آپ یہ کام کر کے میرے پاس آ جائیں۔ پھر ہم آپ کی حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں آئندہ کے لئے لائحہ عمل تیار کرلیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔ ''بیگ صاحب! اس عرصے کے دوران آپ کیا کریں گے؟''

میں نے کہا۔ ''اس دوران میں کیس تیار کرلوں گا۔ میں اس مسئلے کو دو مراحل میں حل کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔''

''کون سے دو مراحل؟'' اس نے اُلجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

میں نے بتایا۔ ''پہلے مرحلے میں، میں مرحوم اقتدار حسین کی آخری اور چھوٹی بیوہ شیریں عرف بے بی کو اپنی طرف سے ایک لیگل نوٹس بھیجوں گا جس میں مرحوم کی پہلی بیوی سائرہ بیگم اور اس کی بیٹی صبا کا تفصیلی ذکر ہوگا۔ میں سائرہ بیگم کے وکیل کی حیثیت سے اسے دعوت دوں گا کہ وہ میرے دفتر میں آ کر مصالحت اور رواداری کی کوئی راہ نکالے بصورتِ دیگر یہ کیس قانونی چارہ جوئی کے لئے حوالۂ عدالت کر دیا جائے گا۔'' میں تھوڑی دیر کے لئے متوقف ہوا پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میرا یہ تجربہ ہے کہ اس قسم کے نوٹس پر مخالف پارٹی جواباً اپروچ ضرور کرتی ہے اور اسّی فیصد کیسز میں مصالحت ہو جاتی ہے۔ اس ترکیب کو آزمانے میں کوئی قباحت بھی نہیں۔''

وہ بے یقینی کے سے انداز میں بولا۔ ''واقعی، اس ترکیب کو آزمانے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی اور نہ ہی مجھے آپ کے تجربے پر کوئی شک ہے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں، میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ ماموں بھانجی اس داؤ میں آئیں گے نہیں۔''

''آپ کو یہ احساس اس لئے ہے کہ آپ ان سے مذاکرات میں ناکام رہے تھے۔'' میں نے حقیقت بیانی سے کام لیتے ہوئے کہا۔لیکن اب صورتِ حال مختلف ہوگی۔''

اس نے زہر خند لہجے میں کہا۔''میرا تجربہ یہ ہے کہ وہ دونوں انتہائی خبیث اور شیطان ہیں۔''

''وہ کتنے بھی تیز وطرار اور عیار و مکار کیوں نہ ہوں مگر سائرہ بیگم کے وکیل کے نوٹس کو لائٹ نہیں لے سکتے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔''انہیں ہر صورت میں مجھ سے ملاقات کے لئے یہاں آنا ہوگا ـــــ اور جب وہ دونوں یا صرف شیریں یہاں آجاتی ہے تو پھر اسے قابو کرنا میرا کام ہوگا۔''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور جرح کرنے والے انداز میں بولا۔''ٹھیک ہے ـــــ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو اس سے اچھی کوئی بات نہیں۔لیکن بالفرض، اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر دوسری صورت کیا ہوگی؟''

''دوسری صورت میں مجھے مرحوم اقتدار حسین کی جائیداد وغیرہ کے سلسلے میں عدالت سے حکم امتناعی حاصل کرنا ہوگا اور یہ کام میں دوسرے کام سے پہلے کروں گا۔یعنی جب تک شیریں سے یہاں میری ملاقات ہوگی اس وقت تک میں عدالت سے حکم امتناعی حاصل کر چکا ہوں گا جس کی رو سے شیریں اور اس کا ماموں، مرحوم اقتدار حسین کی چھوڑی ہوئی جائیداد منقولہ وغیر منقولہ کو کسی بھی صورت فروخت نہیں کرسکیں گے۔نیز جب آپ مجھے متذکرہ بالا معلومات فراہم کریں گے تو ان بینکوں اور مالیاتی اداروں کو بھی لیگل نوٹس بھجوا دیا جائے گا جن کے ساتھ مرحوم کا کسی بھی نوعیت کا لین دین تھا۔ضرورت پیش آئی تو یہ نوٹس اخبارات میں بھی شائع کروا دیا جائے گا۔آپ فکر نہ کریں، میں شیریں کو راہِ راست پر لانے کا بڑا معقول بندوبست کروں گا۔''

وہ مطمئن ہوگیا اور متشکرانہ لہجے میں بولا۔''آپ قانون دان ہیں۔اس بازیگری کو آپ ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔میں تو صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ سائرہ بہن اور اس کی بیٹی کو ان کا جائز حق ضرور مل جائے۔''

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔'' میں نے پورے اعتماد سے کہا۔''اگر شرافت اور مصالحت کی زبان بے بی کی سمجھ میں نہ آئی تو میں عدالت میں اسے ایسا رگڑا دوں گا کہ نانی دادی خواب میں آجائیں گی۔''

حمید اللہ نے جلد از جلد اپنی ذمے داری نبھانے کا وعدہ کیا اور سلام کر کے میرے دفتر سے رخصت ہوگیا۔اس کے جانے کے بعد میں نے اس کیس کے عواقب و جوانب پر تھوڑی دیر غور

کیا اور مطمئن ہونے کے بعد اپنے دیگر کاموں میں مصروف ہو گیا۔

حمید اللہ کو میں نے جو کام سونپے تھے ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اس نے ایک ہفتے کی مہلت مانگی تھی اور میں نے اس کی سہولت اور آسانی کے لئے اسے دس دن دے دیئے تھے مگر وہ پانچویں روز ہی میرے دفتر میں نمودار ہوا اور اس وقت وہ میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھا۔ ''حمید اللہ! خیریت تو ہے نا؟''

''بالکل خیریت ہے۔'' وہ جوش بھرے لہجے میں بولا۔ ''بلکہ کچھ زیادہ ہی خیریت ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے سلیمان شاہ اور قاضی عبدالکریم کو عدالت میں گواہی دینے کے لئے راضی کر لیا ہے۔ قاضی صاحب بڑے ہی ہمدرد اور نیک دل انسان ہیں۔ انہوں نے اپنی یادداشت پر زور دے کر اور کچھ پرانے رجسٹرز کھکھوڑ کر تسلی کر لی ہے کہ سائرہ بیگم اور مرحوم اقتدار حسین کا نکاح انہی کے ہاتھوں سے ہوا تھا۔۔۔۔۔ انہیں سائرہ کی مصیبت زدہ زندگی کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ میری زبانی اس کا احوالِ بے حال سن کر وہ آبدیدہ ہو گئے اور بڑے مضبوط لہجے میں مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اس دنیا کی عدالت تو رہی ایک طرف، وہ قادرِ مطلق کی عدالت میں بھی کسی مظلوم کے حق میں گواہی دینے کو ہر وقت تیار ہیں۔۔۔۔۔ کچھ اسی قسم کے عزائم کا اظہار سلیمان شاہ نے بھی کیا ہے۔ دونوں کا کہنا ہے کہ ہم جب بھی انہیں عدالت میں چلنے کو کہیں گے، وہ اسی وقت ہمارے ساتھ چل پڑیں گے۔''

''ویری گڈ!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''اور شیریں والے معاملے کا کیا رہا؟''

''اس سلسلے میں، میں نے تمام ضروری معلومات حاصل کر لی ہیں۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''شیریں کا اس دنیا میں عیار ماموں کے سوا اور کوئی بھی نہیں ہے۔ وہ بہت چھوٹی تھی کہ اس کے والدین کا یکے بعد دیگرے انتقال ہو گیا۔ دس سال کی عمر سے ماموں ہی نے اس کی پرورش کی ہے۔ اس پھڈے باز ماموں کا نام نجیب خان ہے۔ جب شیریں کی شادی ہوئی تو نجیب خان نے خود کو اس کا باپ ظاہر کیا تھا۔ آخری سانس تک اقتدار حسین یہی سمجھتا رہا کہ نجیب خان اس کا سسر ہے۔ یہ شادی چونکہ محدود پیمانے پر اور نہایت ہی سادگی سے ہوئی تھی اس لئے بھی ''ماموں بھانجی'' کا راز کھل نہ سکا۔ اقتدار حسین اور اس کی طرف سے شادی میں شامل ہونے والے افراد میں سے کوئی بھی ذاتی طور پر انہیں نہیں جانتا تھا۔ لہٰذا یہ معاملہ نبھ گیا۔ بہر حال، یہ شادی صرف ایک سال ہی کی ہوئی تھی کہ اقتدار حسین کا انتقال ہو

گیا۔''

شیریں، اس کے ماموں اور شیریں کے والدین کے بارے میں بھی حمید اللہ نے مجھے خاصی تفصیل سے بتایا جس میں بعض نہایت ہی اہم نکات ہیں جن کا ذکر میں عدالتی کارروائی کے دوران مناسب موقع پر کروں گا۔ حمید اللہ بات مکمل کر کے خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

''اور ــــــ اقتدار حسین کے ترکے کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟''

اس نے بتایا۔ ''ایک محتاط اندازے کے مطابق پی ای سی ایچ ایس والا بنگلہ کم از کم پندرہ لاکھ کا ہوگا جہاں ماموں بھانجی نے پوری طرح قبضہ جما رکھا ہے۔ (لگ بھگ پینتیس سال پہلے پندرہ لاکھ ایک بہت بڑی رقم تصور کی جاتی تھی اور اس میں ایک شاندار بنگلہ خریدا جا سکتا تھا۔ آج کل اس مالیت میں ڈھنگ کا کوئی چھوٹا موٹا فلیٹ خریدنا بھی کارِ مشکل ہو کر رہ گیا ہے) کاروں والا شو روم اور اس میں کھڑی کاروں کی قیمت کا اندازہ پچیس لاکھ کے قریب ہے۔ بینک بیلنس کا مجموعہ بھی دس لاکھ سے اوپر ہے۔ اس کے علاوہ دو گاڑیاں وہ بھی ہیں جو اقتدار حسین اور شیریں کے استعمال میں تھیں۔ اقتدار والی گاڑی اب ماموں جان کے تصرف میں ہے۔ یہ دونوں گاڑیاں مجموعی طور پر کسی بھی طرح دس لاکھ سے کم کی نہیں ہیں۔ اس طرح یہ تخمینہ ساٹھ لاکھ کے قریب جا پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے یقین ہے مرحوم نے خفیہ انویسٹمنٹ بھی کر رکھی ہوگی۔ میں ایسی کسی سرمایہ کاری کے کھوج میں بھی ہوں۔ انشاء اللہ جلد ہی آپ کو کوئی خوشخبری سناؤں گا۔''

حمید اللہ اپنی رپورٹ مکمل کرنے کے بعد خاموش ہوا تو میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور تعریفی انداز میں کہا۔ ''ویل ڈن! آپ نے میرا کام بہت آسان کر دیا ہے۔ مجھے امید ہے، یہ معاملہ عدالت میں جائے بغیر ہی حل ہو جائے گا۔ بہرحال، آپ مزید کوشش بھی جاری رکھیں۔''

''کتنے افسوس اور ناانصافی کی بات ہے بیگ صاحب ــــــ!'' وہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ ''ایک طرف یہ بی بی شیریں کم از کم ساٹھ لاکھ کے اثاثوں کی مالک بن بیٹھی ہے اور دوسری جانب سائرہ بہن اور اس کی بیٹی ہیں جنہوں نے سال ہا سال سے زمانے کی سختیاں اور حالات کے تھپیڑے کھائے ہیں اور ہمیشہ تہی دست و داماں رہی ہیں۔''

وہ اس وقت خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ اس کے انداز میں تصنع یا بناوٹ نہیں جھلکتی تھی۔ وہ اپنے دل میں ان ماں بیٹی کے لئے واقعی ہمدردی رکھتا تھا۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''حمید اللہ صاحب! ایک بات ذہن نشین کر لیں کہ قدرت کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں

کرتی۔ سائرہ بیگم اور صبا نے گزشتہ بیس سال میں جو دکھ اٹھائے ہیں ان کی تلافی کا وقت آ گیا ہے۔ انہیں ان کے صبر اور استقلال کا انعام ملنے والا ہے۔ اب ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ——"

میں جملہ ادھورا چھوڑ کر لمحہ بھر کے لئے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "شیریں، مرحوم اقتدار حسین کی چھوڑی ہوئی ہر شے کی بلا شرکت غیرے مالک بن بیٹھی ہے تو یہ حقیقت سے بہت دور کی بات ہے کیونکہ ایسا بے خبری میں تو ممکن تھا لیکن جب سے میں مرحوم کی پہلی بیوی کے وکیل کی حیثیت سے اس "کھیل" میں شامل ہوا ہوں، یہ کسی بھی طور ممکن نہیں رہا۔ میں شیریں نامی اس عورت کو اکیلے سب کچھ ہضم نہیں کرنے دوں گا۔"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور پوچھا۔ "آپ شیریں کو کوئی لیگل نوٹس بھجوانے والے تھے۔ اس کا کیا ہوا؟"

"وہ نوٹس میں نے رجسٹرڈ ڈاک سے اسے بھجوا دیا ہے اور یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ آج وہ نوٹس اس نے وصول کر لیا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "مجھے امید ہے وہ کل مجھ سے ضرور رابطہ کرے گی کیونکہ نوٹس کے آخر میں، میں نے کچھ اس نوعیت کے جملے لکھے ہیں کہ اگر اس نے مجھ سے ملاقات میں کوئی غفلت یا بے پرواہی کا مظاہرہ کیا تو پھر یہی ملاقات انشاء اللہ بہت جلد کورٹ میں ہوگی۔"

"اوہ!" اس نے ایک گہری اور اطمینان بھری سانس خارج کی۔ "اور —— اور وہ عدالتی معاملات کا کیا ہوا؟ آپ نے عدالت سے کوئی حکم وغیرہ حاصل کرنے کی بات کی تھی نا؟"

"وہ معاملہ بالکل تیار اور میرے ہاتھ میں ہے۔" میں نے گول مول جواب دیا۔ "آپ کو اس سلسلے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"میرے لائق اور کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔" وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ "آپ فی الحال کھوج اور تحقیق کے جس کام سے لگے ہوئے ہیں اسی میں کوشش جاری رکھیں۔ اگر مجھے آپ سے کوئی اور ضروری کام لینے کی ضرورت پیش آئی تو میں آپ سے رابطہ کر لوں گا۔"

وہ اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلانے کے بعد اٹھ کھڑا ہو گیا۔ پھر مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد رخصت ہو گیا۔ میں اس کی فراہم کردہ معلومات پر سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔

❀ ❀ ❀

آئندہ روز حسب توقع وہ ماموں بھانجی میرے دفتر میں موجود تھے۔
یہ تو تعارف کے بعد پتہ چلا کہ وہ نجیب خان اور اس تازہ تازہ بیوہ ہونے والی بھانجی شیریں ہیں ورنہ میں اس عورت کو دیکھ کر پہلی نظر میں یہی سمجھا تھا کہ اس کا تعلق شو بزنس سے ہوگا۔ شیریں کے حُسن کی تعریف میں صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی تھا کہ اسے دیکھ کر سلور اسکرین کی کسی سپر اسٹار کا گمان ہوتا تھا جب کہ اس کا ماموں اپنے حلیے اور وضع قطع سے کوئی پیشہ ور بردہ فروش دکھائی دیتا تھا۔
تعارف سے پہلے میں ان کی حقیقت سے واقف نہیں تھا البتہ ان کی حرکات وسکنات سے مجھے کچھ شک سا ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق پیشہ وارانہ مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا اور انہیں اپنا نیا کلائنٹ سمجھتے ہوئے بیٹھنے کے لئے کہا۔
وہ گہری سنجیدگی سے کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے تو میں سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ شیریں نے میرے چیمبر کی آرائش وزیبائش پر ایک تنقیدی نظر ڈالی پھر قدرے طنزیہ لہجے میں بولی۔
''لگتا ہے آپ کی پریکٹس خوب چل رہی ہے آج کل!''
اس نے ''آج کل'' کے الفاظ کو جملے کے آخر میں استعمال کرنے کے علاوہ ان پر خاصا زور بھی دیا تھا۔ میں نے اس کے انداز کا برا منائے بغیر معتدل انداز میں کہا۔
''میری پریکٹس آج کل پر موقوف نہیں، ہمیشہ سے مجھ پر اللہ کا بڑا کرم رہا ہے۔''
''اللہ کا کرم ـــــ اللہ کا فضل اور اللہ کی رحمت وغیرہ!'' اس کے لہجے میں ایک خاص قسم کا معاندانہ تیکھا پن تھا۔
میں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے اس کے ماموں کی طرف دیکھا اور عام سے لہجے میں کہا۔ ''آپ نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کرایا؟''
حمید اللہ کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ شیریں بہت کم گو ہے جب کہ اس کا ماموں حد درجہ باتونی۔ لیکن یہاں تو معاملہ اس کے برعکس نظر آ رہا تھا۔ ماموں خاموش بیٹھا تھا اور بھانجی طنز پر طنز کئے جا رہی تھی۔ اس مرتبہ بھی ماموں کی بجائے بھانجی نے جواب دیا۔
''اپنا تعارف کرانے کے لئے ہمارے پاس، آپ کا بھیجا ہوا تحفہ موجود ہے۔'' اتنا کہہ کر اس نے اپنا فینسی ہینڈ بیگ کھولا اور اس میں سے ایک لفافہ نکال کر میرے سامنے میز پر ڈال دیا پھر چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''وکیل صاحب! اس کو پہچانتے ہیں آپ؟''
میں نے پہلی ہی نظر میں اس لفافے کو شناخت کر لیا لیکن انجان بنا رہا۔ یہ وہی نوٹس تھا جو

میں نے چند روز قبل رجسٹرڈ ڈاک سے شیریں کو بھیجا تھا۔ میں نے اس لفافے پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالنے کے بعد شیریں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا ہے یہ؟''

''کمال ہے!'' وہ بڑے بھونڈے انداز میں بولی۔''اپنی اولاد کو بھی نہیں پہچانتے؟''

مجھے اس کے ریمارکس پر غصہ تو بہت آیا لیکن پی گیا۔ شیریں نے اپنے رویے سے ایک مرتبہ پھر ثابت کر دیا کہ حُسن اور عقل میں ازلی دشمنی ہے۔ یہ دونوں ایک جگہ خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ لہٰذا اس سلسلے میں مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں!

میں نے بڑے تحمل سے وہ لفافہ اٹھا لیا اور اسے ہاتھوں میں گھماتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔''ہاں، لگتا تو یہی ہے، یہ میرے دفتر سے ارسال کیا گیا ہے۔''

''لگتا نہیں ـــــ بلکہ بالکل ایسی ہی بات ہے۔'' اس مرتبہ ماموں نے بھانجی کا ساتھ دینے کے لئے لب کشائی کی اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔''یہ میری بھانجی شیریں ہے جس کے نام آپ نے نوٹس بھیجا تھا اور میں اس کا ماموں نجیب خان ہوں۔''

''اوہ ـــــ تو آپ ہیں یہ دونوں ہستیاں!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا تاہم اس سنجیدگی میں تمسخر بھی شامل تھا۔

شیریں کو میرا جملہ بہت چبھا، چیں بہ چیں ہوتے ہوئے بولی۔''اس نوٹس کا آخر مقصد کیا ہے؟''

وہ خاصی غصہ ور اور جوشیلی معلوم ہوتی تھی۔ کسی عقل مند نے کیا خوب کہا ہے ـــــ خاموشی انسان کی ذات کی حفاظتی دیوار ہے۔ یہ بہت سے عیوب اور خامیوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اس کے برعکس باتونی آدمی اپنی کمزوریوں کو خود ہی اجاگر کر بیٹھتا ہے۔ کچھ یہی ماجرا شیریں کے ساتھ بھی تھا۔ اس کے غصے، جوش اور زبان درازی نے اس کے حُسن و خوبصورتی کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ بہر حال میں نے متحمل لہجے میں جواب دیا۔

''اگر آپ نے یہ نوٹس پڑھ لیا ہے تو اس کے مقصد سے بھی بخوبی آگاہ ہو گئی ہوں گی اور بالفرض، ابھی تک نہیں پڑھا تو یہ زحمت کر ہی لیں تو اچھا ہے۔''

وہ پھنکار سے مشابہ آواز میں بولی۔''اس نوٹس کو اچھی طرح پڑھنے کے بعد ہی ہم آپ کے پاس آئے ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں، آپ نے ایسا نوٹس مجھے کیوں بھیجا ہے؟''

''آپ بھی بچوں جیسا سوال کر رہی ہیں۔'' میں نے اسے سلگانے کی کوشش کرتے ہوئے

کہا۔ ''جب آپ کو معلوم ہو چکا کہ میں سائرہ بیگم کا وکیل ہوں اور اسی کے ایماء پر میں نے آپ کو یہ نوٹس بھیجا ہے تو پھر اس میں سمجھ نہ آنے والی بات کیا رہ جاتی ہے؟''

''میں کسی سائرہ سے واقف نہیں ہوں اور نہ ہی کس صبا کو جانتی ہوں۔'' وہ بڑی نخوت سے بولی۔ ''اقتدار نے اپنی زندگی میں کبھی کسی سائرہ یا صبا کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کے مرتے ہی یہ اچانک کہاں سے پیدا ہو گئیں؟''

وہ اپنے شوہر کی موت کا ذکر اس انداز میں کر رہی تھی جیسے وہ اس کی زندگی کا ساتھی نہ رہا ہو بلکہ کوئی پالتو جانور ہو۔ میں نے پالتو جانور کی مثال احتیاطاً دی ہے ورنہ اکثر گھروں میں پالتو جانوروں کے ساتھ بھی بہت محبت اور خیال کا سلوک کیا جاتا ہے۔ شیریں کے رویے سے ثابت ہوتا تھا، اس نے اپنے شوہر کی موت پر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا ہوگا۔

میں نے دل ہی دل میں اس کی عقل پر ماتم کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یہ دونوں ایسے ہی خواہ مخواہ پیدا نہیں ہو گئیں۔ سائرہ کے والدین کے نام کشور سلطانہ اور فرید الدین تھے جب کہ صبا کے والدین سائرہ بیگم اور اقتدار حسین ہیں۔ وہی اقتدار حسین جو کم و بیش ایک سال تک آپ کا شوہر بھی رہا ہے۔ اب آپ اس کی بیوہ ہیں اور صبا اس کی یتیم بچی ـــــ اسی طرح سائرہ بیگم بھی اقتدار حسین کی بیوہ ہے۔''

سائرہ کے ذکر پر شیریں کو گویا پتنگے لگ جاتے تھے، بڑے کڑوے لہجے میں بولی۔ ''یہ دونوں کردار آپ کے تخلیق کردہ ہیں۔ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''آپ کی کم علمی ان دونوں کے وجود کی نفی تو نہیں کر سکتی۔''

''ان کے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ اقتدار کی بیوی اور بیٹی ہیں؟'' وہ مجھے گھسنے کی کوشش کرنے لگی۔

میں نے اس کے داؤ کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''انہوں نے اگر مجھے اپنا وکیل مقرر کر کے مقدمہ لڑنے کی ٹھانی ہے تو سمجھ لیں، اپنے دعوے کی سچائی کو ثابت کرنے کے لئے ان کے پاس ثبوت بھی ہوں گے اور مضبوط دلائل بھی۔ اس لئے اگر آپ مصالحت پر تیار ہو جائیں تو عدالت کے چکر کاٹے بغیر بھی یہ مسئلہ یہیں میرے دفتر میں حل ہو سکتا ہے۔ اگر کسی منصف کے سامنے حاضر ہونے کی نوبت آئی بھی تو آپ کی حیثیت دشمنوں جیسی نہیں بلکہ قریبی رشتے داروں جیسی ہوگی۔ آفٹر آل، سائرہ بیگم آپ کی سوتن اور صبا سوتیلی بیٹی ہے۔''

''سوتیلی بیٹی ـــــ مائی فٹ!'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔ ''مجھے صبا اور سائرہ کے

بارے میں کچھ نہیں سننا۔ آپ یہ بتائیں کہ ان کے پاس کون سے ٹھوس ثبوت ہیں؟''

اس کے انداز میں ایک خاص قسم کا تحکم پایا جاتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ دوسروں کو دھونس میں رکھنے کی عادی ہے، بشمول مرحوم اقتدار حسین ——— جواب دنیا میں نہیں رہا تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''سوری! میں سائرہ بیگم کا وکیل ہوں۔ اس کے کسی راز سے آپ کو آگاہ نہیں کر سکتا۔ اگین آئی ایم ویری سوری۔''

اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ وہ اپنے سامنے انکار سننے کی عادی بھی نہیں تھی۔ چند لمحات تک سوچتی ہوئی مگر غصیلی نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر بارگیننگ والے انداز میں بولی۔

''آپ سائرہ کے وکیل اس لئے ہیں کہ آپ نے اس سے ایک بھاری فیس وصول کی ہو گی۔ میں آپ کو دُگنی فیس دیتی ہوں، آپ میرے وکیل بن جائیں!''

''یہ میرے پیشے کے اصول کے خلاف ہے۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''اصول؟'' اس نے استہزائیہ انداز میں ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''میں نے تو سنا تھا، وکالت کے پیشے میں صرف پیسے کا اصول چلتا ہے۔''

''آپ نے یقیناً ایسا سنا ہوگا۔ میں آپ کی سماعت پر شک نہیں کر رہا ہوں۔ اور ہو سکتا ہے، کسی حد تک اس پیشے میں یہ اصول بھی کارفرما ہو لیکن ———'' میں سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں ایسا نہیں ہوں۔''

''پھر آپ کیسے ہیں؟'' وہ گہری نظر سے مجھے گھورتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

اس کی گہری نظر میں بہت کچھ تھا۔ میں قابل بیان اور نا قابل بیان کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں۔ اس کے سوال کے جواب میں، میں نے کہا۔ ''میں ویسا ہی ہوں جیسا نظر آتا ہوں۔ وہی کرتا ہوں جو کہتا ہوں اور ایک بار پھر میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ آپ کو اقتدار حسین کی پہلی بیوی اور بیٹی کا پورا خیال کرنا چاہئے۔ اس سلسلے میں ناانصافی آپ کو کسی بڑی مصیبت میں مبتلا کر سکتی ہے۔''

''آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟''

''یہ دھمکی نہیں، مخلصانہ مشورہ ہے۔''

اسی لمحے ماموں ہمارے بیچ آ گیا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ''وکیل صاحب! اقتدار کے کوئی دیرینہ رشتہ دار نکل آئے ہیں تو ظاہر ہے، ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

وہ سائرہ اور صبا کا ذکر اس طرح کر رہا تھا جیسے وہ مرحوم اقتدار حسین کے کوئی بہت ہی دور کے غیر اہم تعلق دار ہوں۔ میں کوئی اعتراض، یا نکتہ اٹھائے بغیر پوری توجہ سے اس کی طرف

دیکھتا رہا۔ میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ جب نجیب خان نے بولنا شروع کیا تو شیریں شانت ہوگئی تھی ورنہ تھوڑی دیر پہلے وہ خاصی غضب ناک ہو رہی تھی اور بڑی اچھل اچھل کر مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ اس دوران ماموں چپ چاپ بیٹھا رہا تھا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ وہ باقاعدہ پلاننگ کر کے میرے پاس آئے تھے۔ ان کے رویے یہ بھی ظاہر کرتے تھے، وہ سائرہ بیگم اور صبا کی اچانک انٹری سے کافی خوف زدہ بھی ہیں۔

نجیب نے تھوڑے توقف کے بعد دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ''چند روز پہلے اسی سائرہ بیگم کا ایک حمایتی بھی ہم سے ملنے گھر آیا تھا اور جائیداد کی تقسیم کے سلسلے میں بڑی بڑی باتیں کر رہا تھا۔ ہم نے اسے زیادہ منہ نہیں لگایا اور خدا ترسی میں، میں نے اپنی جیب سے اسے پانچ دس ہزار دینے کی پیشکش کی تھی مگر اس نے بڑی حقارت سے میری پیشکش کو ٹھکرا دیا۔''

وہ یقیناً حمید اللہ کا ذکر کر رہا تھا۔ اس واقعے کے بارے میں حمید اللہ مجھے تفصیلاً بتا چکا تھا۔ تھوڑے توقف کے بعد نجیب خان دوبارہ گویا ہوا۔ ''لیکن اب معاملہ قدرے ٹیڑھا نظر آ رہا ہے۔ اس سائرہ بیگم نے آپ کو باقاعدہ اپنا وکیل مقرر کر لیا ہے۔ میں آپ کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ اگر کورٹ کا منہ دیکھے بغیر یہ مسئلہ یہیں پر حل ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟''

وہ میری بات کو دہرا کر مجھ ہی سے پوچھ رہا تھا کہ کیا خیال ہے میرا اس بارے میں۔ وہ چونکہ معقولیت کی طرف آ رہا تھا اگرچہ مجھے یقین تھا اس معقولیت کے پیچھے بھی اس کی کوئی چال چھپی ہوگی تاہم میں نے بھی ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔

''آپ کی طرح میرا خیال بھی نیک ہی ہے۔ آپ بسم اللہ تو کریں۔ قانونی اور دستاویزی معاملات میں سنبھال لوں گا۔ اس سلسلے میں آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

شیریں نہایت ہی چالاکی سے ہماری گفتگو میں داخل ہوگئی اور براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''وکیل صاحب! اس وقت آپ سائرہ بیگم کے وکیل ہیں لیکن دونوں پارٹیوں کے معاملے کو نمٹانے کی بات کر رہے ہیں۔ یہ کچھ مناسب معلوم نہیں ہو رہا۔''

''پھر ـــــ پھر آپ کیا چاہتی ہیں؟'' میں نے متعجب نظر سے اسے دیکھا۔

وہ بولی۔ ''اس طرح آپ غیر جانب دار نہیں رہیں گے۔ جس سے فیس لی ہے اسی کا فیور کریں گے۔ اس صورت میں تو ہمارا بہت نقصان ہو جائے گا۔''

''میں نے یہی تو پوچھا ہے پھر آپ کیا چاہتی ہیں؟'' میں نے اپنے سوال کو دہرایا۔

اس نے پراسرار انداز میں کہا۔ ''آپ میرے بھی وکیل بن جائیں۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' میں نے اُلجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا۔
''آپ چاہیں تو سب کچھ ہوسکتا ہے ــــــ''
''مرزا امجد بیگ۔'' میں نے اس کے سوالیہ انداز کے جواب میں کہا۔
وہ بولی۔''بیگ صاحب! آپ نے سائرہ بیگم سے جتنی فیس وصول کی ہے اس سے دُگنا، تین گنا مجھ سے لے لیں۔ اس طرح آپ میرا فیور زیادہ کرنے کی پوزیشن میں ہو جائیں گے۔''
وہ اپنے سامنے شاید دوسروں کو کاٹھ کا اُلو سمجھتی تھی۔ یہی رویہ وہ مجھ پر بھی آزمارہی تھی۔ گویا اپنی دانست میں مجھے وکالت کے نئے گُر سکھانے آئی تھی۔ مجھے اس کی بات سن کر غصہ تو بہت آیا مگر میں نے اپنے غصے کا اظہار نہیں کیا اور قدرے روکھے لہجے میں کہا۔
''شیریں صاحبہ! میں ذرا دوسری قسم کا وکیل ہوں۔ اس لئے وکالت کے سلسلے میں اپنے اصولوں سے انحراف نہیں کرتا۔ آپ کی یہ بات تکنیکی اعتبار سے قطعی نامناسب ہے کہ میں بیک وقت دو مخالف پارٹیوں کی وکالت کروں۔ آپ اس کام کی امید تو مجھ سے ہرگز ہرگز نہ رکھیں۔''
میں نے تھوڑا توقف کیا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے مزید کہا۔
''اور جہاں تک کسی کے فیور کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں، میں نے ہمیشہ سچائی کا ساتھ دیا ہے۔ میں مظلوم کو انصاف اور ظالم کو سزا دلوانے کی پوری کوشش کرتا ہوں۔ میرے اس فعل کا فیس کی دُگنی تگنی رقم سے کوئی تعلق نہیں۔''
شیریں کو میرے جواب سے خاصی مایوسی ہوئی۔ اس نے برا سا منہ بنا کر اپنے ماموں کی طرف دیکھا۔ ماموں نے حق بھانجیت نبھاتے ہوئے مجھ سے کہا۔
''وکیل صاحب! آپ بے بی (شیریں) کی بات سمجھے نہیں۔ اس میں زیادہ قصور بھی اسی کا ہے۔ اسے ڈھنگ سے بات کرنا نہیں آتی۔''
وہ بڑی پلاننگ سے کھیل رہے تھے۔ جہاں ایک پھنستا وہاں سے دوسرا بازی کو سنبھال لیتا۔ میں ان کی حکمت عملی کو بڑی اچھی طرح سمجھ گیا تھا لہٰذا ان کی کسی چال میں نہیں آسکتا تھا۔ ایک بات کا مجھے یقین ہوگیا تھا وہ میرے بھیجے ہوئے نوٹس سے خاصے خوفزدہ تھے اگرچہ وہ اس بات کا کھل کر اظہار نہیں کررہے تھے۔ انہوں نے اپنے خوف کو بڑی مہارت سے چھپا رکھا تھا مگر اندر سے ہزارہا خدشات میں گھرے ہوئے تھے۔ جو شخص ڈیفالٹر ہوتا ہے وہ اندر سے سہما رہتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال ان دونوں کا بھی تھا۔ میں نے محسوس کرلیا تھا، وہ اس کیس کو کورٹ میں پہنچائے بغیر ہی اس کا کوئی حل چاہتے تھے۔ یہ صورت حال میرے لئے بھی سہل اور مناسب تھی۔ لیکن ان کے مقاصد کا اونٹ کس کروٹ بیٹھنے کا ارادہ رکھتا ہے، یہ جاننا بہت

ضروری تھا اور میں اسی کے لئے کوشش کر رہا تھا۔ میں نے نجیب خان کی بات کے جواب میں کہا۔

''آپ تو ماشاء اللہ خوب ڈھنگ اور سلیقے سے بات کرتے ہیں۔ آپ ہی مجھے سمجھا دیں کہ آپ کی بھانجی مجھے کیا سمجھانا چاہتی ہیں؟''

وہ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اس شخص کو پانچ دس ہزار کی آفر کر دی تھی لیکن اس نوٹس کے بعد میں نے اور بے بی نے مل کر فیصلہ کیا ہے کہ اس رقم میں اضافہ کر دیتے ہیں کیونکہ اب یہ معاملہ آپ کی شمولیت کے باعث خاصا قانونی سا ہو گیا ہے۔''

وہ لمحہ بھر کو متوقف ہوا تو میں نے فوراً پوچھ لیا۔ ''اب آپ کی آفر کہاں تک پہنچی ہے؟''

اس نے میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے بے بی کی طرف دیکھا پھر میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''اگر سائرہ بیگم اس مقدمے بازی سے دست بردار ہو جائے اور آپ ہمارے درمیان جائیداد وغیرہ کے سلسلے میں کوئی تصفیاتی دستاویز بنا دیں تو ہم بہ خوشی سائرہ بیگم کو پچیس ہزار روپے دینے کو تیار ہیں۔'' وہ لمحے بھر کو رکا پھر جلدی سے بولا۔ ''اس سلسلے میں ہم آپ کی بھی خدمت کرنے کو تیار ہیں۔''

''آپ جو بھی کہیں گے، ہم مان لیں گے۔'' شیریں نے زور دیتے ہوئے کہا۔

میں چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے باری باری ان کے چہرے دیکھتا رہا۔ اس کی سازش نما چالاکی پوری طرح کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ میں ان کی طرف سے کسی ایسی ہی چال کی توقع کر رہا تھا۔ گویا بقول کسے، بلی تھیلے سے باہر آ گئی تھی!

میں نے قدرے سخت لہجے میں ماموں سے کہا۔ ''آپ میری خدمت کے بارے میں تو نہ ہی سوچیں تو اچھا ہے۔ اس رقم کو بھی ان ماں بیٹی کے بجٹ میں شامل کر لیں اور بتائیں کل رقم کتنی ہوئی؟''

وہ سمجھا، میں نے ان کے بچھائے ہوئے جال میں قدم رکھ دیا ہے۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ ''چالیس ہزار روپے۔''

اس کا مطلب تھا، انہوں نے مجھے اپنا ہم نوا بنانے کے لئے پندرہ ہزار کا بجٹ رکھا تھا۔ پچیس اور پندرہ مل کر چالیس ہزار ہو گئے تھے۔ میں نے قدرے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔

''آپ کو معلوم ہے یہ کتنی رقم ہے؟''

''اگر آپ اسے کم سمجھتے ہیں تو ہم دس ہزار مزید بڑھا دیتے ہیں۔'' شیریں نے حاتم طائی کی قبر پر ایک زوردار لات مارتے ہوئے کہا۔ ''پچاس ہزار کو فائنل سمجھیں۔ ہم اس کیس کو

قانونی انداز میں سیٹل کرنے کے لئے یہ رقم خرچ کرنے کو تیار ہیں اور سب کچھ آپ پر چھوڑتے ہیں۔ ان پچاس ہزار میں سے جو چاہیں آپ رکھیں اور جو چاہیں ان ماں بیٹی کو دے دیں۔ ہم پچاس ہزار کی رقم آپ کے ہاتھ میں رکھ دیں گے۔ آپ قانونی نکات کی روشنی میں کوئی ایسی پکی دستاویز تیار کر دیں کہ بعد میں کبھی ہمارے لئے کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

''میں تو آپ کی بات بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن افسوس کہ میں جو کچھ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں وہ آپ کی عقل میں اترنے کا نام نہیں لے رہا۔ آپ پتہ نہیں، پچاس ہزار کی رقم کو کیا سمجھ رہی ہیں؟''

نجیب خان نے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ پچاس ہزار کی رقم کو اتنا بھی حقیر نہ جانیں۔ اس میں اچھی خاصی فور وہیل آ جاتی ہے۔''

میں نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔ ''نجیب خان! کیا آپ کو معلوم ہے اقتدار حسین اپنے پیچھے کتنا کچھ چھوڑ کر گیا ہے جس پر قبضہ کر کے آپ لوگ صرف پچاس ہزار خیرات میں ان ماں بیٹی کی جھولی میں ڈالنا چاہتے ہیں؟''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تاہم وہ برداشت کر گیا۔ حمید اللہ کو اس نے دھونس میں لینے کے لئے پولیس تک تو بلانے کی دھمکی دے ڈالی تھی لیکن میری چھری کے نیچے وہ زیادہ دم نہیں مار رہا تھا۔ اس نے ذلت کے احساس سے تلملا کر اپنی بے بی بھانجی کی طرف دیکھا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے معتدل لہجے میں بولا۔

''بیگ صاحب! میرے خیال میں تو اقتدار حسین کچھ زیادہ چھوڑ کر رخصت نہیں ہوا۔ ویسے صحیح حساب تو شیریں کو ہی معلوم ہوگا۔''

اس نے ایک طرح سے اپنی بھانجی کو اشارہ دیا تھا کہ اب اس کے بولنے کی باری ہے۔ اس نے فوراً اسپیکنگ اینڈ سنبھال لیا اور کچھ دیر تک سوچنے کی ایکٹنگ کرنے کے بعد بولی۔

''میرا خیال ہے سب ملا کر زیادہ سے زیادہ دس لاکھ کا ہوگا۔''

''آپ کا یہ خیال انتہائی ناقص ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''یہ تو آپ نے وہ رقم بتائی ہے جو بینک بیلنس سے بھی کچھ کم ہے۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ تیز نظر سے مجھے گھورنے لگی۔

حمید اللہ نے محتاط اندازے کے مطابق مجھے جو کچھ بتایا تھا میں نے اس میں تھوڑا اضافہ کرتے ہوئے شیریں عرف بے بی کے کانوں کے کیڑے جھاڑ دیئے۔ میں نے ٹھہرے ہوئے

لہجے میں کہا۔
''مطلب بہت ہی سادہ اور آسان ہے ـــــــ اگر سننے کا موڈ ہو تو بتاؤں؟''
''جی فرمائیں۔ آپ کون سا انکشاف کرنے والے ہیں؟'' وہ ایک ادا سے بولی۔
میں نے کہا۔ ''اقتدار حسین اپنے بینک اکاؤنٹ میں کم از کم پندرہ لاکھ چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوا ہے۔ اس کے علاوہ آپ جس بنگلے میں رہ رہی ہیں اس کی مالیت بیس لاکھ کے قریب ہے۔ شوروم اور اس میں کھڑی ہوئی چم چماتی گاڑیاں کم وبیش پچاس لاکھ کی ہیں۔ پھر آپ دونوں کے استعمال میں ذاتی استعمال والی دو گاڑیاں بھی ہیں جن میں سے ایک آج کل آپ کے ماموں استعمال کر رہے ہیں۔ ان گاڑیوں کی مجموعی قیمت کسی بھی طور پندرہ بیس لاکھ سے کم نہیں اور ـــــــ آپ کہہ رہی ہیں، وہ کچھ خاص چھوڑ کر نہیں گیا؟''
میرے بولنے کے دوران وہ دونوں آنکھیں پھاڑے، ہکا بکا مجھے دیکھتے چلے گئے۔ میں خاموش ہوا تو شیریں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔
''کیا آپ اس قسم کے کام بھی کرتے ہیں؟''
''مجھے اپنے مؤکل کا مقدمہ لڑنے کے لئے ہر داؤ پیچ استعمال کرنا پڑتا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر اپنی بات میں زور پیدا کرنے اور اس پر تاثر جمانے کے لئے یہ بھی کہہ دیا۔
''میں نے ابھی آپ کے سامنے جو تفصیلات بیان کی ہیں اس سلسلے میں ٹھوس ثبوت بھی حاصل کر لئے ہیں۔ علاوہ ازیں سائرہ بیگم کے پاس بھی کچھ ایسی دستاویزات ہیں جو کورٹ میں پیش کی جائیں تو اسے مرحوم کی پہلی بیوی تسلیم کر لیا جائے گا۔''
میں ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے شیریں سے پوچھا۔ ''اب آپ خود ہی بتائیں، اگر ان مضبوط بنیادوں پر آپ کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر ہو گیا تو آپ کے لئے جان چھڑانا مشکل ہو جائے گی۔''
میں نے مختلف حسابات میں کچھ اضافہ کیا تھا لیکن ان ماموں بھانجی نے کسی شے پر کوئی اعتراض کیا اور نہ ہی انکار کیا۔ اس کا مطلب تھا، حمید اللہ نے جو تخمینہ لگایا تھا وہ درست نہیں تھا۔ مرحوم اقتدار حسین اپنے پیچھے ساٹھ لاکھ نہیں بلکہ سوا کروڑ کی جائیداد اور مال واسباب چھوڑ کر گیا تھا ـــــــ اور وہ کمینے صرف پچاس ہزار میں جان چھڑانا چاہتے تھے!
وہ دونوں مجھے خاصی مشکل میں نظر آئے۔ حمید اللہ کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ نجیب خان نے اقتدار حسین مرحوم کے سامنے خود کو شیریں کا باپ ظاہر کیا تھا لیکن اس کے انتقال کے بعد وہ دونوں اپنی اصلیت پر آ گئے تھے۔ اگر شیریں کی ہٹ دھرمی اور بے وقوفی کے نتیجے میں

عدالت تک جانے کی نوبت آ ہی جاتی تو میں اس نکتے کو بھی بڑی خوبصورتی سے استعمال کر کے انہیں چت کر سکتا تھا۔ بہرحال، میں نے ان ماموں بھانجی کو اپنے تاثرات سے یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں ان کے لئے اپنے ذہن میں کتنی خطرناک منصوبہ بندی کئے بیٹھا ہوں۔ یہ اور بھی اچھا ہوا تھا کہ انہوں نے میرے سامنے خود کو ماموں بھانجی کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا۔

میرے بیان کردہ خدشات نے ان دونوں کو گہری تشویش میں مبتلا کر دیا۔ شیریں نے قدرے نرمی سے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! ہماری پچاس ہزار روپے کی پیش کش تو آپ کی سمجھ میں نہیں آئی اگر ہم یہ معاملہ آپ پر چھوڑ دیں تو آپ کیا انصاف کریں گے؟''

میں نے اسے مائل بہ کرم دیکھا تو تھوڑا سوچنے کے بعد کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ میں سائرہ بیگم کا وکیل ہوں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں آپ کی دشمنی پر اتر آؤں۔ اگر آپ نے انصاف کی ترازو میرے ہاتھ میں پکڑا ہی دی ہے اور خلوصِ نیت سے آپ یہ چاہتی ہیں کہ مقدمے بازی کے بغیر یہ معاملہ باہمی تصفیے کے ذریعے طے کر لیا جائے تو پھر میرے خیال میں ـــــ''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر تھوڑا توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ مرحوم اقتدار حسین کی چھوڑی ہوئی تمام اشیاء میں سے پی ای سی ایچ سوسائٹی والا بنگلا، ایک گاڑی اور نقد پانچ لاکھ روپے سائرہ بیگم کو دینے کے لئے تیار ہو جائیں تو میں بڑی خوبصورتی سے اس بگڑتی ہوئی صورتِ حال کو بنا سکتا ہوں۔''

اس نے آنکھیں پھیلائیں اور حیرت سے بولی۔ ''آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے بیگ صاحب!'' وہ پل میں تولہ پل میں ماشہ جیسی طبیعت کی مالک تھی۔ میری تجویز نے اسے چراغ پا کر دیا۔ وہ خاصی جارح ہو رہی تھی۔ ''آپ نے جو کچھ گنوایا ہے یہ کل ملا کر تقریباً تیس لاکھ ہو جاتے ہیں۔ ہم تو پچاس ہزار سے زیادہ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''اور ہم تیس لاکھ سے کم کے بارے میں نہیں سوچ سکتے۔'' میں نے اسی کے انداز میں کہا۔ ''اور میں سمجھتا ہوں اس ڈیل میں بھی سراسر آپ ہی کا بھلا ہے۔ آپ تیس لاکھ کی قربانی دے کر کم از کم اسی لاکھ بچا سکتی ہیں۔ اقتدار حسین نے جو کچھ اپنے پیچھے چھوڑا ہے وہ کسی بھی طور سوا کروڑ سے کم کا نہیں ہوگا۔''

وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکنے لگی۔ ''یہ نہیں ہو سکتا ـــــ کبھی نہیں ہو سکتا۔ اب اتنی بھی اندھیر نہیں مچی ہوئی۔''

ماموں نے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ ہمارے لئے کوئی گنجائش نکالیں۔''

''میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتا۔'' میں نے دوٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

شیریں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ''آئیں ماموں!'' اس نے برہمی بھرے لہجے میں نجیب خان کو مخاطب کیا۔ ''یہ بیگ صاحب ہمارے کسی کام نہیں آسکتے۔ یہ تو اسی کے ساتھی ہیں جس کی وکالت کررہے ہیں۔ جو معاملہ سیٹل کرانے کے یہ تیس لاکھ مانگ رہے ہیں وہ بہ مشکل پانچ ہزار میں بھی سیٹل ہوسکتا ہے۔ پھر ان کی منت، خوشامد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

مجھے اس کے تیور خاصے خطرناک دکھائی دیئے۔ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''آپ کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں؟''

''یہ آپ کو بہت جلد معلوم ہوجائے گا۔'' اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا اور میرے چیمبر سے نکل گئی۔

اس کی دیکھا دیکھی ماموں نے بھی پلک جھپکتے میں اپنے تیور بدلے اور تیز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوگیا۔

میں نے اپنی میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ کی جانب ہاتھ بڑھایا اور حمید اللہ کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ شیریں کے انداز نے میرے دل میں ان گنت خدشات جگا دیئے تھے۔

❁ ❁ ❁

اگلی صبح ٹیلی فون کی گھنٹی سے میری آنکھ کھلی۔

میں علی الصبح اٹھنے کا عادی ہوں۔ اس روز ٹیلی فون میری بیداری کے وقت سے بھی پہلے چیخ اٹھا تھا۔ یہ ایک خلافِ معمول اور حیرت انگیز بات تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، کہیں کسی کے ساتھ کوئی ایمرجنسی ہوگئی تھی اور اس کسی کا تعلق کسی نہ کسی حوالے سے مجھ سے ہی تھا ورنہ وہ اتنی صبح میرے گھر پر فون کرنے کی زحمت کیوں کرتا!

میں آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا اور ٹیلی فون اسٹینڈ کی جانب بڑھ گیا۔ اس دوران وقفے وقفے سے گھنٹی نے اپنا کام جاری رکھا تھا۔ میں نے جلدی سے ریسیور کو اٹھا کر کان سے لگایا اور ماؤتھ پیس میں ''ہیلو'' کہا۔

''بیگ صاحب! شکر ہے آپ نے فون اٹینڈ تو کیا۔'' دوسری طرف سے ایک گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

میں نے اس آواز کو فوراً سے پیشتر پہچان لیا۔ وہ حمید اللہ تھا۔ پتہ نہیں، ایسا کیا ہوگیا تھا جو وہ گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''خیریت تو ہے حمید اللہ؟''

''خیریت کہاں ہے بیگ صاحب!'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''کیا آپ فوراً یہاں آ سکتے ہیں؟''

''فوری طور پر تو ممکن نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کے فون سے میری آنکھ کھلی ہے۔ بتائیں تو سہی آخر معاملہ کیا ہے؟''

میں نے کل حمید اللہ کو فون کر کے یہ ہدایت کی تھی کہ وہ سائرہ بیگم اور صبا کو محتاط رہنے کے لئے کہہ دیں۔ شیریں جتنے غضب ناک انداز میں میرے دفتر سے اٹھی تھی اس نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا اور اسی تشویش کے پیش نظر میں نے حمید اللہ کو فون کیا تھا۔ حمید اللہ کی اس ایمرجنسی کال نے میرا دھیان فوراً سائرہ بیگم اور اس کی بیٹی کی طرف پھیر دیا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہاں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے!

حمید اللہ نے میرے خدشات کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا۔ ''بیگ صاحب! میں اس وقت ایک پبلک کال آفس سے آپ کو فون کر رہا ہوں۔ یہ کال آفس سائرہ بیگم کی رہائش کے قریب ہی ہے۔ میں کافی دیر سے ٹرائی کر رہا تھا۔ اللہ کا شکر ہے، آپ نے فون اٹینڈ کر لیا۔ سائرہ بہن کے گھر میں ایک ٹریجڈی ہو گئی ہے۔''

''کیسی ٹریجڈی؟'' میں نے تشویش ناک انداز میں دریافت کیا۔

اس نے ٹھہر ٹھہر کر بتانا شروع کیا۔ ''آپ کا فون سننے کے بعد میں سائرہ بہن سے بات کرنے کے لئے اس طرف آیا تھا۔ وہ میری بات سن کر پریشان ہو گئی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں، صرف محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کی خوفزدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ مجبوراً مجھے رات کو ان کے گھر میں قیام کرنا پڑا۔''

وہ چند لمحات کے لئے متوقف ہوا، سانس درست کیا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''رات گئے تک ہم لوگ موجودہ صورتِ حال پر گفتگو کرتے رہے۔ میں نے اپنے گھر والوں کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ رات کو واپس نہیں آ سکوں گا لہٰذا اس طرف سے مجھے اطمینان تھا۔ آدھی رات کے وقت صبا سونے کے لئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں اور سائرہ بات چیت میں مصروف تھے۔ خلافِ معمول ہم دونوں کو ہی نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں آپ کو مختصراً اصل بات بتاتا ہوں ـــــــ'' وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا اور اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''رات کے آخری پہر چند افراد کوارٹر میں گھس آئے۔ وہ بیرونی دیوار پھلانگ کر اندر آئے تھے۔ ان کے پاؤں کی دھمک نے ہمیں ہوشیار کر دیا مگر اس سے پہلے کہ میں صحن میں پہنچ کر ان کا سامنا کرتا، وہ دندناتے ہوئے ہمارے سر پر پہنچ گئے۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تین

افراد تھے اور وہ پوری طرح مسلح بھی تھے۔

انہوں نے آتے ہی توڑ پھوڑ شروع کر دی۔ اس شور شرابے سے صبا کی آنکھ کھل گئی اور وہ بھی چیختی ہوئی ہمارے کمرے ہی میں آ گئی۔ حملہ آور مختلف چیزوں کو اِدھر اُدھر پھینکتے ہوئے اپنے غصے کا اظہار کر رہے تھے۔ انہوں نے ابھی تک ہم تینوں میں سے کسی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ ایک بات میری سمجھ میں آ گئی کہ وہ لوگ اپنی ان واہیات حرکتوں سے سائرہ اور اس کی بیٹی کو خوفزدہ کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ خاصی حد تک کامیاب رہے تھے سائرہ اور صبا کا برا حال تھا۔

جب وہ لوگ اپنے دل کی بھڑاس نکال چکے تو ان میں سے ایک نے سائرہ بیگم سے کہا۔ ''تمہیں مقدمے بازی کا بہت شوق ہے نا! اپنے گھر کا حشر دیکھ لو ـــــــ اگر تم اپنے شوق سے باز نہ آئیں تو آئندہ تمہارا اور تمہاری بیٹی کا بھی کچھ ایسا ہی حشر نشر ہوگا اور ـــــــ یہ بات ذہن نشین کر لو کہ وہ لال بیگ کا بچہ تمہیں بچانے نہیں آئے گا۔ ویسے وکیلوں کو صرف اپنی فیس سے غرض ہوتی ہے۔''

''بیگ صاحب!'' حمید اللہ نے سراسیمہ لہجے میں بتایا۔ ''وہ لوگ انتہائی بدتمیز اور غنڈے تھے۔ انہوں نے آپ کی شان میں بھی گستاخی کی ہے۔''

''میری شان کو آپ فی الحال ایک طرف رکھ دیں۔'' میں نے حقیقت حال کی تہہ میں اترتے ہوئے کہا۔ ''یہ بتائیں، سائرہ بیگم اور صبا کا کیا حال ہے؟''

''دونوں سخت خوفزدہ ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''سائرہ بیگم تو مقدمہ واپس لینے کی بات کر رہی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''انہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ اگر وہ تھوڑی سی ہمت سے کام لیں تو اس مقدمے کو جیت کر شیریں کو شکست فاش سے ہمکنار کر سکتی ہیں۔ حالات پوری طرح ان کی موافقت میں ہیں۔''

''یہ بات آپ ہی آ کر انہیں سمجھائیں۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے ـــــــ آپ ان لوگوں کے پاس ہی رکیں۔ میں تھوڑی دیر میں تیار ہو کر آتا ہوں پھر ادھر ہی سے کورٹ چلا جاؤں گا۔''

''بڑی اچھی بات ہے ـــــــ آپ آ جائیں۔'' اس نے گفتگو ختم کرتے ہوئے کہا اور فون بند کرتے کرتے پوچھ لیا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے بیگ صاحب! یہ شبینہ غنڈہ گردی کہیں شیریں یا اس کے ماموں کی کارستانی تو نہیں؟''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔
پھر ہمارے درمیان ٹیلی فونک رابطہ موقوف ہو گیا۔
حمید اللہ اس افسوس ناک واقعے سے جس نتیجے پر پہنچا، میں بہت پہلے اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شیریں نے بڑے خطرناک انداز میں نجیب خان سے کہا تھا ——— بیگ صاحب جس معاملے کو سیٹل کرنے کے تیس لاکھ مانگ رہے ہیں وہ معاملہ بہ آسانی پانچ ہزار میں سیٹل ہو سکتا ہے ——— اب اس بات میں کسی شک وشبہے کی گنجائش باقی نہیں تھی کہ وہ مسلح غنڈے شیریں ہی کے ایما پر ان ماں بیٹی کو خوفزدہ کرنے آئے تھے۔ اس کا مطلب تھا شیریں شرافت کی زبان نہیں سمجھ سکی تھی۔ غنڈہ گردی کے جواب میں اس کے ساتھ بھی غنڈہ گردی کرنے ہی کی ضرورت تھی!

میں نے حسب معمول ناشتہ کیا اور تیار ہو کر پی آئی بی کالونی پہنچ گیا۔ اس گھر میں، میں دوسری مرتبہ داخل ہوا تھا۔ حمید اللہ نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد سائرہ بیگم اور صبا بھی وہیں آ گئیں۔ حمید اللہ قدرے سنبھلا ہوا تھا مگر ان ماں بیٹی کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ واقعہ ہی ایسا تھا کہ انہیں ہراساں ہونا چاہئے تھا۔
سائرہ بیگم نے گفتگو کا آغاز کیا اور سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''بیگ صاحب! ابو کی وفات کے بعد سے میں اپنی بیٹی کے ساتھ بغیر کسی سہارے کے رہ رہی ہوں اور اللہ کا شکر ہے، عزت اور شان سے رہ رہی ہوں۔ آج تک کسی کو اس گھر کے اندر بری نیت سے جھانکنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ گزشتہ رات جو واقعہ پیش آیا ہے اس کی تفصیل حمید بھائی نے آپ کو بتا دی ہے۔ میں سمجھتی ہوں، یہ سب کچھ اسی منحوس شخص کی وجہ سے ہوا ہے جس کے آتش بار سائے سے میں نے اپنی بیٹی کو عمر بھر بچائے رکھا۔ اس ظالم اور سفاک شخص نے زندگی میں ہمیں کوئی سکھ اور آرام نہیں پہنچایا۔ مرنے کے بعد اس کے حوالے سے کیا امید رکھی جا سکتی ہے۔ میں بہت خود دار اور کفایت شعار عورت ہوں۔ میں نے کبھی اپنے دل میں لمبی چوڑی خواہشوں کو نہیں پالا۔ اللہ سے ہمیشہ میں نے عزت کی زندگی اور عزت کی موت مانگی ہے اور اس نے اب تک مجھے اور میری بیٹی کو بڑی عزت سے خوش حال رکھا ہوا ہے۔ اب چند ماہ کے بعد صبا کی شادی ہو جائے گی تو میں اس فرض سے بھی نمٹ جاؤں گی۔ مجھے کیا چاہئے؟ کچھ بھی نہیں! کس کے لئے چاہئے؟ کسی کے لئے بھی نہیں!''
وہ لمحہ بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب! مجھے مقدمے بازی کا کبھی شوق نہیں رہا۔ یہ تو حمید بھائی کی ضد پر میں تیار ہو گئی تھی۔ آپ سے

میری درخواست ہے کہ اس مقدمے کو عدالت میں لگنے سے پہلے ہی خارج سمجھیں۔ مجھے کسی قسم کے مال و دولت اور جائیداد کا لالچ نہیں ہے۔"

سائرہ جو کچھ کہہ رہی تھی، اپنے حالات واقعات کی روشنی میں بالکل درست کہہ رہی تھی۔ کوئی بھی کمزور اور شریف آدمی ان حالات میں یہی فیصلہ کرتا ہے۔ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ سائرہ کو اپنی قانونی حیثیت اور طاقت کا اندازہ نہیں تھا۔ یہ کیس پوری طرح اس کی موافقت میں تھا۔ اگر وہ حوصلہ نہ ہارتی تو جیت انشاءاللہ اس کا مقدر بنتی!

میں نے اس کی بات پوری توجہ سے سنی اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں آپ کو کیس واپس لینے کا مشورہ ہرگز ہرگز نہیں دوں گا۔ آپ یوں سمجھیں کہ جب انسان حق کی راہ پر قدم رکھتا ہے تو شیطان مختلف حیلوں وسیلوں سے اس کی راہ کھوٹی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ ثابت قدمی سے اپنے راستے پر گامزن رہے تو اپنی منزل مراد کو پا لیتا ہے یعنی شیطان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔"

میں تھوڑی دیر کے لئے متوقف ہوا، گہری نظر سے سائرہ بیگم کو دیکھا۔ وہ بڑے انہماک سے میری بات سن رہی تھی۔ میں نے سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ نے بھی حق کے حصول کے لئے چارہ جوئی شروع کی ہے اس لئے شیطان سرگرم ہو گیا ہے۔ آپ گزشتہ رات یہاں ہلا گلا مچانے والے ان تین غنڈوں کو شیطان کے چیلے ہی سمجھیں۔ میں بخوبی جانتا ہوں، انہوں نے کس کے اشارے پر یہ حرکت کی ہے۔ میں گزشتہ روز آپ کی چالباز سوتن سے ایک بھرپور ملاقات کر چکا ہوں۔ وہ اس مقدمے بازی سے بری طرح خائف ہے اور اسے یہ اندازہ ہے کہ اگر یہ معاملہ عدالت میں چلا گیا تو اسے منہ کی کھانی پڑے گی۔ وہ منہ کی نہیں بلکہ منہ سے کھانا چاہتی ہے اس لئے تصفیے پر تیار ہے مگر چالاکی یہ کر رہی ہے کہ کچھ دینا نہ پڑے اور جان بھی چھوٹ جائے۔"

پھر میں نے بڑی تفصیل سے انہیں، شیریں اور اس کے ماموں سے ہونے والی میٹنگ کے بارے میں بتایا کہ کس فنکاری سے وہ پچاس ہزار دے کر سوا کروڑ پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ میں نے انہیں اس پیش کش کے بارے میں بھی بتایا جو میں نے شیریں کے سامنے رکھی تھی اور جسے اس نے بڑی حقارت سے ویٹو کر دیا تھا۔ آخر میں، میں نے سائرہ بیگم سے کہا۔

"شیریں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ گئی ہے کہ اگر یہ مقدمہ عدالت تک گیا تو اس کی بڑی خواری اور بربادی ہوگی۔ اس حقیقت کے پیش نظر اس نے پچاس ہزار خرچ کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن میں نے اس کی پیش کش کو درخورِ اعتنا نہ جانا۔ اب اس کے پاس ایک ہی بچت کی راہ بچتی

ہے اور وہ راہ ہے ــــــ آپ کو پریشان اور خوفزدہ کر کے مقدمے بازی سے روکنا۔ گزشتہ رات اس کے خریدے ہوئے غنڈوں نے یہاں جو توڑ پھوڑ مچائی ہے وہ اس سلسلے کی کڑی ہے ــــــ اور میں دیکھ رہا ہوں، وہ اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب رہی ہے۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" سائرہ بیگم نے اُلجھن زدہ انداز میں استفسار کیا۔

میں نے کہا۔ "وہ اپنی اس کارروائی سے آپ کو خوفزدہ کر کے مقدمے بازی سے باز رہنے کے لئے تیار کر چکی ہے۔ شیریں کی ایک مذموم چال نے اسے ایک ہی جھٹکے میں کامیابی کے قریب لا کھڑا کیا ہے۔ کیونکہ اگر آپ ہی پیچھے ہٹ جائیں گی تو میں آپ کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔ جبکہ میرا مشورہ کچھ اور ہے۔"

"آپ اس صورتِ حال میں کیا مشورہ دیں گے؟" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ "پہلے تو آپ خود کو کمزور اور تنہا سمجھنا چھوڑ دیں۔ آپ کا کیس خاصا مضبوط ہے اور ہر صورت میں قانون آپ کے ساتھ ہے۔ میں اس علاقے کے تھانہ انچارج سے مل کر اسے صورتِ حال سے آگاہ کر دوں گا۔ وہ آپ کی حفاظت کا معقول بندوبست کر دے گا۔ اس کے بعد کسی غنڈے بدمعاش کو آپ کے گھر کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں ہو گی۔ اور باقی رہا کورٹ کا معاملہ ــــــ تو اس سلسلے میں آپ بالکل بےفکر ہو جائیں۔ وہاں سے آپ کو کامیابی دلانے کا میں وعدہ کرتا ہوں۔"

اس موقع پر صبا نے خاصی بہادری کا مظاہرہ کیا اور سائرہ بیگم سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ "امی! بیگ انکل بالکل درست کہہ رہے ہیں ــــــ ہمیں بزدلوں کی طرح پیچھے نہیں ہٹنا چاہئے۔ جب اوکھلی میں سر دے ہی دیا ہے تو موسلوں کی کیا پرواہ کرنا ــــــ پھر بیگ صاحب پولیس والوں سے کہہ کر ہماری حفاظت کا بندوبست بھی تو کر رہے ہیں!"

"ایک آئیڈیا ــــــ بلکہ پیش کش میرے پاس بھی ہے۔" حمید اللہ نے خلوص بھرے لہجے میں کہا۔ "آپ دونوں کچھ دنوں کے لئے میرے گھر میں قیام کریں۔ میرا گھر خاصا بڑا ہے۔ آپ دونوں کے لئے بڑی آسانی سے گنجائش نکل آئے گی۔ اس طرح آپ کی حفاظت کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔"

اس نے یہ تجویز سائرہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے پیش کی تھی۔ وہ اس پیش کش پر چند لمحے خاموش رہی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"حمید بھائی! میں آپ کے خلوص اور جذبہ ہمدردی کو اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں، آپ ہمارے سچے خیر خواہ ہیں مگر یہ مجھے اچھا نہیں لگ رہا کہ ہم اپنا گھر چھوڑ کر کہیں اور

شفٹ ہو جائیں۔آپ میری بات کا برا نہ مانئے گا۔''

''اس کا مطلب ہے آپ مجھے اپنا نہیں سمجھتیں۔'' حمید اللہ نے شاکی لہجے میں کہا۔

''دیکھیں، میں نے کہا ہے نا، آپ مائنڈ نہ کریں۔'' سائرہ بیگم نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔''میں اپنے مزاج سے مجبور ہوں۔شاید ایک طویل عرصے تک تنہا رہتے ہوئے میری یہ کچھ عادت سی بن گئی ہے۔آپ اسے میرے ذہن کا فتور بھی کہہ سکتے ہیں۔''

''یہ ذہنی فتور نہیں بلکہ آپ کی خود داری ہے۔'' میں نے ستائشی انداز میں کہا۔'' آپ اپنی بیٹی کی تجویز پر غور کریں۔آپ لوگوں کی حفاظت کا بندوبست میں ابھی کروا دیتا ہوں۔''

تھوڑی سی بحث وتمحیص اور سمجھانے بجھانے کے بعد بات سائرہ بیگم کے بھیجے میں اتر گئی۔ وہ اپنے ہی گھر میں ہمت پکڑ کر بیٹھنے کے لئے تیار ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی مقدمے بازی کا بھی پختہ ارادہ کرلیا۔یہ صورتِ حال میرے لئے تسلی بخش تھی۔اب میں پوری آزادی کے ساتھ اس سلسلے میں سرگرمی دکھا سکتا تھا۔

میں سائرہ بیگم کے گھر سے اٹھا اور سیدھا اس علاقے کے تھانے میں پہنچ گیا ـــــــ ان ماں بیٹی کی حفاظت کے سلسلے میں ضروری انتظام کرنے کے بعد میں عدالت کی جانب روانہ ہو گیا۔

❁ ❁ ❁

سائرہ بیگم کا کیس میں نے تیار کر رکھا تھا۔میں نے دوسرے کاموں کو ثانوی حیثیت پر رکھ کر اسی روز عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا۔یہ گویا شیریں کے خلاف کھلا اعلانِ جنگ تھا!

ابتدائی چند ماہ عدالت کی تکنیکی کارروائی میں رف ہو گئے۔اس دعوے کے جواب میں شیریں نے اپنے وکیل کے ذریعے جواب دعویٰ دائر کیا تھا جس میں اس نے خود کو مرحوم اقتدار حسین کی بیوہ اور اس کی چھوڑی ہوئی تمام منقولہ وغیر منقولہ جائیداد کی حقدار ٹھہرایا تھا۔یہ ایک دلچسپ صورتِ حال تھی۔مجھے اس کے بیوہ ہونے یا مرحوم کی جائیداد کا حق دار ہونے میں کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں تھا۔میرا تو صرف یہ موقف تھا کہ سائرہ بیگم اور شیریں کو برابر کا حق ملنا چاہئے۔

عدالت کی ابتدائی کارروائی خاصی سست اور اُکتا دینے والی ہوتی ہے اس لئے میں اس کی تفصیل میں جا کر آپ کا وقت برباد نہیں کروں گا۔میرا آپ کو بور کرنے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں ہے۔عدالت کی تکنیکی کارروائی کے بعد چند ماہ تک تاریخیں پڑتی رہیں لیکن کوئی قابلِ ذکر پیش رفت نہ ہو سکی۔شیریں کا وکیل چاہتا تھا، یہ کیس لمبا ہو جائے۔وہ دانستہ اس سلسلے میں غفلت

برت رہا تھا۔ اس نے ابھی تک شیریں کو عدالت میں پیش نہیں کیا تھا۔

ایسا عموماً اس صورت میں کیا جاتا ہے جب مخالف پارٹی تصفیے کا ارادہ رکھتی ہو لیکن شیریں یا اس کے وکیل کی جانب سے ایسی کوئی کوشش بھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی پتہ نہیں، شیریں نے اپنے ذہن میں کیا سوچ رکھا تھا۔ وہ خطرناک سوچ کی مالک ایک جارحیت پسند عورت تھی۔ اس کی طرف سے بھلائی کی توقع رکھنا عبث تھا۔

پانچ ماہ کے بعد عدالتی کارروائی میں تھوڑی تیزی دیکھنے میں آئی۔

اس دوران میں نے اپنا کام ایک لمحے کے لئے بھی موقوف نہیں کیا تھا۔ شیریں کے وکیل نے تو اسے عدالت میں پیش نہیں کیا تھا مگر میں نے سائرہ بیگم، صبا کے بیانات کے علاوہ سلیمان شاہ اور قاضی عبدالکریم کی گواہی بھی بھگتا دی۔ شیریں کی عدم موجودگی میں، میں نے یہ کیس جیتنے کے لئے بھی بڑی مضبوط بنیاد بنالی تھی۔ اس بنیاد پر فتح و کامیابی کی بلند و بالا عمارت کھڑی کی جاسکتی تھی۔ جب میں نے کیس کے حوالے سے اپنے ہاتھ پاؤں مضبوط کر لئے تو عدالت میں ہلچل کے لئے تیار ہو گیا۔ اس دوران حمید اللہ نے مجھے مزید مفید اور اہم معلومات فراہم کر دی تھیں جن میں بعض باتیں انکشاف انگیز تھیں ایک بات کا شاید میں ذکر کرنا بھول گیا، عدالت میں مقدمہ دائر کرتے ہی میں نے عدالت سے حکم امتناعی حاصل کرلیا تھا۔ اس حکم کی رو سے شیریں یا اس کا ماموں مرحوم کی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کے سلسلے میں کسی قسم کی خرید و فروخت نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مرحوم کے بینک اور ان تمام مالیاتی اداروں کو بھی لیگل نوٹس دے دیئے گئے تھے جن سے مرحوم کا کسی بھی قسم کا لین دین تھا۔ اسی قسم کا ایک نوٹس تمام معروف اخبارات میں بھی شائع ہو چکا تھا۔

اس پیشی پر جج نے میری مسلسل استدعا کے نتیجے میں وکیل صفائی کو خاصے سخت الفاظ میں تنبیہ کر دی۔

''آپ نے یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے؟ اس کیس کو عدالت میں لگے چھ ماہ ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک آپ نے اپنی موکل کو ایک مرتبہ بھی عدالت میں پیش نہیں کیا۔ آئندہ پیشی پر شیریں اقتدار کو عدالت میں حاضر ہونا چاہئے ورنہ یکطرفہ کارروائی عمل میں لا کر سائرہ اقتدار کے حق میں فیصلہ دے دیا جائے گا۔''

جج کی یہ دھمکی آمیز تنبیہ کام دکھا گئی۔ شیریں اور اس کا وکیل اس نوعیت کا کوئی رسک نہیں لے سکتے تھے لہٰذا آئندہ تاریخ پر وہ عدالت میں موجود تھی۔ یہ ہماری دوسری ''ملاقات'' تھی۔ پہلی ملاقات میرے دفتر میں ہوئی تھی اور اس میں، میں نے اس کا غرور و تکبر اور جاہ و جلال

دیکھا تھا لیکن آج وہ خاصی سنجیدہ اور متین نظر آ رہی تھی۔ عدالت کے کمرے ہی میں، حاضرین کے درمیان، ایک کونے میں، میں نے شیریں کے ماموں نجیب خان کی جھلک بھی دیکھ لی۔ اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ چھپ کر بیٹھنے کی کوشش میں ہو۔ میں نے اسے دیکھنے کے باوجود بھی نظر انداز کر دیا تاکہ وہ خود کو اپنی کوشش میں کامیاب سمجھتا رہے۔

شیریں گواہی کے لئے کٹہرے میں آ کر کھڑی ہوئی تو میری جرح سے قبل جج نے اسے کھری کھری سنا دیں۔

''بی بی! یہ عدالت ہے، تمہارے بنگلے کا ڈرائنگ روم نہیں کہ تمہارا جب جی چاہے وہاں آؤ اور جب جی چاہے نہ آؤ۔ تمہیں عدالت کے وقار کا خیال رکھنا چاہئے۔ پچھلے پانچ ماہ سے تم عدالت میں حاضر نہیں ہوئی ہو۔ آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔''

اس نے بڑے تحمل سے جج کی سرزنش سنی اور گہری سنجیدگی سے میری طرف دیکھنے لگی۔ آج وہ مجھے خاصی بدلی بدلی نظر آ رہی تھی۔ وہ تیزی اور تنتنا کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا جس کا مظاہرہ اس سے پہلے میں دیکھ چکا تھا۔ وہ اتنی سیدھی اور سادہ بھی نہیں تھی جیسی اس وقت دکھائی دے رہی تھی۔ یقیناً اس نے اس سادگی کے پیچھے کسی بہت بڑے فریب کو پناہ دے رکھی تھی۔

جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد میں جرح کے لئے شیریں والے کٹہرے کے نزدیک چلا گیا۔ میں نے کوئی سوال کرنے سے پہلے اس کے سراپا کا تنقیدی جائزہ لیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔

''مسز اقتدار! آپ نے عدالت تک پہنچنے میں خاصی دیر کر دی۔ خدانخواستہ آپ کی طبیعت تو ٹھیک تھی نا؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''اب تو ماشاء اللہ ٹھیک ہی نظر آ رہی ہیں۔'' میں نے چھپے ہوئے طنز کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں پچھلے پانچ چھ ماہ کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔''

''آپ میری طبیعت کے چکر میں نہ پڑیں۔'' وہ قدرے سخت لہجے میں بولی۔ ''جس کام کے لئے عدالت میں آئے ہیں اس پر دھیان دیں۔''

''تھینک یو مسز اقتدار!'' میں نے گردن کو تھوڑا خم دیتے ہوئے کہا۔ میں دانستہ ''شیریں صاحبہ'' کی بجائے اسے ''مسز اقتدار'' کے نام سے مخاطب کر رہا تھا۔ اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد میں نے کہا۔ ''آپ نے مجھے میرا کام یاد دلا کر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ سمجھیں، اب میں اپنا کام کرنے جا رہا ہوں۔''

میں نے تھوڑا توقف کر کے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہاں برہمی نمودار ہونا شروع ہوگئی تھی۔ اس کی یہ کمزوری میرے لئے مفید ثابت ہو سکتی تھی۔ اگر میں اس کے تحمل اور سنجیدگی کو توڑ ڈالتا تو اسے چت کرنا آسان ہو جاتا۔

''مسز اقتدار حسین!'' میں نے اس کے ماضی کی سمت نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ صحیح ہے کہ شادی سے پہلے آپ غریب آباد میں رہتی تھیں؟''

''بالکل غلط!'' وہ قطعیت سے بولی۔ ''آپ کی معلومات سراسر غلط اور بوگس ہیں۔ میں اقتدار سے شادی سے قبل گلشن اقبال میں رہتی تھی۔''

میں اسے جوش دلانے کے لئے دانستہ اس قسم کی جرح کر رہا تھا۔ جوش میں انسان اپنے ہوش گنوا بیٹھتا ہے اور میں یہی چاہتا تھا۔ شیریں کو آپے سے باہر لا کر ہی اپنا کام نکالا جا سکتا تھا۔ اس کے تیکھے جواب پر میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''آئی ایم ویری سوری! میں جوشِ جذبات میں کچھ زیادہ ہی پیچھے چلا گیا تھا۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ جب اقتدار حسین سے آپ کی شادی ہوئی تو آپ اپنے ماموں نجیب خان کے یہاں گلشن اقبال کے ایک بنگلے میں رہتی تھیں۔ اب تو میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''جی، یہ صحیح ہے۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

گویا، اس نے میرے پھینکے ہوئے جال میں قدم ڈال دیا تھا۔

جج نے آنکھیں سکیڑ کر میری طرف دیکھا اور بڑی دلچسپی سے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! وہ غریب آباد کا چکر کیا ہے؟''

جج نے میری مشکل آسان کر کے عدالت کے قیمتی وقت میں سے کئی لمحات بچا لئے ورنہ غریب آباد والا معاملہ واضح کرنے کے لئے مجھے شیریں سے گھما پھرا کر متعدد سوالات کرنا پڑتے۔ جج کی ''فرمائش'' کو ٹالنے کی میں غلطی نہیں کر سکتا تھا لہٰذا روئے سخن اسی کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! بات دراصل یہ ہے کہ کسی زمانے میں مسز اقتدار اپنے والدین کے ساتھ غریب آباد کے علاقے میں رہائش پذیر تھی۔ پھر والدین کے انتقال کے بعد اس کے ماموں نجیب خان اسے اپنے گھر لے گئے۔ یہ لگ بھگ دس سال کی عمر میں غریب آباد سے گلشن اقبال منتقل ہوگئی تھیں اور ــــــ پھر یہیں سے اس کی شادی ہوئی۔ میں ایک مرتبہ پھر معذرت چاہتا ہوں کہ میں نے ماضی بعید اور ماضی قریب کو آپس میں ملا دیا۔'' حمید اللہ کی فراہم کردہ معلومات بہت کام آ رہی تھیں۔

آخری جملہ میں نے شیریں کی طرف دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ وہ ناپسندیدہ نظر سے مجھے گھور کر رہ گئی۔ پتہ نہیں، کیا بات تھی کہ جج اس کیس میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی ظاہر کر رہا تھا۔ اس نے شیریں سے پوچھ لیا۔

''ہاں بی بی! وکیل صاحب تمہارے ماضی بعید کے سلسلے میں کسی غلط بیانی سے تو کام نہیں لے رہے؟''

''نن ـــــ نہیں۔'' وہ متذبذب انداز میں بولی۔ ''ہم پہلے غریب آباد ہی میں رہتے تھے۔''

وکیل صفائی نے جب دیکھا کہ اس کی مؤکل مشکل میں ہے تو وہ فوراً مدد کو لپکا۔ جج سے مخاطب ہوتے ہوئے اس نے کہا۔

''جنابِ عالی! میرے فاضل دوست غیر ضروری باتوں میں الجھ کر عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ انہیں تاکید کی جائے کہ یہ زیرِ ساعت کیس تک محدود رہیں۔''

جج نے وکیل صفائی کے اعتراض پر مجھ سے دریافت کیا۔ ''بیگ صاحب! کیا زیرِ ساعت کیس سے شیریں بیگم کے ماضی کا کوئی تعلق بنتا ہے؟''

''بڑا گہرا تعلق بنتا ہے یور آنر!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور اس تعلق کو میں ابھی ثابت کر سکتا ہوں۔'' میں نے لمحہ بھر کو توقف کیا پھر جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''جنابِ عالی! میں مانتا ہوں اس وقت معزز عدالت میں جس کیس کی ساعت جاری ہے اس کا تعلق مرحوم اقتدار حسین کی متروکہ جائیداد کی منصفانہ تقسیم سے ہے۔ لیکن اس کہانی کے بعض ایسے ٹوئسٹ ہیں جن کو کھولنے کے لئے مسز اقتدار حسین یعنی شیریں اقتدار کے ماضی میں جھانکنا بہت ضروری ہے۔''

جج نے وکیل صفائی کا اعتراض مسترد کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کا حکم دیا۔

میں کٹہرے میں، پیچ و تاب کھاتی شیریں کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''مسز اقتدار! کیا یہ درست ہے کہ آپ کے والد کا نام مسعود ریاض اور والدہ کا نام نجمہ تھا جو عرصہ پہلے قضائے الٰہی سے وفات پا چکے ہیں؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے استفسار کیا۔ ''کیا یہ صحیح ہے کہ آپ کے والد غریب آباد میں بناسپتی گھی اور کوکنگ آئل کی ایک ایجنسی چلاتے تھے جس سے اچھی خاصی آمدنی ہوتی تھی۔ والدین کے انتقال کے بعد آپ کا آبائی گھر اور والد صاحب کا کاروبار فروخت کر دیا گیا اور دس سال کی عمر میں آپ

ماموں کے گھر آ گئیں۔''

''جی ــــــ جی بالکل ایسا ہی ہوا تھا'' اس نے تصدیقی انداز میں کہا۔

میں نے سوالات کا زاویہ تھوڑا تبدیل کر دیا۔ میں نے اس دوران محسوس کیا تھا کہ میری جرح نے وکیل صفائی کو ایک خاص قسم کی بے چینی میں مبتلا کر رکھا تھا مگر مجھے اس کی تکلیف کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ میں نے شیریں کے ذہن کو حساس گوشے سے ہٹانے کے لئے اِدھر اُدھر کے سوال کرنا شروع کر دیئے۔

''مسز اقتدار! کیا یہ صحیح ہے کہ آپ فطری طور پر انتہائی غصیلی اور منتقم مزاج عورت ہیں۔ اپنی مرضی کے خلاف کچھ ہوتا دیکھ نہیں سکتیں؟''

''آپ میری فطرت اور مزاج کا بالکل غلط تجزیہ کر رہے ہیں۔'' وہ پھنکار سے مشابہ آواز میں بولی۔

''کیا یہ بھی غلط ہے کہ اس سے پہلے ہماری ملاقات ہو چکی ہے؟''

''نہیں ــــــ یہ غلط نہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اس سے پہلے ہم آپ کے دفتر میں مل چکے ہیں۔''

''اس وقت آپ کے ماموں نجیب خان بھی ساتھ تھے؟''

''جی ہاں ــــــ ہم دونوں ہی وہاں پہنچے تھے۔''

''کس سلسلے میں؟''

''سلسلہ آپ سے زیادہ کسے معلوم ہوگا۔'' وہ زہریلے انداز میں بولی۔ ''آپ نے مجھے ایک لیگل نوٹس بھیجا تھا اور ہمارے درمیان مصالحت کرانا چاہتے تھے۔''

''ہمارے درمیان ــــــ!'' میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ ''یعنی آپ کے اور ماموں کے درمیان؟''

وہ تیز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ ''آپ اتنے بھی سیدھے نہیں ہیں جتنا پوز کرتے ہیں۔'' پھر قدرے تلخ لہجے میں کہا۔ ''میں اس عورت کا ذکر کر رہی ہوں جس کی وکالت کے لئے اس وقت آپ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔''

میں نے بے ساختہ اپنے بوٹوں کو دیکھا پھر میری نگاہ ایڑی پر گئی، اس کے بعد پنجوں پر کھڑے ہو کر میں نے چھت کی سمت نظر دوڑائی اور اس اداکاری کی تکمیل پر شیریں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''مسز اقتدار! ــــــ ایڑی تک تو معاملہ صحیح ہے لیکن آپ نے میری چوٹی کا ذکر کہاں

سے نکال لیا؟''

وہ زچ ہوتے ہوئے بولی۔ ''میں نے یہ بات محاورتاً کہی ہے۔''

''تب تو کوئی بات نہیں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا اور جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''کیا آپ اس میٹنگ میں سائرہ بیگم نامی میری مؤکل سے تصفیے پر تیار ہو گئی تھیں؟''

''نہیں۔'' اس نے اپنی خوبصورت گردن کو نفی میں جھٹکا دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیوں؟''

''آپ کی تجویز میرے لئے قابلِ قبول نہیں تھی۔''

''اور آپ کی پیش کش کو میں نے ٹھکرا دیا تھا؟''

''بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔'' وہ زور دیتے ہوئے تائیدی انداز میں بولی۔

میں نے روئے سخن جج کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔ ''جنابِ عالی! میرے بھیجے ہوئے نوٹس کے جواب میں مسز اقتدار اپنے ماموں نجیب خان کے ہمراہ مجھ سے میٹنگ کرنے آئی تھیں اور بضد تھیں کہ میں پچاس ہزار سائرہ بیگم کو تھما کر معاملہ سیٹل کرا دوں لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ مرحوم اقتدار حسین اپنے پیچھے لگ بھگ سوا کروڑ کی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد چھوڑ کر گیا ہے۔ پچاس ہزار اور سوا کروڑ میں وہی تناسب ہے جو ہاتھی اور چیونٹی کے درمیان ہوتا ہے۔ میں نے شیریں اقتدار کو اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کی کہ وہ کم از کم تیس لاکھ کی جائیداد وغیرہ سائرہ بیگم کو دے دے لیکن وہ بڑے خطرناک انداز میں یہ کہتے ہوئے میٹنگ سے اٹھ گئی کہ ــــــ بیگ صاحب جس معاملے کو سیٹل کرانے کے تیس لاکھ روپے مانگ رہے ہیں وہ معاملہ بہ آسانی پانچ ہزار میں سیٹل ہو سکتا ہے ــــــ اور پھر واقعی اس نے پانچ ہزار میں یہ معاملہ سیٹل کرانے کی کوشش بھی کی جو بری طرح ناکام رہی اور ــــــ''

''یہ جھوٹ ہے ــــــ آپ بکواس کر رہے ہیں۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی چیخ کر بولی۔ ''میں نے کرائے کے غنڈوں سے ــــــ''

بولتے بولتے وہ یک دم رک گئی جیسے کوئی ڈرائیور اچانک سامنے آ جانے والے کسی خطرے کو دیکھ کر بے ساختہ بریک پیڈل دبا دیتا ہے۔ جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ ہکا بکا حاضرین عدالت کے منہ دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر کچھ اس قسم کے تاثرات تھے جیسے اس نے کوئی بہت بڑی غلطی کر ڈالی ہو۔ وکیل صفائی بھی خجل سے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل جائے تو اسے واپس نہیں لایا جا سکتا۔ کچھ بھی تھا، میں بڑی خوبی سے اپنے

مقصد میں کامیاب ہوگیا تھا۔
عدالت پر طاری مہیب سناٹے کو جج کی سرسراتی ہوئی آواز نے مجروح کر دیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ''بیگ صاحب! یہ کرائے کے غنڈوں کا کیا قصہ ہے؟ آپ تو پانچ ہزار روپے میں معاملے کے سیٹل منٹ کا ذکر کر رہے تھے؟''
میں نے فاتحانہ نظر سے شیریں اقتدار کی جانب دیکھا پھر جج کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''جنابِ عالی! یہ دونوں معاملات آپس میں منتھی ہیں۔ اصولی طور پر میں پانچ ہزار میں سیٹل منٹ والے حصے کا جواب دینے کے لئے پابند ہوں۔ کرائے کے غنڈوں کی وضاحت شیریں اقتدار کی ذمہ داری ہے لیکن ـــــــ''
میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا، قابل رحم نظر سے شیریں کو دیکھا پھر جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''جنابِ عالی! شیریں کی حالت ٹھیک نظر نہیں آ رہی اس لئے میں ان کو زحمت دیئے بغیر خود ہی اس معاملے کی وضاحت کر دیتا ہوں۔ ہاں، اگر ان کے خیال میں، میں کچھ غلط بول جاؤں تو انہیں اعتراض کا حق ہے۔''
پھر میں نے بڑی وضاحت سے جج کو اس قصے کے بارے میں بتایا اور آخر میں کہا۔ ''علاقے کے تھانے میں اس افسوس ناک واقعے کی رپورٹ درج ہے۔ میرے بیان کی تصدیق وہاں سے ہوسکتی ہے۔''
شیریں کی رہی سہی برداشت بھی جواب دے گئی۔ وہ غصے کی شدت سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے چلاّئی۔ ''اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ میں نے کرائے کے غنڈوں کو بھیج کر سائرہ بیگم کو دھمکانے کی کوشش کی تھی؟''
''سب سے بڑا ثبوت تو بے ساختگی میں کہے گئے آپ کے اپنے الفاظ ہیں۔'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''میں معزز عدالت کو پانچ ہزار والے سیٹل منٹ کے بارے میں بتا رہا تھا۔ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی آپ نے چیخ کر کہا ـــــــ میں نے کرائے کے غنڈوں سے ـــــــ اس کے بعد آپ یکلخت ایسے خاموش ہوگئیں جیسے آپ کو یہ انکشاف نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میں نے معزز عدالت کے سامنے دی جانے والی اپنی وضاحت میں کہیں بھی غنڈوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میرا خیال ہے، آپ کو اقرارِ حقیقت کر لینا چاہئے۔''
''وہ تو میں نے اُڑتی اُڑتی سنی تھی کہ غنڈوں والے واقعے کو مجھ سے منسوب کیا جا رہا ہے۔'' وہ بڑی چالاکی سے بات بناتے ہوئے بولی۔ اب وہ قدرے سنبھلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ''اس لئے میرے منہ سے غنڈوں والی بات نکل گئی۔''

"نکل نہیں گئی ـــــ بلکہ نکلتے نکلتے رہ گئی۔" میں نے گہری چوٹ کی پھر کہا۔ "چلیں، کوئی بات نہیں۔ اگر آپ نے غنڈوں کا ذکر اُڑتے اُڑتے سنا تھا تو ہم اس معاملے کو فی الحال ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ایسی بہت سی باتیں ہیں جنہیں موضوعِ جرح بنایا جا سکتا ہے۔"

میں نے تھوڑا توقف کیا تو شیریں اقتدار ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے تکنے لگی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہو کہ میں اس سے کس قسم کا سوال پوچھنے والا ہوں۔ لیکن آج میں اس کے تمام تر اندازوں پر پانی پھیرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھا۔ میں نے اپنی جرح کو جائیداد کی تقسیم ـــــ منصفانہ تقسیم کے قریب تر کرتے ہوئے شیریں سے استفسار کیا۔

"کیا یہ درست ہے کہ شادی سے پہلے آپ اقتدار حسین کے پاس ملازم تھیں؟"

"ہاں ـــــ یہ درست ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور پوچھا۔ "آپ کو کوئی اعتراض ہے کیا؟"

"قطعی نہیں۔" میں نے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کرتے ہوئے جلدی سے کہا پھر پوچھا۔ "کیا میں غلط تو نہیں کہہ رہا کہ اسی ملازمت کے دوران اقتدار حسین آپ کو پسند کرنے لگا تھا۔ پھر یہ پسندیدگی کچھ آگے بڑھی تو مرحوم نے آپ کو شادی کی پیش کش کر دی۔ آپ نے اپنے ماموں سے مشورہ کرنے کے بعد اس شادی کے لئے اپنی آمادگی ظاہر کر دی اس طرح یہ شادی ہو گئی؟"

"آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔" وہ میری بات کی تائید میں بولی۔ "بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔" پھر اس نے سخت لہجے میں پوچھ لیا۔ "کیا پسند کی شادی کرنا کوئی غلط بات ہے؟"

"پسند کی شادی کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔" میں نے گہری نظر سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "لیکن شادی کے سلسلے میں غلط بیانی کرنا ایک سنگین جرم ہے!"

"کون سی غلط بیانی؟" اس نے حیرت سے چونک کر میری طرف دیکھا۔

میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "مسز اقتدار! تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کے سامنے، آپ نے میری جرح کے جواب میں اپنے والد اور والدہ کے نام علی الترتیب مسعود ریاض اور نجمہ بتائے ہیں مگر آپ نے عدالت میں اپنے نکاح فارم کی جو فوٹو کاپی دائر کی ہے اس کی رو سے آپ کسی نجیب خان کی بیٹی ہیں۔ دُلہن کے نام والے کالم میں بڑے واضح الفاظ میں درج ہے۔ "شیریں بنت نجیب خان" کیا یہ دھوکا اور کھلا فراڈ نہیں ہے؟"

یہ بات مجھے حمید اللہ نے بتائی تھی کہ اقتدار حسین مرتے دم تک نجیب خان کو اپنا سسر سمجھتا

رہا تھا پھر جب شیریں کی جانب سے عدالت میں جوابِ دعویٰ داخل کیا گیا تو مجھے بھی اس نکاح فارم کی ایک کاپی فراہم کی گئی۔ تب میں پوری طرح دستاویزی طور پر اس دھوکے بازی سے آگاہ ہوا تھا۔

شیریں کا چہرہ ایک لمحے کے لئے متغیر ہوا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا اور لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ماموں جان نے مجھے اپنی بیٹی بنا کر پالا ہے۔ میں انہیں اپنا باپ ہی سمجھتی ہوں۔''

اس نے لنگڑی وضاحت پیش کی تو میں نے اس کو رگڑ کر رکھ دیا۔ ''کسی مجبوری کے تحت چچا، ماموں یا خالہ پھپھو کے گھر میں پرورش پانے والے بچے اپنے گارجین چچا، ماموں کو باپ کی جگہ ہی تصور کرتے ہیں۔ چچا، ماموں بھی انہیں اپنی اولاد ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن ان رشتوں، ان محبتوں اور ان قربانیوں سے بچوں کی ولدیت کا خانہ کبھی متاثر نہیں ہوتا۔ جب بھی ولدیت کی بات سامنے آتی ہے تو وہاں اصل والد کا نام ہی درج کیا جاتا ہے۔''

میں لمحہ بھر کو سانس درست کرنے کے لئے متوقف ہوا پھر زورِ بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے نکاح نامے جیسی اہم اور حساس دستاویز پر اپنے والد کی جگہ ماموں کا نام کیوں لکھوایا؟ کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ آپ دونوں ماموں بھانجی مل کر مرحوم اقتدار حسین کو ایک دھوکا دے رہے تھے؟''

''مم ـــــ میں نے کوئی دھوکا نہیں دیا۔'' وہ کمزور سی آواز میں بولی۔ ''اور میرے ماموں بھی ایسے نہیں ہیں۔''

''پھر ـــــ یہ اتنی بڑی غلطی کیوں ـــــ کیوں؟'' میں اس کی جان چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔

وہ منہ ہی منہ میں کچھ بدبدانے لگی۔ اس کی آواز کسی کی سماعت تک نہ پہنچ سکی۔

جج نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''بی بی! تم خاموش کیوں ہو؟''

''یہ ـــــ یہ سب کچھ ماموں کی ایما پر کیا گیا تھا ـــــ!''

جج چونکہ نکاح فارم کو تنقیدی نظر سے دیکھ چکا تھا اور صورتِ حال بھی اس کے سامنے تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے وکیل صفائی کی طرف دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ جج شیریں کے ماموں کی طلبی کے سلسلے میں احکام صادر کرنے والا ہے۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً کہا۔

''جنابِ عالی! جس ماموں کی کارستانی کے نتیجے میں یہ سارا کھٹ راگ پھیلایا گیا ہے وہ

اس وقت اس عدالت کے کمرے میں موجود ہے۔ اس سلسلے میں اس سے بھی تھوڑی جواب طلب ہونی چاہئے۔" پھر میں نے براہِ راست شیریں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے یہ شوشہ بھی چھوڑ دیا۔

"اس نکاح فارم کی رو سے شیریں بنت نجیب خان کا نکاح اقتدار حسین ولد افتخار حسین سے ہوا تھا جب کہ اس وقت مرحوم کی دولت اور جائیداد پر کسی شیریں بنت مسعود ریاض کا ناجائز قبضہ ہے۔ یہ تکنیکی اعتبار سے ایک متنازع معاملہ ٹھہرا۔ ولدیت کے سلسلے میں غلط بیانی کسی عظیم فراڈ سے کم نہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے یہ دونوں ماموں بھانجی ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت مرحوم اقتدار حسین کی جائیداد ——"

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی شیریں ہسٹریائی انداز میں چیخ اٹھی۔ "میں نے کوئی فراڈ نہیں کیا۔ میں کسی سازش میں شریک نہیں۔ میں —— میں ہی اقتدار کی بیوی تھی لہٰذا اس کی چھوڑی ہوئی ہر شے پر میرا حق ہے —— صرف میرا! میں کسی سائرہ بیگم کو نہیں جانتی۔ اقتدار نے اپنی زندگی میں کبھی کسی بیوی کا ذکر نہیں کیا۔"

میں نے اس کی کیفیت کی پرواہ کئے بغیر تیز لہجے میں کہا۔ "شیریں صاحبہ! عدم ذکر سے عدم وجود لازم نہیں آتا۔ اگر مرحوم نے کبھی آپ کے سامنے اپنی پہلی بیوی سائرہ بیگم کا ذکر نہیں کیا تو اس سے سائرہ بیگم اقتدار حسین کی زوجیت سے خارج نہیں ہو جاتیں۔ سائرہ بیگم اور آپ کے درمیان بھی مرحوم نے دو عورتوں علی الترتیب فہمیدہ خاتون اور سلمٰی سے دوسری اور تیسری شادی کی تھی۔ یہ دونوں مال دار اور صاحب ثروت بیوہ تھیں جن سے مرحوم نے بہت فائدہ اٹھایا۔ افسوس کہ یہ دونوں خواتین اب دوسری دنیا کی باسی ہو چکی ہیں۔ اس وقت اگر وہ زندہ ہوتیں تو سائرہ بیگم کی طرح جائیداد کی تقسیم کے لئے آپ کے مقابل کھڑی ہوتیں۔ بہرحال ——" میں نے لمحہ بھر کو توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"میری مؤکل نے عدالت میں، اقتدار حسین سے ہونے والے نکاح کے ثبوت کے سلسلے میں نکاح فارم کی مصدقہ کاپی داخل کی ہے جس کی رو سے لگ بھگ چوبیس سال پہلے ان دونوں کا نکاح ہوا تھا۔ نکاح خواں قاضی عبدالکریم اور نکاح کے ایک گواہ سلیمان شاہ نے عدالت میں اپنے خلفیہ بیانات ریکارڈ کروا دیئے ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں آپ سائرہ بیگم کے دعوے کو باطل قرار نہیں دے سکتیں۔ علاوہ ازیں سائرہ بیگم نے اپنی بیٹی صبا کا برتھ سرٹیفکیٹ بھی عدالت میں پیش کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے، وہ مرحوم اقتدار حسین کی سگی بیٹی ہے۔" پھر میں نے جج کی جانب رخ پھیرتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! صورتِ حال روشن دن کی مانند عیاں ہے۔ حالات و واقعات اور مصدقہ عوامل اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ میری مؤکل مرحوم اقتدار حسین کی پہلی بیوی ہے لہٰذا میں معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ محترمہ سائرہ بیگم کو اور اس کی بیٹی صبا کو مرحوم کے ترکے میں سے ان کا جائز حصہ دلوایا جائے۔ دیٹس آل یور آنر!''

میں دلائل ختم کر کے خاموش ہوا تو وکیل صفائی کو جلال آ گیا۔ خاصے دھواں دھار لہجے میں اس نے کہا۔ ''یور آنر! میری مؤکل شیریں اقتدار نے اپنے نکاح نامے کی جو فوٹو کاپی عدالت میں، جوابِ دعویٰ کے ساتھ منسلک کر کے پیش کی ہے اس میں مرحوم کے اندرجات کے ذیل میں ''عقد اول'' بڑے واضح الفاظ میں لکھا ہے جس کا مطلب ہے، مرحوم کی یہ پہلی شادی تھی۔ اس صورت میں مرحوم کی پہلی کسی بیوی کے وجود کو کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے؟''

''بہت خوب مائی ڈیئر کونسلر!'' میں نے مذاق اُڑانے والے انداز میں کہا۔ ''آپ بہت دُور کی کوڑی لائے ہیں۔ مرحوم کے ایک جھوٹ کو بنیاد بنا کر آپ اس کی سابق شادیوں کو تاریخ کے ریکارڈ سے خارج کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ عین ممکن ہے، مرحوم نے اپنی پہلی تین شادیوں کو چھپانے کے لئے اپنے حوالے سے ''عقد اول'' کا اندراج کرایا ہو۔'' میں لمحہ بھر کے لئے متوقف ہوا پھر اپنی بات میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''تھوڑی دیر کے لئے ہم فرض کر لیتے ہیں کہ مرحوم نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا، یہ واقعی اس کی پہلی شادی تھی اس صورت میں مذکورہ نکاح نامے کے تمام مندرجات کو سچ جاننا لازم ہو جائے گا۔ چنانچہ ''شیریں بنت مسعود ریاض'' کسی بھی قیمت پر مرحوم کی بیوہ کہلانے کی حق دار ہے اور نہ ہی اسے مرحوم کی دولت و جائیداد میں سے ایک پھوٹی کوڑی بھی ملنا چاہئے کیونکہ اس نکاح نامے کی رو سے مرحوم اقتدار حسین کا نکاح کسی شیریں بنتِ نجیب خان سے ہوا تھا۔ ایم آئی رائٹ مائی ڈیئر کونسلر؟''

وکیل صفائی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی شیریں احتجاجی لہجے میں چلاّ اٹھی۔ ''ماموں کی کسی مصلحت کی سزا مجھے نہیں ملنی چاہئے۔ ماموں نے مجھے یتیم بچی سمجھ کر سہارا دیا اور ولدیت کے خانے میں اپنا نام اس لئے لکھوا دیا کہ مجھے لاوارث نہ سمجھا جائے۔ یہ ان کی عقل مندی تھی یا کوئی مصلحت، اس کی وجہ سے میں کیوں محرومی کا دُکھ اٹھاؤں۔ میں نے اقتدار حسین سے شادی کی تھی۔ میں اس کی بیوہ ہوں لہٰذا مجھے حقِ وراثت سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔''

''میں بھی اتنی دیر سے یہی کہہ رہا ہوں۔'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''آپ کی طرح میری مؤکل سائرہ بیگم بھی مرحوم اقتدار حسین کی بیوہ ہے لہٰذا آپ کی طرح اسے بھی مرحوم کی دولت و

جائیداد سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔'' پھر میں نے روئے سخن جج کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔
''جنابِ عالی! معزز عدالت سے میری پُر زور اپیل ہے کہ جلد از جلد کسی فیصلے پر پہنچ کر مرحوم اقتدار حسین کی چھوڑی ہوئی ہر شے یعنی جائیدادِ منقولہ و غیر منقولہ کی منصفانہ تقسیم کے احکام صادر کئے جائیں۔''
جج تھوڑی دیر تک اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کا بغور جائزہ لیتا رہا ـــــ پھر پُر معنی انداز میں سر کو اثباتی جنبش دینے کے بعد وکیل صفائی کی طرف دیکھنے لگا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔
''وکیل صاحب! آپ مزید کچھ کہنا چاہیں گے؟''
جج نے اسے صفائی کا ایک موقع فراہم کیا تھا لیکن پچھلے ایک گھنٹے کی دھواں دھار سماعت اور میری کاٹ دار جرح نے شیریں کے ساتھ ساتھ اسے بھی سٹپٹا دیا تھا۔ اسی جھنجلاہٹ میں اس سے ایک سنگین غلطی ہوگئی۔ اس نے اپنی دانست میں شیریں کے کیس کو مضبوط کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ تو اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ وہ سائرہ کے کردار کو ''آف'' نہیں کر سکتا!
''یہ بھی تو ہوسکتا ہے ـــــ'' اس نے خاصے تیکھے انداز میں کہا۔ ''مرحوم اقتدار حسین نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دی ہو۔ اس صورت میں مطلقہ سائرہ، مرحوم کے ترکے میں سے ایک سوئی بھی حاصل کرنے کی حقدار نہیں ٹھہرائی جاسکتی!''
میں نے اُس کی اس سنگین غلطی کو ''گردن'' سے دبوچتے ہوئے جارحانہ لہجے میں کہا۔
''ایک مقولہ بہت مشہور ہے ـــــ جو بولے وہی کنڈی کھولے ـــــ تو میرے فاضل دوست!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ کا خیال ہے کہ مرحوم اقتدار حسین نے اپنی پہلی بیوی سائرہ بیگم کو طلاق دے دی تھی تو پھر یہ ذمے داری آپ پر عائد ہوتی ہے کہ آپ وہ طلاق نامہ معزز عدالت میں پیش کریں''
''م ـــــ میں ـــــ'' وہ بوکھلاہٹ آمیز انداز میں بغلیں جھانکنے لگا۔ ''میں کہاں سے پیش کروں؟''
''یہ سوچنا آپ کا کام ہے۔ کیونکہ آپ شیریں اقتدار کے وکیل ہیں'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''جس طرح میں نے سائرہ اقتدار کا وکیل ہونے کی حیثیت سے ثابت کیا ہے کہ چوبیس سال قبل مرحوم نے میری مؤکل سے شادی کی تھی۔ یہ شادی ایک ہی صورت میں کالعدم قرار دی جاسکتی ہے اگر آپ مذکورہ ''طلاق نامہ'' عدالت میں بطور ثبوت پیش کر سکیں۔''
وہ مجھے خاصی مشکل میں دکھائی دیا۔ میں اسے اسی مشکل میں مبتلا چھوڑ کر شیریں کی جانب

متوجہ ہو گیا۔ اگر اس کا وکیل مشکل میں تھا تو اسے آسانی میں نہیں رہنا چاہئے تھا۔

''تو شیریں صاحبہ! صورتِ حال خاصی گمبھیر ہے۔ میں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ میری مؤکل مرحوم اقتدار حسین کی پہلی بیوی ہے ــــــ مرحوم نے اس کی موجودگی میں، اس سے اجازت حاصل کئے بغیر آپ سے شادی کی۔ اس جرم کے لئے مرحوم کو سزا دینا تو ممکن نہیں رہا مگر عائلی قوانین کے مطابق، آپ کو مرحوم اقتدار حسین کی بیوہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا مرحوم کی منقولہ وغیر منقولہ جائیداد کی اصل وارث سائرہ بیگم اور اس کی بیٹی صبا ہیں۔ دیٹس آل ــــ!''

یہ سننا تھا کہ کٹہرے میں کھڑی شیریں آپے سے باہر نکل آئی۔ میرے سنگین الفاظ نے اس کا دماغ الٹ دیا تھا۔ وہ خود کو ہر شے سے محروم ہوتا دیکھ کر ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔ ادھر اس نے جنونی انداز میں کٹہرے سے نکلنے کی کوشش کی، اُدھر اس کے ''ماموں جان'' نے بھی راہِ فرار اختیار کرنے کی سوچی مگر مستعد عدالتی عملے نے بروقت کارروائی کر کے ان دونوں کی احمقانہ کوششوں کو ناکام بنا دیا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

جج نے عدالتی عملے کو ماموں بھانجی کے بارے میں خصوصی ہدایات دیں اور فیصلے کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

آئندہ پیشی پر عدالت نے اس کیس کا انتہائی منصفانہ فیصلہ سنا دیا۔ یہ فیصلہ مرحوم اقتدار حسین کی دونوں زندہ بیواؤں کے لئے حسب حال نہایت ہی مفید ثابت ہوا۔ میں اس فیصلے کی تفصیل بیان نہیں کروں گا صرف اتنا بتا دوں گا کہ خوددار سائرہ بیگم کو اس کی خودداری کا میری توقع سے زیادہ انعام ملا۔ ان ماں بیٹی کی بیس سال کی ریاضت کام آ گئی۔ صبر و برداشت اور خودداری جیسے اوصاف کا حامل شخص کبھی بے ثمر نہیں رہتا۔

ذہین قارئین کو دعوت ہے کہ وہ اپنی ذہانت کو استعمال کر کے عدالت کے منصفانہ فیصلے تک پہنچنے کی کوشش کریں ــــــ مجھے امید ہے، وہ پہنچ جائیں گے۔''

حساب برابر

دو کشتیوں کا سوار اکثر ڈوبتا ہے!
اکثر ــــــ ہمیشہ نہیں۔ جن کی کھوپڑی میں دماغ ہوتا ہے اور وہ عقل کا استعمال جانتے ہیں وہ سب سے پہلے کشتیوں کا درمیانی فاصلہ ختم کر کے انہیں ایک دوسرے کے اوپر رچ ڈالتے ہیں، پھر وہ سوار ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ خود ڈوبتے ہیں اور نہ ہی اپنی کشتی کو زیر آب جانے دیتے ہیں۔ وہ دو کشتیوں کی ایک کشتی بنا کر منزل پر منزلیں مارتے چلے جاتے ہیں۔ مگر وسیم درانی ایسا عقل مند نہیں تھا۔

اس نے غلط بیانی سے کام لے کر جو کھاتا کھولا تھا اسے چلانے کے لئے قدم قدم پر دروغ گوئی کا سہارا لینا پڑا۔ اپنی دونوں کشتیوں کو اوپر تلے یا پھر ایک ہی چار دیواری کے اندر رکھنے کی بجائے شہر کے دو مختلف حصوں میں بسا ڈالا۔ جھوٹ کی بنیاد پر کھڑی کی جانے والی عمارت زیادہ دنوں تک ایستادہ نہیں رہتی۔ اس نے بھی جس کھیل کا آغاز کیا تھا، وہ بھیانک انجام سے دوچار ہو گیا۔ اب وہ زمین کی چادر اوڑھ کر منوں خاک تلے دبا ہوا تھا اور ایک کشتی دوسری کشتی کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لئے کوشاں تھیں۔ تابندہ کو اپنے شوہر وسیم درانی کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا اور نرگس، وسیم کے لواحقین کے ساتھ مل کر اس کیس کی پیروی کر رہی تھی۔

مجھے یہ ساری باتیں تابندہ کے بوڑھے باپ کی زبانی معلوم ہوئیں جو اس وقت دل گرفتہ حالت میں میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

''وکیل صاحب!'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے آپ کو پوری کہانی سنا دی ہے۔ میری بیٹی سراسر بے گناہ ہے۔ اسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت قتل کے اس مقدمے میں پھنسایا گیا ہے۔ مجھے امید ہے، آپ تابندہ کو صاف بچا لیں گے۔''

میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''آفتاب صاحب! کسی شخص کے زبانی کہہ دینے سے کوئی بے گناہ ثابت نہیں ہو جاتا۔ اپنی بات اور دعوے کو عدالت کی نظر میں معتبر بنانے

کے لئے بہت زور لگانا پڑتا ہے۔ وکیل حالات و واقعات کی روشنی میں صرف زور ہی مار سکتا ہے۔'' میں نے لمحہ بھر کو توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کا مؤقف میں نے بڑی توجہ سے سن لیا ہے۔ اس کیس میں اچھی خاصی جان محسوس ہو رہی ہے۔ یہ میں اپنے محسوسات کی بات کر رہا ہوں ورنہ بظاہر دیکھنے میں آپ کی طرف سے یہ کیس ایک لاش کی طرح ہے۔ حالات و واقعات بتاتے ہیں کہ آپ کی بیٹی تابندہ کا بچنا بہت مشکل ہے لیکن میں ان حالات و واقعات سے اتفاق نہیں کرتا۔ میں کوئی حتمی بات کرنے سے پہلے آپ کی بیٹی سے ایک بھرپور ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد انشاء اللہ صورتِ حال واضح ہو جائے گی۔ اگر تابندہ نے وسیم کا خون نہیں کیا تو میں اسے سزا نہیں ہونے دوں گا۔ وہ با عزت بری ہو کر آپ کے ساتھ گھر جائے گی۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے بیگ صاحب!'' وہ دعائیہ انداز میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''تابندہ اس وقت کس تھانے کی حوالات میں بند ہے؟''

آفتاب حسین نے متعلقہ تھانے کا نام بتا دیا۔

میں نے کہا۔ ''میں آج دفتر سے فارغ ہونے کے بعد مذکورہ تھانے میں جا کر اس سے ملوں گا۔ آپ کل اسی وقت میرے پاس آ جائیں۔''

''ٹھیک ہے وکیل صاحب!'' وہ قدرے مطمئن ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں کل آ جاتا ہوں۔ لیکن میری درخواست ہے کہ اس کیس کو آپ ہی ڈیل کریں۔''

''آپ بے فکر ہو کر جائیں آفتاب صاحب! انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

پھر اس نے میری موجودہ فیس کے بارے میں استفسار کیا۔ میں نے اسے اپنی فیس بتا دی۔ اس نے اپنے والٹ میں سے فیس کی رقم کے برابر نوٹ گن کر میری جانب بڑھا دیئے۔ میں نے مذکورہ رقم کو اپنی میز کی دراز میں ڈالا اور اسے فیس کی وصولی کے ذیل میں ایک رسید بنا دی پھر کہا۔

''آفتاب صاحب! آپ کو یہ تو معلوم ہی ہو گا کہ یہ رقم صرف میری خدمات کی مد میں ہے۔ اس کے علاوہ دیگر عدالتی اخراجات آپ کو ہی برداشت کرنا ہوں گے؟''

''جی ہاں ــــــ ضرور!'' وہ ٹھوس انداز میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے ــــــ تو کل اسی وقت یہاں دوبارہ ہماری ملاقات ہو رہی ہے۔''

میرا یہ جملہ اس بات کا مہذب اظہار تھا کہ اب اسے میرے دفتر سے رخصت ہو جانا چاہئے۔ وہ اپنے داماد کے برخلاف خاصا عقل مند ثابت ہوا۔ میرے اشارے کو سمجھتے ہی وہ

کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''انشاء اللہ! کل ہم زیادہ پُر اُمید انداز میں ملیں گے۔''

میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے صرف اتنا کہا۔''انشاء اللہ!''

وہ مجھے سلام کر کے دفتر سے رخصت ہو گیا۔

آفتاب حسین کی اکلوتی بیٹی تابندہ اپنے شوہر وسیم درانی کے قتل کے الزام میں اس وقت جس تھانے میں بند تھی وہ میرے گھر کی راہ میں پڑتا تھا۔ اس روز دفتری مصروفیات سے نمٹنے کے بعد میں اپنی گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی جانب روانہ ہو گیا مگر متعلقہ تھانے میں جا کر تابندہ سے ملاقات کرنا ہرگز نہیں بھولا۔

تابندہ عدالتی ریمانڈ پر تھانے میں بند تھی اور اس پر اپنے شوہر کو قتل کرنے کا الزام تھا۔ اس نوعیت کے افراد سے تھانے میں ملاقات کی سبیل نکالنا کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن میں اپنے مخصوص ہتھکنڈے اور پینترے آزما کر ایسی ملاقات کی راہ نکال ہی لیا کرتا ہوں۔ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ طریقۂ کار میں پہلے بھی کئی مرتبہ انہی صفحات میں بیان کر چکا ہوں۔

اس رات میں نے ملزمہ تابندہ سے بڑی تفصیلی ملاقات کی۔ آفتاب حسین نے مجھے جو کہانی سنائی تھی، تابندہ نے مختلف پہلوؤں اور گوشوں پر روشنی ڈال کر اسے مکمل کر دیا۔ اس ملاقات کے اختتام پر میں نے تابندہ کو تسلی تشفی دی اور وکالت نامے پر اس کے دستخط لے لئے۔ اس نے میرے ہر سوال کا بڑا مدلل اور معقول جواب دیا تھا۔

مزید آگے بڑھنے سے قبل میں آپ کو اس کیس کے اہم واقعات اور کرداروں سے متعارف کرانا چاہوں گا تاکہ آپ مقدمے کے پس منظر اور تاریخ و جغرافیے سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔ کچھ واقعات تو مجھے تابندہ اور اس کے باپ آفتاب حسین کی زبانی معلوم ہوئے ہیں اور بعض اہم باتیں میں نے اپنے مخصوص ذرائع سے پتہ چلائی ہیں تاہم ان میں سے چند پوائنٹس میں دانستہ ابھی آپ سے مخفی رکھوں گا۔ یہ احتیاط اور اس کیس کا عین تقاضا ہے۔ بعد ازاں، عدالتی کارروائی کے دوران میں ان مخفی امور کو بڑی خوبصورتی سے اجاگر کر دوں گا۔

❀ ❀ ❀

وسیم درانی کا تعلق میرپور خاص سے تھا۔ اس کا پورا خاندان میرپور خاص ہی میں آباد تھا۔ صرف وہی ملازمت کے سلسلے میں کراچی میں قیام پذیر تھا۔ تاہم مہینے، دو مہینے میں وہ گاؤں کا چکر لگا آتا تھا۔ وہ ایک سرکاری محکمے سے وابستہ تھا اور اچھے عہدے پر کام کر رہا تھا۔ عہدہ اچھا

ہوتو لازماً تنخواہ بھی اچھی ہی ہوتی ہے۔اس پر مستزاد یہ کہ وسیم کے محکمے میں نیچے سے زیادہ اوپر کی آمدنی ہوتی تھی لہٰذا اس کی پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔ مصلحت کا تقاضا ہے کہ اس محکمے کا نام ظاہر نہ کیا جائے۔

اچھی آمدنی کے پیش نظر اس نے طارق روڈ کے علاقے میں ایک چھوٹا فلیٹ کرائے پر لے کر اس میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ آپ جانتے ہیں طارق روڈ ایک خالصتاً کاروباری علاقہ ہے اور اس کے دائیں بائیں پائے جانے والے فلیٹس میں بہت کم فیملیز آباد ہیں۔ آج کل تو پھر بھی نئے نئے اپارٹمنٹس پلازہ کھڑے ہو گئے ہیں اور رہائشی فیملیز کا تناسب بھی خاصا بڑھ گیا ہے لیکن تیس پینتیس سال قبل صورتِ حال خاصی مختلف تھی۔ فیملیز والے لوگ وہاں رہائش کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

وسیم نے جس بلڈنگ میں کرائے پر فلیٹ لے رکھا تھا اس میں اتفاق سے ایک بھی فیملی آباد نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک چار منزلہ عمارت تھی جس کی ہر منزل پر آمنے سامنے دو فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ وسیم فرسٹ فلور کے ایک فلیٹ میں قیام پذیر تھا۔ مذکورہ عمارت مین طارق روڈ کے عقبی حصے میں ایک گلی میں واقع تھی۔ اس کے گراؤنڈ فلور پر ریفریجریٹر اور ایئر کنڈیشنر مکینکس نے قبضہ جما رکھا تھا۔ اوپر کے فلیٹس میں بیچلرز بہ الفاظ دیگر ''چھڑے'' آباد تھے جن میں زیادہ تعداد ان ملازم پیشہ افراد کی تھی جو طارق روڈ کے بڑے بڑے شاپنگ اسٹورز میں نوکری کرتے تھے یا پھر ٹھیلے پتھارے لگاتے تھے ایک ایک فلیٹ میں چار چار، چھ چھ افراد مل کر رہ رہے تھے۔

وسیم چونکہ اچھا ''کماتا'' تھا اس لئے اچھا اُڑاتا بھی تھا۔ وہ ایک زمیندار خاندان کا چشم و چراغ تھا اس لئے فیملی کی مالی مدد کرنے جیسا بھی کوئی خاص مسئلہ نہیں تھا۔ اس بے فکری نے اسے فضول خرچ بنا دیا تھا۔ پھر اسے اچھا کھانے اور اچھا پہننے کا بھی شوق تھا۔ اس زمانے میں اس نے ایک چھوٹی سی گاڑی بھی رکھی ہوئی تھی اور فلیٹ کے ایک کمرے میں ایئر کنڈیشنر بھی موجود تھا جو اس نے نیچے والے ایک مکینک سے ''سیزن بیس'' پر لے رکھا تھا۔ اس دوران ہر قسم کی خرابی اور سروس وغیرہ اسی مکینک کے ذمے تھی۔ وسیم ایک سیزن کے لئے بس اسے لگی بندھی رقم دے دیا کرتا تھا۔ آج کل بھی مکینکس کے اس نوعیت کے دھندے بخوبی چل رہے ہیں۔

وسیم خوش شکل اور ہینڈسم تھا۔ صحت بھی قابل رشک پائی تھی۔ اس پر نوابانہ ٹھاٹ باٹ نے اس کی شخصیت کو اور بھی نکھار دیا تھا۔ بلڈنگ میں رہنے والے سارے چھڑے چھانٹ اس کا بے حد احترام کرتے۔ وسیم کی شخصیت کے اسی جادوئی اثر نے تابندہ کو بھی اپنا اسیر بنا لیا تھا۔

تابندہ کا باپ بھی ایک سرکاری محکمے میں ملازم تھا اور کسی بڑے آفیسر کا پی اے تھا۔ وسیم کے

محکمے کا اکثر و بیشتر آفتاب حسین کے محکمے سے واسطہ پڑتا رہتا تھا لہٰذا وسیم اور آفتاب کی بھی گاہے بہ گاہے ملاقات ہو جاتی۔ ایک مرتبہ تابندہ کسی ضروری کام سے اپنے باپ کے دفتر آئی ہوئی تھی۔ اتفاق سے اس وقت وسیم بھی آفتاب کے پاس موجود تھا۔ یہ تابندہ اور وسیم کا پہلا آمنا سامنا تھا۔ اس لمحاتی ملاقات نے ان دونوں کے دل و دماغ میں ہلچل مچا دی۔ تابندہ اس کی شخصیت سے متاثر ہوئی اور وہ تابندہ کے حُسن اور خوب روئی پر مر مٹا اور اسی وقت وسیم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ تابندہ کو حاصل کر کے رہے گا۔

آفتاب حسین کی رہائش گاہ ''ایف سی ایریا'' میں تھی۔ اس نے آفتاب سے کچھ اس قسم کی راہ و رسم بڑھائی کہ اس کے گھر بھی جانے لگا۔ اب جب بھی اسے آفتاب کے محکمے سے کوئی کام پڑتا تو وہ فون کر کے اس سے کہہ دیتا، انکل وہ فائل یا فلاں کاغذات آپ گھر لے جائیں۔ میں کسی وقت آ کر لے جاؤں گا۔ اس طرح وہ آفتاب کو یہ پیشکش بھی کر دیتا، انکل! آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں فلاں فلاں پیپر آپ کے گھر پہنچا دوں گا۔

آفتاب حسین، وسیم درانی کی اس سعادت مندی سے بہت خوش تھا کیونکہ اس طرح گھر بیٹھے بٹھائے اس کے بہت سارے کام ہو رہے تھے۔ دوسری جانب وسیم بھی اپنی کامیابی پر مسرور تھا۔ وہ اس سعادت مندی اور خدمت گزاری کے طفیل تابندہ کے دل میں اپنے لئے اچھی خاصی جگہ بنا چکا تھا۔ تابندہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اسی لئے لاڈلی اور خود پسند بھی تھی۔ اور اب تو اس کی والدہ بھی حیات نہیں تھیں۔ چند سال پہلے آفتاب حسین کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ گھر میں اب آفتاب حسین اور اس کی بیٹی کے سوا اور کوئی بھی نہیں رہتا تھا۔ اس نوعیت کے حالات نے وسیم کا کام اور بھی آسان کر دیا تھا لہٰذا اسے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کسی دشواری یا آزمائش سے نہیں گزرنا پڑا۔

وسیم اور تابندہ کا اپنی اپنی جگہ یہ خیال تھا کہ آفتاب حسین ان کے درمیان جنم لینے والی اس ''انڈر اسٹینڈنگ'' سے واقف نہیں۔ یہ ایک عمومی اور سطحی خیال تھا جو صد فیصد غلط تھا۔ آفتاب نے اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کئے تھے۔ وہ ایک جہاں دیدہ اور سرد و گرم چشیدہ انسان تھا۔ پھر وہ جس محکمے سے وابستہ تھا وہاں کی ڈیلنگ نے اسے دنیا جہاں کے تجربے سے سرفراز کر دیا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اسے اپنے گھر میں ہونے والی ''سرگرمیوں'' کی خبر نہ ہو۔

تابندہ اور وسیم کے درمیان تیزی سے بڑھنے والے تعلقات سے آفتاب حسین اچھی طرح آگاہ تھا۔ ایک روز اس نے بیٹی سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے آفتاب کو کسی لمبی چوڑی تمہید کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنی بیٹی سے بہت بے تکلف تھا۔ وہ

بھی بے دھڑک ہر بات اس سے کر لیتی تھی۔ بیوی کے انتقال کے بعد وہ تابندہ کے لئے باپ کے ساتھ ساتھ ایک ماں بھی بن گیا تھا۔

رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ ٹی وی دیکھ رہے تھے کہ آفتاب حسین نے اچانک تابندہ سے پوچھ لیا۔ ''بیٹی! یہ وسیم کیسا لڑکا ہے؟''

اس غیر متوقع سوال پر تابندہ نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے تک گہری سنجیدگی سے وہ آفتاب کے چہرے کا جائزہ لیتی رہی پھر بے اختیار قہقہہ مار کر ہنس دی۔ اس کی ہنسی میں بڑی بے ساختگی تھی۔

اب آفتاب کے حیران ہونے کی باری تھی۔ اس نے متذبذب لہجے میں پوچھا۔ ''اس میں ہنسنے والی کون سی بات ہے بیٹی؟''

''ڈیڈی!'' وہ باپ کو مخاطب کرتے ہوئے بدستور شوخ انداز میں بولی۔ ''آپ نے وسیم کو لڑکا کہا ـــــــ بس اسی بات پر مجھے خود بخود ہنسی آ گئی۔''

''اوہ!'' آفتاب نے بیٹی کی اس وضاحت پر معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں دوبارہ مستفسر ہوا۔ ''بیٹی! میں دراصل یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ وہ تمہیں کیسا لگتا ہے؟''

وسیم درانی کی عمر اس وقت لگ بھگ بتیس سال تھی۔ اصولی طور پر وہ ''لڑکا'' ہونے کی عمر سے کافی آگے جا چکا تھا اسی بناء پر تابندہ کی بے ساختہ ہنسی چھوٹ گئی تھی لیکن جب آفتاب حسین نے اپنے سوال کی وضاحت کر دی تو اس نے جواب دیا۔

''ڈیڈی! آپ وسیم کو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ اگر وہ آپ کو اچھا لگتا ہے تو پھر وہ اچھا ہی ہوگا۔''

اس نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بیٹی سے کہا۔ ''میں تو اس کو جانتا ہی ہوں اور تمہیں بھی اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ اگر مجھے وسیم میں کوئی عیب یا برائی نظر آتی تو میں اسے گھر میں آمد و شد کی کبھی اجازت نہ دیتا لیکن ـــــــ'' وہ سانس لینے کے لئے جملہ ادھورا چھوڑ کر متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''لیکن میں دیکھ اور محسوس کر رہا ہوں کہ تم بڑی سنجیدگی سے اس میں دلچسپی لے رہی ہو۔ مجھے تمہاری اس سنجیدگی پر تو کوئی اعتراض نہیں لیکن میں اپنی تسلی کی خاطر یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا وہ بھی اس معاملے میں سنجیدہ ہے؟''

''ہاں ڈیڈی! میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ بھی سنجیدہ ہے۔''

''کیا اس نے تمہیں پرپوز کیا ہے؟''
''اس نے واضح الفاظ میں تو کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی۔''
''اس کے خیالات اور رویے سے تمہیں کیا محسوس ہوتا ہے؟''
''میں نے یہی محسوس کیا ہے، وہ مجھ سے شادی کا خواہش مند ہے۔''
''اور خود تمہاری کیا خواہش ہے؟'' آفتاب حسین نے نہایت ہی اہم سوال پوچھا
''اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں بھی یہی چاہتی ہوں۔'' تابندہ نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔
''اگر وہ تم سے شادی کے لئے سنجیدہ ہے تو تم پر کھلنے کے ساتھ ساتھ اسے اس سلسلے میں مجھ سے بھی بات کرنی چاہئے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو نا؟''
''میں آئندہ ملاقات میں اس موضوع پر اس سے کھل کر بات کروں گی۔'' تابندہ نے پُریقین لہجے میں کہا۔ ''آپ اس طرف سے بے فکر ہو جائیں۔''
اور ـــــ آفتاب حسین واقعی بے فکر ہو گیا۔
اگلی بار جب وسیم ان کے گھر آیا تو تابندہ ذہنی طور پر اس سے کوئی حتمی اور واضح بات کرنے کے لئے تیار تھی۔ پھر خود وسیم نے ہی اس کا موقع بھی فراہم کر دیا۔ وہ تینوں اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ وسیم جانے لگا تو اس نے آفتاب حسین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
''انکل! چلیں آئس کریم کھاتے ہیں۔''
''آئس کریم!'' آفتاب نے متاملانہ انداز میں کہا۔
آفتاب نے بڑی خوبصورتی سے معذرت کر لی اور وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ کر آئس کریم کھانے چلے گئے۔
اس روز آئس کریم کھانے کے دوران تابندہ نے وسیم سے دوٹوک انداز میں بات کر لی۔ وسیم نے ہر زاویے پر اس سے اتفاق کیا اور اسے یقین دلایا کہ بہت جلد وہ اس موضوع پر اس کے ڈیڈی سے بات کرے گا۔ تابندہ نے رپورٹ آفتاب حسین کو پیش کر دی اور وہ مطمئن ہو کر اس دن کا انتظار کرنے لگا جب وسیم اس کے سامنے جھولی پھیلانے والا تھا۔ پھر ایک ہفتے بعد ہی وہ دن بھی آ گیا۔
وسیم نے نہایت ہی مختصر اور موزوں انداز میں اپنا مقصد آفتاب حسین پر واضح کر دیا۔ یہ میٹنگ لگ بھگ ایک گھنٹے پر محیط تھی جس کے اختتام پر آفتاب حسین کے سکون اور اطمینان کو پہلا جھٹکا لگا۔ جب اس نے وسیم سے کہا کہ وہ گاؤں سے اپنے کسی بڑے کو اس سے باقاعدہ بات چیت کے لئے کراچی بلائے تو وسیم نے بدکنے والے انداز میں جواب دیا۔

''انکل! یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔''
''ٹھیک نہیں ہوگا ـــــ کیا مطلب؟'' آفتاب نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
''اگر میرے گھر والوں کو اس بات کا پتہ چل گیا کہ میں کراچی میں شادی کر رہا ہوں تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی ـــــ'' وہ پراسرار انداز میں بولا۔''اس لئے وہاں سے کسی کو بلانا ممکن نہیں۔''

''تم بڑی عجیب بات کر رہے ہو وسیم!'' آفتاب نے اُلجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''یہ شادی بیاہ کے معاملات کوئی ہنسی مذاق تو نہیں ہوتے۔ میں جب تک تمہارے والدین یا کسی بڑے ذمے دار بھائی سے اس سلسلے میں گفتگو نہ کرلوں، میری تسلی نہیں ہوگی اور اس کا بڑا واضح مطلب یہی ہے کہ معاملہ آگے نہیں بڑھ سکے گا۔''

وسیم نے اپنے داؤ کو ذرا مختلف انداز میں آزمایا۔''انکل! آپ اطمینان رکھیں۔ میں اپنے گھر والوں کو بعد میں سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔ پھر کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔ آپ بے فکر رہیں ـــــ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''بعد میں ـــــ'' آفتاب حسین نے اُلجھن بھرے انداز میں دہرایا پھر وسیم سے پوچھ لیا۔''تمہارا مطلب ہے شادی کے بعد؟''

''جی انکل ـــــ شادی کے بعد۔'' وسیم نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

آفتاب کی پریشانی دوچند ہوگئی۔ اس نے دوٹوک الفاظ میں وسیم پر واضح کر دیا۔''برخوردار! پھر تو تم تابندہ سے شادی کا خیال اپنے ذہن سے جھٹک دو۔ خدانخواستہ ـــــ'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ـــــ خدانخواستہ تم لاوارث اور بے یار و مددگار نہیں ہو۔ تمہارا اپنا ایک مضبوط فیملی بیک گراؤنڈ ہے ـــــ پھر اس طرح مشکوک انداز میں چوری چھپے تمہیں شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

وسیم نے اچانک اپنی آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔ یہ ایک طرح سے اس کا نیا پینترا تھا۔ وہ چند لمحے مضطرب نگاہ سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر مایوس کن لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے انکل! ـــــ آپ کی مرضی ہے۔ آپ اچھی طرح سوچ لیں، میں نے تو آپ کو اپنی مجبوری بتا دی ہے۔''

آفتاب حسین کو یوں محسوس ہوا جیسے ایک اچھا رشتہ اس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہو۔ وہ وسیم کے لئے ایک آئیڈیل داماد کی حیثیت سے اپنا ذہن بنا چکا تھا۔ اسے امید نہیں تھی، اس کی

خواہش اور پسند کا کانچ محل اس برے انداز میں چکنا چور ہو جائے گا۔اس نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''تم نے اپنی کسی مجبوری کا ذکر تو کر دیا لیکن اس کے بارے میں کچھ بتایا نہیں؟''

''انکل! اصل میں بات یہ ہے کہ ہماری خاندانی روایت کے مطابق پہلی شادی خاندان ہی میں کرنا ہوتی ہے اس لئے اگر میں نے اپنے والدین کو اس شادی کے بارے میں بتا دیا تو وہ بڑا ہنگامہ مچائیں گے۔ پھر کسی بھی صورت یہ شادی ہو نہیں سکے گی۔''

''اوہ ــــــ!'' آفتاب نے ایک بوجھل اور گہری سانس خارج کی۔

''اب آپ کو میری مجبوری کا اندازہ ہو گیا ہو گا انکل؟'' وہ بڑی عیاری سے مستفسر ہوا۔

آفتاب حسین نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔''یہ تو بڑی خطرناک مجبوری ہے وسیم!''

''خطرناک کن معنوں میں انکل؟'' وسیم نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''بھئی دیکھو! اگر میں تمہاری مجبوری کو سمجھتے ہوئے تمہارے والدین کی شمولیت کے بغیر یہ شادی ہونے دیتا ہوں تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تمہارے گھر والے بعد میں کوئی ہنگامہ نہیں مچائیں گے؟''

''انہیں پتہ چلے گا تو وہ کوئی ردِعمل ظاہر کر سکیں گے نا!''

''یہ کیسے ممکن ہے، تم کراچی میں شادی کر بیٹھو اور انہیں کانوں کان خبر نہ ہو۔'' آفتاب حسین نے تعجب خیز نظر سے اسے دیکھا۔''کیا تم کبھی تابندہ کو اس کی سسرال لے کر نہیں جاؤ گے؟''

''دیکھیں انکل! شروع شروع میں بہت احتیاط کرنا پڑے گی۔'' وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔''کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

آفتاب نے اُلجھن زدہ لہجے میں کہا۔''میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟''

''دیکھیں انکل! میری بات غور سے سنیں۔'' وسیم نے نہایت ہی ہوشیاری سے سمجھانے والے انداز میں کہا۔''میں کچھ عرصہ تک اس شادی کو اپنے خاندان والوں سے خفیہ رکھوں گا۔ اس دوران تابندہ بھی میرپور خاص کا رُخ نہیں کرے گی۔ جب ایک مخصوص عرصہ گزر جائے گا تو میں گھر والوں کو اپنی شادی سے آگاہ کر دوں گا۔ ظاہر ہے، وقت گزر جانے کے بعد وہ کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔ انہیں اس شادی کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے ــــــ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اگر ایسا ہی پیش آئے تو زیادہ خرابی والی بات نہیں۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو سکا اور تمہارے والدین نے تابندہ کو اپنی بہو تسلیم کرنے کی بجائے تم پر

دباؤ ڈالا کہ تم تابندہ کو چھوڑ کر خاندان کی روایت کے مطابق شادی کرو تو پھر کیا ہوگا؟''
''یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ میں تابندہ سے کبھی الگ ہونے کا تصور کروں۔ اگر بعد میں کسی مرحلے پر والدین نے اس حد تک شادی کی مخالفت کی تو میں ان کے سامنے کبھی نہیں جھکوں گا ــــــ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔''
''یہ تم بہت بڑا فیصلہ کر رہے ہو۔'' آفتاب حسین نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''یہ تو بڑی پیچیدہ صورتِ حال ہے۔ یہ نہ ہو کہ بعد میں تمہیں اس فیصلے پر پچھتانا پڑے۔''
''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا انکل!'' اس نے پُرعزم انداز میں کہا۔ ''اور اس فیصلے کی ایک ٹھوس وجہ ہے۔ شاید آپ کو میری پلاننگ کا علم نہیں۔''
''کیسی پلاننگ ــــــ میں واقعی کچھ نہیں جانتا اس بارے میں۔'' آفتاب سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگا۔
وسیم درانی نے ٹھہر ٹھہر کر اسے اپنی منصوبہ بندی کے بارے میں بتایا کہ وہ گاؤں کی زندگی کو پسند نہیں کرتا۔ اسے وہ فرسودہ روایات بھی زہر لگتی ہیں جن پر اس کا خاندان صدیوں سے آنکھیں بند کر کے عمل کرتا چلا آ رہا ہے۔ وہ اپنے اندر ایک نئی روح کو کروٹیں لیتا محسوس کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کراچی میں رہے۔ اس تفصیل کے اختتام پر اس نے آفتاب حسین سے کہا۔
''جب مجھے اپنے خاندان والوں کی مخالفت کی پرواہ نہیں تو میں اگر چاہوں تو ان سے کٹ کر علی الاعلان بھی یہ شادی کر سکتا ہوں لیکن میں اس شادی کو فی الحال کچھ عرصہ تک پوشیدہ رکھ کر انہیں ایک چانس دینا چاہتا ہوں۔''
''کیسا چانس؟'' آفتاب حسین نے کچھ نہ سمجھنے والی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔
وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس طرح کم از کم میرے خاندان والوں کے لئے یہ دروازہ ضرور کھلا رہے گا کہ وہ جب بھی چاہیں، اس شادی کو تسلیم کر کے میرے ساتھ تعلقات استوار کر سکتے ہیں۔ ہمارے خاندان میں ایسی ایک دو مثالیں بھی ہیں کہ کسی نے اپنی مرضی سے خاندان سے باہر چھپ کر شادی کر لی۔ کچھ عرصے کی ناراضگی اور کشیدگی کے بعد اس شادی کو تسلیم کر کے ساری رنجش اور کدورت کو بھلا دیا گیا۔''
''تم مجھے سوچنے کے لئے تھوڑی مہلت دو۔ چند دن بعد ہم دوبارہ اس موضوع پر فائنل بات کریں گے۔''
''ٹھیک ہے انکل! میں آپ کے فیصلے کا انتظار کروں گا۔''
اس کے بعد وہ میٹنگ برخاست ہو گئی۔

آفتاب حسین نے یہ مہلت اس لئے لی تھی کہ وہ اپنی بیٹی سے اس سلسلے میں مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ وسیم کے ساتھ زندگی تابندہ کو گزارنا تھی اس لئے تمام حالات سے اس کا آگاہ ہونا زیادہ ضروری تھا۔ وہ مل بیٹھ کر حالاتِ حاضرہ کا جائزہ لیتے، پھر بڑی آسانی سے کسی فیصلے پر پہنچ سکتے تھے۔ اسی رات آفتاب حسین اور تابندہ روبرو بیٹھے تھے۔

آفتاب نے نہایت ہی مختصر اور جامع الفاظ میں بیٹی کو وسیم سے ہونے والی تفصیلی ملاقات کے بارے میں بتایا اور فیصلے کی گیند کو تابندہ کی کورٹ میں پھینکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔

''اس صورتِ حال میں تم کیا فیصلہ کرو گی؟''

تابندہ کے لئے بہت کم باتیں نئی تھیں۔ اکثر سے وہ پہلے ہی واقف تھی۔ چند لمحات تک غور کرنے کے بعد اس نے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔ ''ڈیڈی! یہ صورتِ حال خاصی اُلجھی ہوئی تو نظر آتی ہے لیکن ہمیں وسیم پر بھروسا کرنا چاہئے۔ وہ اگر حالات سے نمٹنے کا دعویٰ کر رہا ہے تو یقیناً ایسا کر بھی دکھائے گا۔''

''اس کا مطلب ہے تم ہر حال میں اور ہر قیمت پر وسیم کو اپنانا چاہتی ہو؟'' اس نے شکست خوردہ لہجے میں استفسار کیا۔ ''یہ تمہارا گویا حتمی فیصلہ ہے؟''

تابندہ کا جواب اثبات میں پا کر وہ خاموش ہو گیا۔

بیٹی کے سامنے تو اس نے چپ سادھ لی تھی اور تابندہ نے بھی یہ سمجھ لیا تھا کہ باپ کا فیصلہ اس کے فیصلے کی تائید میں ہے لیکن آفتاب حسین کے ذہن میں اس کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی پک رہا تھا۔ وہ جانتا تھا، زور زبردستی کر کے وہ بیٹی کو اس کے ارادے سے باز نہیں رکھ سکے گا لہٰذا وہ اس کی سیفٹی اینڈ سکیورٹی کے لئے ایک اور کارڈ کھیلنا چاہتا تھا۔

آفتاب حسین کے دفتر میں نعیم لاکھو نامی ایک شخص بھی کام کرتا تھا جو ہر طرف ''لاکھو، لاکھو'' مشہور تھا۔ لاکھو کا تعلق بھی میرپور خاص ہی سے تھا۔ وہ ایک چلتا پُرزہ قسم کا بندہ تھا۔ آفتاب نے دیکھا تھا کہ وسیم جب بھی دفتر میں اس سے ملنے آتا تو لاکھو سے بھی گپ شپ لگاتا اور یہ عین فطری بھی تھا۔ دونوں ایک ہی علاقے کے رہنے والے تھے لہٰذا ان کی میل ملاقات بنتی تھی۔ آفتاب حسین نے لاکھو سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا۔

تنہائی میسر آتے ہی اس نے لاکھو کو اپنے اعتماد میں لیا۔ لاکھو کی قسم کے تیز وطرار انسان موقع محل دیکھتے ہی خود کو حالات کے مطابق ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اس نے آفتاب حسین کے اسٹائل سے بھانپ لیا کہ وہ کسی اہم معاملے میں اسے اپنا رازدار بنانا چاہتا ہے۔ وہ فوراً پٹڑی پر آ گیا۔

''آفتاب بھائی! آپ مجھ پر بھروسہ رکھو اور بتاؤ معاملہ کیا ہے؟''

آفتاب نے مختصر الفاظ میں اسے مسئلے سے آگاہ کیا پھر کہا۔''میں اس سلسلے میں تمہارا تعاون چاہتا ہوں۔''

''کس قسم کا تعاون؟'' لاکھو دوستانہ لہجے میں بولا۔

آفتاب نے دھیمے انداز میں کہا۔''لاکھو! تم بھی اسی علاقے کے رہنے والے ہو جہاں سے وسیم کا تعلق ہے۔ میں وسیم کے خاندان اور وہاں کے حالات کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں یہ اندازہ لگانا چاہتا ہوں کہ اگر میں وسیم پر بھروسہ کرتے ہوئے ایسا کوئی قدم اٹھالوں تو بعد میں کوئی پیچیدگی تو پیدا نہیں ہوگی؟''

''میں آپ کا مطلب سمجھ گیا سائیں!'' لاکھو نے مدبرانہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ بے فکر ہو جاؤ۔ میں دو چار دن میں آپ کو رپورٹ دیتا ہوں۔''

وہ قدرے مطمئن ہوتے ہوئے بولا۔''لیکن ایک بات کا خیال رکھنا لاکھو!''

''کون سی بات سائیں؟'' لاکھو نے پوچھا۔

آفتاب نے بتایا۔''اس معاملے کی بھنک وسیم تک نہیں پہنچنا چاہئے کہ میں نے تمہیں کیا کام سونپا ہے۔تم میری بات سمجھ رہے ہونا؟''

''بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں آفتاب سائیں!'' وہ پختہ یقین دلانے والے انداز میں بولا۔''آپ جو خدشہ ظاہر کر رہے ہونا ـــــ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

آفتاب مطمئن تھا کہ لاکھو بڑی رازداری سے اس کا کام کر دکھائے گا۔اس طرح وہ زیادہ سہولت اور اطمینان سے کسی فیصلے پر پہنچ سکتا تھا۔ایک ایسا فیصلہ جو اس کی بیٹی بڑے واضح الفاظ میں سنا چکی تھی اور آفتاب حسین ان زمینی حقائق سے ہرگز ہرگز بے خبر نہیں تھا وہ جو کچھ بھی کر رہا تھا اسے اپنا فرضِ عین سمجھ کر کر رہا تھا حالانکہ اچھی طرح جانتا تھا، بالآخر ہوگا وہی جو تابندہ چاہے گی۔

انسان بہت سے ایسے کام کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے جو نہ کرنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ایسا وہ محض خود کو اطمینان دلانے کے لئے کرتا ہے۔ حالانکہ نتائج میں کوئی تبدیلی نہ آنے کے بارے میں وہ پہلے ہی پُر یقین ہوتا ہے ـــــ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کینسر کے آخری اسٹیج پر کھڑے مریض کی موت کا یقین ہونے کے باوجود بھی ہاتھ پاؤں چھوڑ کر علاج معالجہ ترک نہیں کیا جاتا۔ امید کے دامن اور یقین کی ڈور کو آخری سانس تک تھامے رکھنے کا نام انسانیت ہے۔ پتہ نہیں، ہم میں سے کتنے انسانیت کی اس معراج کو پہنچتے ہیں ـــــ واقعی پتہ

نہیں!

جیسے شہر میں، انسان کی عزت اور احترام اس کی دولت اور معاشرتی مقام کے حساب سے ہوتا ہے، ویسے ہی گوٹھ، گاؤں دیہات میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس کے پاس کتنی زمین اور دیگر جائیداد وغیرہ ہے۔ ایک سچے، مخلص، ایماندار اور نیک شخص کو کہیں بھی وہ درجہ نہیں دیا جاتا جس کا وہ استحقاق رکھتا ہو۔ میں نے انسان کے بارے میں فی زمانہ انسان کے رویے کی بات کی ہے اور ـــــ عموماً جیسا نظر آ رہا ہو، حقائق اس سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ لہٰذا خوش اخلاق، ایماندار، مخلص اور نیک لوگوں کو دل چھوٹا کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

میر پور خاص کے دیہات میں وسیم، لاکھو کی بہ نسبت زیادہ مقام و مرتبہ رکھتا تھا۔ لہٰذا روایت کی پاسداری کرتے ہوئے اسی روز شام میں لاکھو، وسیم سے ملنے اس کے فلیٹ پر پہنچ گیا پھر اس نے تمام ماجرا وسیم کو کہہ سنایا۔

وسیم اس کی کتھا سننے کے بعد گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے گمبھیر آواز میں لاکھو سے استفسار کیا۔ ''ٹھیک ہے ـــــ بتاؤ اس صورتِ حال میں تم کیا کرو گے؟''

''جو سائیں کا حکم!'' وہ مخصوص انداز میں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

آئندہ دس منٹ میں وسیم نے لاکھو کو اپنے اسپیشل ''حکم'' کی تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ اس دوران وہ معنی خیز انداز میں سر کو اثباتی جنبش دیتا رہا۔ اس ملاقات کے اختتام پر وسیم نے اپنی جیب سے کچھ رقم نکال کر لاکھو کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دی اور کہا۔

''آفتاب حسین کو یہ شک نہیں ہونا چاہئے کہ تم نے اپنا قبلہ پھیر لیا ہے۔ میں آئندہ بھی گاہے بہ گاہے تمہارا خیال رکھوں گا۔ جب بھی کوئی ضرورت ہو، تم میرے پاس آ سکتے ہو۔''

''بڑی مہربانی سائیں کی۔'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا پھر بڑی ہوشیاری سے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''چند روز بعد مجھے گاؤں جانا ہے۔ آپ نے کراچی والا مسئلہ تو حل کر دیا۔ اُدھر گاؤں ـــــ''

وہ دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر حاجت بھری نظر سے وسیم کو تکنے لگا۔ وسیم کو اس کی نیت بھانپنے میں کسی قسم کی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔ وہ فوراً سے پیشتر لاکھو کے اشارے کو سمجھ گیا۔ کراچی والے مسئلے سے اس کی مراد یہ تھی کہ وسیم نے اسے جو رقم دی تھی وہ آفتاب حسین کو بے وقوف بنانے کی مد میں تھی۔ اب وہ یہ چاہتا تھا کہ اسے کچھ اور رقم بھی ملنی چاہئے تا کہ وہ وسیم کی اس شادی کو اس کے خاندان والوں سے پوشیدہ رکھے۔ لاکھو، وسیم کے فیملی بیک گراؤنڈ سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس لئے وہ وسیم کی کمزوری سے کھیلنے کی کوشش میں تھا۔

دوسری جانب بھی کانٹے کا کھلاڑی تھا۔اس نے دوٹوک اور تحکمانہ انداز میں کہہ دیا۔
''فی الحال تم اسی پر گزارہ کرو۔ جب یہ شادی ہو جائے گی تو میں تمہیں اور بھی نوازوں گا۔ اس سلسلے میں تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔''

لاکھو نے وسیم کے وعدے پر یقین کرلیا اور اسے یقین بھی دلا دیا کہ وہ اس کی ہدایت پر پوری طرح عمل کرے گا۔آفتاب حسین کو شیشے میں اتارنے کے ساتھ ساتھ وہ اس بات کا بھی خاص خیال رکھے گا کہ وسیم کے گھر والوں کو اس شادی کے بارے میں معمولی سا شک بھی نہ ہو۔

آئندہ ملاقات میں لاکھو نے اپنا کام کر دکھایا۔آفتاب حسین کو رپورٹ پیش کرتے ہوئے اس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''سائیں! آپ آنکھیں بند کر کے یہ شادی کر ڈالو۔انشاء اللہ کوئی مسئلہ نہیں اٹھے گا۔ میں نے پوری تحقیق کر لی ہے۔''

''کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔'' آفتاب حسین کی بے قراری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

لاکھو نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کہا۔''ہمارے علاقے کی جو روایات ہیں ان سے تو آپ اچھی طرح واقف ہو سائیں! یہ سچ ہے کہ ہمارے ہاں پہلی شادی خاندان ہی میں کی جاتی ہے اور والدین اس شادی میں پوری طرح شریک ہوتے ہیں لیکن میری چھان بین سے دو تین ایسے کیس بھی سامنے آئے ہیں کہ جب کسی نے روایت کو توڑتے ہوئے خاندان سے باہر شادی کر لی، کچھ عرصے تک اس شخص کی والدین سے ناراضگی اور بائیکاٹ رہا لیکن رفتہ رفتہ یہ غصہ اور خفگی جاتی رہی اور نہ صرف یہ کہ اس شخص کو واپس خاندان میں داخل کرلیا گیا بلکہ اس کی بیوی کو بھی باقاعدہ بہو کا درجہ دیا گیا۔ایک زندہ مثال تو وسیم کے کزن ہی کی ہے ——— '' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''وسیم کا تایا زاد ریاض احمد کافی عرصے سے یورپ گیا ہوا تھا اور پھر اس نے وہیں ایک گوری سے شادی کر لی۔ ماں باپ تک یہ خبر پہنچی تو انہوں نے بہت شور مچایا۔ ریاض ثابت قدمی سے والدین کی مخالفت کے سامنے ڈٹا رہا۔آخر کار والدین ہی کو ہار ماننا پڑی۔ یہ ریاض اپنی بیوی کو لے کر گاؤں پہنچا تو سب کے چہروں کی خفگی پلک جھپکتے میں ڈھل گئی۔ آج کل ریاض اپنی انگریز بیوی کے ساتھ یورپ ہی میں رہتا ہے۔ وہ لوگ صرف گرمیوں کے موسم میں مہینے، دو مہینے کے لئے یہاں آتے ہیں۔ پچھلے دنوں وہ دونوں آئے ہوئے تھے پھر واپس چلے گئے۔اور جہاں تک وسیم کے والدین کا تعلق ہے ———''

وہ ایک مرتبہ پھر ڈرامائی انداز میں متوقف ہوا پھر اپنی بات کا خاتمہ کرتے ہوئے بولا۔''وہ

لوگ ریاض احمد کے ماں باپ کی بہ نسبت بہت ٹھنڈے دماغ کے ہیں۔ جب ریاض کے والدین نے اپنے بیٹے کی خطا کو معاف کر دیا تو پھر وسیم کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ آپ بے دھڑک ہو کر بسم اللہ کرو آفتاب سائیں!''

لاکھو کی اس ماہرانہ اور تحقیقاتی رپورٹ کے بعد وہ واقعی مطمئن ہو گیا۔ پھر بڑے دوستانہ انداز میں اس نے کہا۔ ''لاکھو! اب تم شادی والے اس راز میں برابر کے شریک ہو چکے ہو۔ مجھ پر ایک مہربانی کرنا۔ اس کے لئے میں عمر بھر تمہارا احسان مند رہوں گا۔''

''کیسی مہربانی آفتاب سائیں؟'' لاکھو یکدم انجان بن گیا۔ حالانکہ وہ آفتاب کی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

آفتاب نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''میرے اس راز کو تم اپنے سینے میں دفن رکھنا۔ شادی کے بعد جب تک حالات ٹھیک نہیں ہو جاتے، شادی کی خبر وسیم کے گھر تک نہیں پہنچنا چاہیے۔''

''یہ بھی کوئی بتانے کی بات ہے سائیں!'' لاکھو نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ''آپ اس سلسلے میں بے فکر ہو جاؤ سائیں! میری طرف سے ذرا سی آواز نہیں نکلے گی۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے ایسی نظر سے آفتاب حسین کو دیکھا جیسے اس ''راز داری'' کے صلے میں وہ کوئی امید لگائے بیٹھا ہو۔ آفتاب اس کی نگاہ کو پہچان گیا، جلدی سے بولا۔ ''تم فکر نہ کرو لاکھو! میں محکمے کے اندر اور باہر تمہارا خاص خیال رکھوں گا۔''

''بڑی مہربانی سائیں کی۔'' لاکھو نے زیر لب مسکراتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔

لاکھو نہایت ہی تیز وطرار اور موقع پرست انسان تھا وہ ایک ہی تیر سے کئی شکار کرنے میں مہارت رکھتا تھا اور یہ پراجیکٹ تو بیٹھے بٹھائے خود اپنے قدموں سے چل کر اس کے پاس آ گیا تھا۔ پھر وہ اس سے کیونکر فائدہ نہ اٹھایا۔ وہ دونوں دھڑوں کو کند استرے سے مونڈنے کے موڈ میں دکھائی دیتا تھا۔

قصہ مختصر، تابندہ اور وسیم کی شادی نہایت ہی پُرسکون ماحول میں ہوگئی جس میں وسیم کی فیملی کے کسی ممبر نے شرکت نہیں کی۔ یہ اگرچہ ایک خلافِ معمول بات تھی لیکن لوگوں کے سوالات کے جواب میں کہنے کے لئے باہمی رضامندی سے، پہلے سے بہت کچھ طے کر لیا گیا تھا لہٰذا کسی دشواری کا سامنا ہوا اور نہ ہی کوئی بدمزگی پیدا ہوئی۔ ویسے بھی آفتاب حسین کے زیادہ رشتے دار وغیرہ نہیں تھے۔ اس لئے بھی سب کچھ خوش اسلوبی سے نمٹ گیا۔ ایسے مواقع پر سب سے زیادہ فتنہ پروری قریبی رشتے دار ہی جگاتے ہیں۔

شادی کے بعد وسیم نے تابندہ کو طارق روڈ والے فلیٹ ہی میں رکھا۔ یہ اس رہائشی عمارت

میں پہلی فیملی آباد ہوئی تھی دیگر مکینوں پر چونکہ وسیم کا خاصا رعب داب تھا اس لئے وسیم چھڑوں کے بیچ رہائش اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا تھا۔ بہرحال تابندہ کی خواہش تھی کہ وسیم کرائے کا وہ فلیٹ چھوڑ کر ایف سی ایریا ہی میں آباد ہو جائے۔ اس طرح وہ باپ کے بھی قریب ہو جائے گی۔

وسیم نے بڑی توجہ سے اس کی تجویز سنی اور کہا۔ ''ایسا کیوں نہیں ہوسکتا کہ تمہارے ابا ایف سی ایریا کو چھوڑ کر طارق روڈ آجائیں۔ اس طرح بھی وہ تمہارے قریب ہو جائیں گے۔''

''دراصل بات یہ ہے وسیم! کہ اس گھر میں رہتے ہوئے ہمیں کئی سال ہو گئے ہیں۔'' تابندہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''امی کا انتقال بھی اسی فلیٹ میں ہوا تھا۔ اس فلیٹ سے ابو کی بہت ساری یادیں وابستہ ہیں اسی لئے وہ وہاں سے کہیں اور جانے کے بارے میں نہیں سوچتے۔''

''تمہاری دلیل میں بہت وزن ہے۔'' وسیم نے معتدل انداز میں کہا۔ ''لیکن میرے نزدیک اسٹیٹس کی بڑی اہمیت ہے۔ تم خود جانتی ہو، ایف سی ایریا اور طارق روڈ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔''

''ہاں، وہ تو ہے۔'' تابندہ نے تائیدی انداز میں کہا۔

وہ بولا۔ ''تمہیں تمہارے باپ کے قریب کرنے کے لئے اب یہی ہوسکتا ہے کہ ہم سب کسی تیسری جگہ رہائش اختیار کرلیں۔ لیکن یہ تمہارے ڈیڈی کے لئے قابل قبول نہیں ہوگا ــــــ کیونکہ تمہاری امی کی یادیں اس فلیٹ ــــــ؟''

وسیم نے سوالیہ انداز میں جملہ نامکمل چھوڑا تو تابندہ نے جلدی سے کہا۔ ''چلیں چھوڑیں اس قصے کو۔ جو ہے، جہاں ہے، اسے چلنے دیتے ہیں۔''

تابندہ نے ایک طرح سے اس موضوع کو بند کرنے کی کوشش کی تھی۔ بہرحال تابندہ کی دل جوئی کے لئے اس نے پوچھ لیا۔ ''تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟''

''تمہارے ساتھ رہتے ہوئے کہیں بھی مجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوسکتی وسیم!'' تابندہ نے اس پر اپنے اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

اسی اعتماد کے سہارے طارق روڈ والے فلیٹ میں ایک سال دیکھتے ہی دیکھتے گزر گیا۔ وسیم کی طرف سے تابندہ پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ جب چاہے اکیلے یا اس کے ساتھ اپنے ڈیڈی سے ملنے جاسکتی تھی۔ بس وہ اتنا چاہتا تھا کہ اس کی بیوی رات کو واپس آجائے۔ تابندہ اس سیٹنگ سے بہت خوش تھی۔ وسیم خود مہینے، دو مہینے میں ایک بار دو تین روز کے لئے

میر پور خاص چلا جاتا تھا۔ اس عرصے کے دوران تابندہ اپنے ڈیڈی کے گھر ایف سی ایریا میں قیام کرتی تھی۔

شادی کا ایک سال ہنسی خوشی گزر گیا تو آفتاب حسین مطمئن ہو گیا۔ اس کے سارے اندیشے اور خدشے ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آئے گا۔ اگر کچھ ہونا ہوتا تو اب تک ہو جانا تھا۔ وہ اپنے داماد کی لیاقت اور دانشمندی پر نازاں تھا جس نے بڑی خوش اسلوبی سے معاملے کو نبھا رکھا تھا۔

انسان بنیادی طور پر بڑا خوش فہم ہے۔ تھوڑے سے اطمینان کو وہ بہت زیادہ جان کر یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ آگے سکون ہی سکون ہے۔ مگر اطمینان اور سکون بھی اپنی نوعیت کے دو عظیم کھلاڑی ہیں جو بڑی خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ انسان کے احساس کو نت نئی آزمائشوں میں ڈالتے رہتے ہیں۔ اپنی ایک جھلک دکھلا کر انسان کو خاصا بے پرواہ بنا دیتے ہیں۔ جب وہ ان کی طرف سے بے خبر ہو جاتا ہے تو پھر یہ بڑے خونخوار انداز میں حملہ آور ہوتے ہیں۔ آفتاب کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا واقعہ پیش آیا تھا۔

وہ سکون اور اطمینان کے رتھ پر سوار خراماں خراماں آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک دن اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے نیچے سے کسی نے زمین کھینچ لی ہو۔ اس کی ہر خوشی اور ہر غم تابندہ سے جڑا ہوا تھا۔ تابندہ کی پریشانی نے اسے حد درجہ پریشان ہونے پر مجبور کر دیا تھا کیونکہ اچانک ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس کا دور دور تک امکان تھا اور نہ ہی ایسا تصور کیا جا سکتا تھا۔

وسیم حسب معمول تیار ہو کر دفتر روانہ ہو چکا تھا۔ تابندہ اس وقت گھر پر اکیلی ہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی، تھوڑی دیر بعد مارکیٹ جا کر سودا سلف خرید لائے گی پھر کھانا پکانے میں لگ جائے گی۔ وہ گھر سے نکلنے ہی والی تھی کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔

جب وسیم گھر میں نہیں ہوتا تھا تو وہ دیکھے بھالے بغیر کسی بھی آنے والے کے لئے دروازہ نہیں کھولا کرتی تھی۔ اس زمانے میں اسپیکر والے گیٹ انٹر کام کا رواج شروع نہیں ہوا تھا، تاہم ان کے فلیٹ کے داخلی دروازے میں ''آئی گلاس'' نصب تھا۔ تابندہ اسی آئی گلاس پر آنکھ ٹکا کر باہر موجود شخص کو با آسانی دیکھ لیتی تھی۔ اس روز دستک کے جواب جب اس نے آئی گلاس کے توسط سے باہر جھانکا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس حیرت میں حد درجہ اُلجھن بھی شامل تھی۔

اُسے اپنی نگاہ کے سامنے جو چہرہ نظر آیا وہ ہو بہو وسیم تھا۔ وسیم کو دیکھنا کوئی چونکنے والی بات نہیں تھی۔ اس کی حیرت کا سبب یہ تھا کہ اس کی عمر تیس پینتیس سال سے بہت زیادہ دکھائی

دے رہی تھی۔ علاوہ ازیں اس کے چہرے پر باقاعدہ داڑھی بھی نظر آ رہی تھی۔ وسیم صبح جب دفتر کے لئے گھر سے نکلا تھا تو ایسا ہرگز نہیں تھا۔ پھر یہ کیا ماجرا تھا؟

بڑی تیزی سے موجودہ صورتِ حال کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک کرن سی پھوٹی۔ اگلا سوال کچھ اس انداز میں اُبھرا۔ ''کہیں یہ شخص وسیم کا باپ تو نہیں؟''

یہ ایک خاصا خطرناک اور گڑبڑا دینے والا سوال تھا۔ وہ شش و پنج میں مبتلا ہو گئی کہ اس شخص کے لئے دروازہ کھولے یا نہ کھولے۔ اس دوران باہر کھڑے وسیم سے گہری مشابہت رکھنے والے شخص نے آہستگی سے دوبارہ دستک دی۔ تابندہ کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ جب تک وہ دروازہ نہیں کھولے گی وہ شخص وہاں سے ٹلے گا نہیں۔ پھر ایک حتمی فیصلے پر پہنچنے کے بعد اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر استفسار کیا۔

''کون ہے؟''

باہر سے اندرونِ سندھ کے مخصوص لب و لہجے میں جواب آیا۔ ''میں ہوں، کلیم درانی ـــــ وسیم درانی کا باپ!''

''وسیم تو دفتر گیا ہوا ہے۔'' تابندہ نے سنبھل کر جواب دیا۔

''یہ تو مجھے بھی معلوم ہے، وہ اس وقت دفتر میں ہو گا۔'' کلیم درانی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر مجھے اس سے ملنا ہوتا تو میں سیدھا اس کے دفتر کی طرف جاتا۔ میں خاص طور پر تم سے ملنے آیا ہوں۔ تم تابندہ بی بی ہو نا؟''

سسر کے اس استفسار نے تابندہ پر واضح کر دیا کہ ان کی شادی کی کہانی کراچی کی فضاؤں سے پرواز کر کے میر پور خاص کے گاؤں تک پہنچ چکی ہے۔ اس حقیقت کے آشکار ہوتے ہی وہ گھبرا گئی تھی لیکن پھر فوراً ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔ وہ بنیادی طور پر ایک حقیقت پسند عورت تھی۔ اتنا جانتی تھی، ایک نہ ایک روز اس سچویشن سے اس کا پالا ضرور پڑے گا۔ اس نے لمحاتی سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ وہ اپنے سسر کو ویل کم کہے گی۔

اس سے قبل کہ وہ دروازہ کھولتی، اس کے سسر نے اُلجھن زدہ انداز میں پوچھ لیا۔ ''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟''

جواب دینے کی بجائے اس نے دروازہ پورا کھول دیا اور نہایت ہی مہذب انداز میں بولی۔ ''انکل! آپ اندر تشریف لے آئیں۔ یہ آپ کے بیٹے کا گھر ہے ـــــ اور میں آپ کی بہو تابندہ ہوں۔''

کلیم درانی ایک لفظ ادا کئے بغیر فلیٹ کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے

ڈرائنگ روم تک پہنچے۔ تابندہ گہرے تذبذب کا شکار تھی کہ اچانک پتہ نہیں، کون سا طوفان اٹھ کھڑا ہو۔ لیکن ایسا کچھ بھی پیش نہ آیا۔ کلیم بے حد سنجیدہ اور سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ایک صوفے پر بیٹھنے کے بعد اس نے سپاٹ انداز میں تابندہ سے کہا۔

''تم فوراً وسیم کو فون کرو ــــــ اور اسے بتاؤ کہ میں آیا ہوں۔ وہ جتنی جلدی ممکن ہو یہاں چلا آئے۔''

تابندہ نے سسر کے حکم کی تعمیل کی پھر وہ اس کی خاطر تواضع کے لئے کچن کا رُخ کرنے ہی والی تھی کہ کلیم درانی نے اسے سختی سے منع کر دیا اور تحکمانہ لہجے میں بولا۔

''تم ادھر ہی میرے سامنے بیٹھو۔ جب تک وسیم نہیں آ جاتا، میں تم سے بات کروں گا۔ کھانے پینے کے معاملات کو بعد میں دیکھیں گے۔''

تابندہ متاملانہ انداز میں کلیم درانی کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اگلے ہی لمحے اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ امتحان کے کمرے میں کسی سخت گیر ممتحن کے سامنے بیٹھی ہو۔ کلیم بڑے کڑے انداز میں اس کا ''انٹرویو'' کرتا رہا۔ زیادہ تر سوالات ان کی شادی کے بارے میں تھے۔ تابندہ نے ہر سوال کا بالکل درست اور کھرا جواب دیا۔ کلیم نے باور کرایا کہ وہ ان تمام باتوں کی وسیم سے تصدیق بھی کرے گا۔ تابندہ نے اسے یقین دلایا کہ اس نے کسی بھی مرحلے پر غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔ وہ جس سے چاہے ان واقعات کی تصدیق کر سکتا ہے۔ اس انٹرویو کے اختتام پر کلیم نے گویا تابندہ کے سر پر ایٹم بم پھینک دیا۔ گہری نظر سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے وسیم نے تمہیں اپنی بیوی بچوں کے بار میں کچھ نہیں بتایا؟''

''بیوی بچے ــــــ؟'' بے ساختہ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے وہ اچھل پڑی۔

کلیم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''وسیم کی نہ صرف شادی ہو چکی ہے بلکہ وہ دو بچوں کا باپ بھی ہے۔ اس کی بیوی نرگس اور دونوں بچے ادھر گاؤں میں رہتے ہیں۔ سلطان سات سال کا ہے اور رخسانہ چھ سال کی۔ جس طرح وسیم نے تم سے اپنی شادی کو ہم سے خفیہ رکھا ہوا ہے بالکل ویسے ہی اس نے اپنی شادی کو تم سے چھپا رکھا ہے۔''

''یہ ــــــ یہ نہیں ہو سکتا۔'' تابندہ کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ''وسیم مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔'' وہ ہسٹریائی انداز میں بولی۔ ''انکل! کہہ دیں کہ آپ کوئی بھیانک مذاق کر رہے ہیں۔''

''میں تم سے مذاق کرنے کے لئے اتنا طویل سفر طے کر کے یہاں نہیں آیا ہوں۔'' کلیم

نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''حقیقت وہی ہے جو میں نے بیان کر دی ہے۔ جس طرح تمہیں یقین نہیں آ رہا کہ وسیم نے تم سے غلط بیانی کی ہے، ویسے ہی مجھے بھی امید نہیں تھی، وہ مجھ سے جھوٹ بولے گا یا اپنے اس کارنامے کو مجھ سے پوشیدہ رکھے گا۔''

''لل ـــــــ لیکن یہ سب کیسے ہو گیا؟'' تابندہ نے بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا ـــــــ ایسا نہیں ہونا چاہئے ـــــــ ایسا ـــــــ'' بولتے بولتے اس کی آواز رُندھ گئی۔

''تم اس وقت بہت زیادہ جذباتی ہو رہی ہو ـــــــ اور ظاہر ہے، ہونا بھی چاہئے۔ تمہیں اس انکشاف نے ذہنی صدمہ پہنچایا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے اور رسانیت بھرے لہجے میں بولا۔ ''لیکن تمہیں اپنے ذہن کو زیادہ اُلجھانے کی ضرورت نہیں۔ وسیم یہاں آ رہا ہے۔ ابھی تمہارے سامنے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔''

تابندہ منہ سے کچھ نہیں بولی، بس اپنی گردن کو نفی میں جھٹکتی رہی۔ شادی کا ایک سال گزر جانے کے بعد وہ ذہنی اور قلبی طور پر مطمئن ہو گئی تھی۔ پہلے صرف یہ دھڑکا تھا کہ جب وسیم کے گھر والوں کو ان کی شادی کا علم ہو گا تو ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو گا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خدشہ بھی ذہن و دل سے نکل گیا تھا اور ـــــــ اب جو کچھ سامنے آ رہا تھا اس کا تو تابندہ نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

یہ سوچتے ہوئے اسے عجیب سی کراہت محسوس ہوئی کہ وہ وسیم کی سیکنڈ وائف ہے۔ بہ الفاظ دیگر وسیم اسے سیکنڈ ہینڈ ملا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بلندی سے پستی کی جانب گرتے ہوئے محسوس کیا۔ کوئی بھی خود کو نمبر دو دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ پھر اس ''نمبر دو'' ہونے کے ساتھ تو ''سوتن'' کا دُم چھلاّ بھی لگا ہوا تھا۔ وہ سندھ کی سالہا سال سے چلی آنے والی روایات سے بھی بخوبی آگاہ تھی۔ ان کے یہاں صرف پہلی بیوی کو اہمیت دی جاتی ہے اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والے بچوں کو ہی اپنی نسل میں شمار کیا جاتا ہے، حتیٰ کہ تمام تر مال و دولت اور جائیداد کا حق دار بھی صرف پہلی بیوی اور اس کے بچوں ہی کو سمجھا جاتا ہے۔ مرد خاندان سے باہر دوسری، تیسری ـــــــ جتنی بھی شادیاں کر لے، ان عورتوں کو نہ تو صحیح معنوں میں بہو تسلیم کیا جاتا ہے اور نہ ہی خاندان کا حصہ قبول کیا جاتا ہے۔ ان بے چاری عورتوں کی حیثیت تو ایک ـــــــ!

تابندہ اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکی۔ سوچ میں جو جانے انجانے ہیولے بن رہے تھے انہیں دیکھ کر اس کا جی متلانے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا اگر اس نے اپنا دھیان نہیں بٹایا تو اس کا دماغ پھٹ جائے گا کیونکہ اچانک اس کے سامنے جو حقائق آن کھڑے ہوئے تھے وہ بڑے

دلدوز اور جگر سوز تھے ـــــــ احساسات کو مجروح اور جذبات کو روند ڈالنے والے ـــــــ تلخ اور ترش حقائق۔

تھوڑی دیر بعد وسیم بھی گھر پہنچ گیا۔ تابندہ کے فون کے بعد وہ سمجھ چکا تھا کہ فلیٹ پر اسے کس قسم کی صورتِ حال سے واسطہ پڑے گا لہٰذا وہ خاصی حد تک ذہنی طور پر تیار ہو کر آیا تھا۔ آتے ہی باپ بیٹے کے درمیان مادری زبان میں مذاکرات شروع ہو گئے۔ پہلے تو تابندہ بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ایک حد تک سندھی زبان سمجھ لیتی تھی۔ اسی حد تک ان کی گرما گرم گفتگو اس کے پلے پڑ سکی۔ بعد ازاں وسیم نے اسے دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ کوئی آدھے گھنٹے تک ان دونوں کے درمیان تشویش ناک میٹنگ جاری رہی، پھر کلیم درانی رخصت ہو گیا۔

اس کے بعد وہ فلیٹ ایک مرتبہ پھر زبان وکلام کا میدانِ جنگ بن گیا۔

ساری حقیقت تابندہ پر آشکار ہو چکی تھی۔ وسیم کے پاس اس کے سوال کا کوئی معقول جواب نہیں تھا۔ وہ سراسر قصوروار تھا اس لئے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔ اس کے عیارانہ مکر و فریب نے تابندہ کے اعتماد کو دھچکا پہنچایا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وسیم اس کے ساتھ اتنا بڑا افراڈ کرے گا۔ حقائق ـــــــ سنگین حقائق کو چھپا کر اس نے تابندہ کو کھلی آنکھوں دھوکا دیا تھا۔

اس میں جتنی ہمت تھی، وہ وسیم سے لڑ لی۔ پھر خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس کے پاس دو ہی راستے تھے۔ نمبر ایک، وہ وسیم کو چھوڑ کر اپنی زندگی کا رُخ تبدیل کر لے۔ نمبر دو، وہ تمام تر حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے وسیم کی دوسری بیوی کی حیثیت سے زندگی گزارتی رہے۔ اس کے پاس دوسری راہ اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لہٰذا اس نے خود کو ذہنی طور پر حقیقت پسندی کے لئے تیار کر لیا۔

وسیم نے اس موقع پر تابندہ کی دل جوئی کے لئے بھرپور اداکاری سے کام لیتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تابندہ! آئی ایم رئیلی ویری سوری۔''

''سوری کہہ دینے سے مسائل تو حل نہیں ہو جاتے وسیم!'' وہ برہمی سے بولی۔

''میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔''

''ایسی کیا مجبوری تھی؟'' وہ تلخ لہجے میں مستفسر ہوئی۔

''اگر میں تمہیں بتا دیتا کہ میں شادی شدہ ہوں تو تم کبھی میری طرف نہ بڑھتیں۔''

''تو ـــــــ تو اچھا ہی ہوتا نا ـــــــ میں دھوکا تو نہ کھاتی۔'' وہ احتجاجی لہجے میں بولی۔

''میں نے تمہیں دھوکا نہیں دیا تابندہ!'' اس کی اداکاری دیکھنے کے لائق تھی۔

تابندہ چڑ گئی۔ ''دھوکا نہیں دیا تو کیا پھولوں کا ہار پہنایا ہے؟''

''میں نے جو کچھ بھی کیا ہے، تمہاری محبت میں کیا ہے۔''

''محبت کا فراڈ اور جھوٹ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔'' وہ ابھی تک بپھری ہوئی تھی۔

وسیم نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''میں تمہاری بات کو رد نہیں کروں گا۔ لیکن تمہیں یہ بھی تو پتہ ہوگا کہ محبت اور جنگ میں ہر حربہ جائز ہو جاتا ہے۔''

تابندہ اُلجھن بھری حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔

وہ اپنی کامیاب اداکاری کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے بھی تمہیں جیتنے ــــــ تمہیں پانے کے لئے جھوٹ کا سہارا لیا ہے۔ تم اسے میدانِ محبت میں استعمال کیا جانے والا ایک جائز حربہ سمجھ لو۔ اگر میں حقیقت کو تم سے نہ چھپاتا تو پھر تمہارا حصول ممکن نہیں تھا۔ اور تمہارے بغیر میں زندگی کو ایسا ہی سمجھتا ہوں جیسے روح کے بنا جسم، راگ کے بغیر راگنی اور خوشبو سے خالی پھول!'' وہ لمحہ بھر کے لئے متوقف ہوا پھر اسی جذباتی بھرائی ہوئی آواز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''تابندہ! نرگس سے شادی خاندانی جبر کا نتیجہ ہے۔ میں اپنی خاندانی روایات کے سامنے مجبور تھا لیکن جب تمہیں دیکھا تو پہلی مرتبہ مجھے یہ احساس ہوا کہ مجھے تمہاری ہی تلاش تھی۔ تمہارے بغیر میرے دن بے نور اور راتیں بے کیف تھیں۔ اگر تم مجھے نہ ملتیں تو میں اس لولی لنگڑی زندگی کے ہاتھوں گھٹ گھٹ کر مر جاتا۔ اسی لمحے میں نے فیصلہ کر لیا کہ تمہیں ہر قیمت، ہر صورت میں حاصل کر کے رہوں گا چاہے اس کے لئے مجھے کتنا بھی سنگین قدم کیوں نہ اٹھانا پڑے۔''

''اور تم نے مجھے حاصل کرنے کے لئے جھوٹ جیسا سنگین قدم اٹھایا۔''

''میں اپنی محبت کو حاصل کرنے کے لئے کسی کی جان بھی لے سکتا تھا۔'' وہ پوری سفاکی سے بولا۔

تابندہ سناٹے میں رہ گئی۔ وسیم ان لمحات میں خاصا جنونی ہو رہا تھا۔ اگرچہ وہ جو کچھ بھی کہہ رہا تھا وہ انتہائی خطرناک تھا۔ لیکن تابندہ کو جانے کیوں اس کا یہ سنگین دعویٰ اچھا لگا۔ ہر انسان چاہے جانے کی خواہش رکھتا ہے اور کوئی اس کی چاہت میں مرنے مارنے کی صورت حال پیدا کرنے پر آمادہ ہو، یہ احساس ایک لذت آمیز اور نشاط انگیز فخر کو جنم دیتا ہے۔ ایسے ہی موقع پر اپنی اہمیت کا اندازہ ہونے لگتا ہے ــــــ اور یہ اہمیت اگر صنف مخالف کی طرف سے مل رہی

ہو تو کیف و سرور کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

چاہے جانے کی فطری تمنا تابندہ کو بھی تھی چنانچہ وسیم کا وحشت بھرا دعویٰ اسے بہت اچھا محسوس ہوا۔ اس پر موجودہ صورتِ حال نے بھی گہرے اثرات مرتب کر رکھے تھے۔ لہٰذا وہ قدرے نرم انداز میں وسیم سے مستفسر ہوئی۔

''تمہاری وجہ سے میں بیٹھے بٹھائے ایک مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہوں۔ تمہارے والد صاحب بڑے غصے میں گئے ہیں۔ پتہ نہیں، وہ وہاں جا کر کون سی قیامت ڈھائیں گے؟''

''میرے ہوتے ہوئے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں سب سنبھال لوں گا۔ اُدھر جو بھی ہوگا، مجھے اس کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں۔ نرگس کو اگر میری دوسری شادی سے کچھ زیادہ ہی تکلیف ہوگی تو وہ اپنا راستہ الگ کر لے۔ میں اسے طلاق دینے کے لئے تیار ہوں۔''

''اتنی بڑی بات تم کتنی آسانی سے کہہ رہے ہو وسیم!'' تابندہ نے تعجب خیز نظر سے اسے دیکھا۔ ''اس طرح تو ایک دن تم مجھے بھی ______''

وہ اس سے آگے کچھ نہ بول سکی۔ وسیم نے اس کے لبوں پر اپنی ہتھیلی کا قفل ڈال دیا تھا۔ اس کے لب تھرتھرا کر بھنچ گئے۔ وہ ہراساں نظر سے اپنے شوہر نامدار کو دیکھتی چلی گئی۔ وسیم نے دھیرے سے اس کے ہونٹوں کو اپنے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے نہایت ہی جذباتی لہجے میں کہا۔

''آئندہ کبھی اپنی زبان پر ایسے الفاظ نہیں لانا۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتی ہو، میں کس دیوانگی کی حد تک تمہیں چاہتا ہوں۔ میں تمہاری خاطر کسی رشتے کو کیا، اپنے جسم کا کوئی بھی حصہ کاٹ کر پھینک سکتا ہوں۔ ہم ایک ساتھ جئیں گے، ایک ساتھ مریں گے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتی۔''

تابندہ کو وسیم کے ان جذباتی مکالموں سے ایک انجانی سی مسرت حاصل ہو رہی تھی۔ کسی عورت کو اگر یہ احساس ہو جائے کہ اس کا مرد صرف اس کا ہے تو اس کا مان، ماؤنٹ ایورسٹ کو شرمانے لگتا ہے۔ ان لمحات میں تابندہ بھی فخر و انبساط کے اُڑن کھٹولے میں محوِ پرواز تھی۔ اس تمام تر فخر و غرور، خوشی اور شادمانی کے ساتھ ہی اسے اپنے سر پر ایک ننگی تلوار بھی لٹکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے خدشات کو رفع اور یقین کو پختہ کرنے کے لئے اس نے وسیم سے پوچھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر اس کی چاہت کے سنہرے جال میں قدم رکھ چکی تھی۔

''مجھے تمہاری محبت پر بھروسہ ہے وسیم!'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرے سر

پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ، اگر زندگی میں کبھی تمہیں نرگس اور تابندہ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو تمہارا فیصلہ کیا ہوگا؟''

وسیم بڑے جذباتی انداز میں متذبذب نظر سے اسے دیکھنے لگا۔ تابندہ نے جھٹ سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھ لیا پھر سرسراتی ہوئی آواز میں اضافہ کیا۔ ''کھاؤ میری قسم!''

وسیم نے آنکھیں بند کر لیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تابندہ! تمہاری قسم، اگر زندگی نے کبھی مجھے ایسے دوراہے پر کھڑا کر دیا تو میں تمہیں چن لوں گا۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے آنکھیں کھول دیں اور اسے مزید یقین دلاتے ہوئے بولا۔

''میں نے بڑے واضح الفاظ میں تمہیں بتایا ہے نا، مجھے نرگس سے ذرا بھی لگاؤ نہیں۔ اسے چھوڑتے ہوئے مجھے ذرا سا بھی دکھ نہیں ہوگا۔ وہ خاندانی جبر کے نتیجے میں میری زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ اگر شرافت سے دن گزارتی ہے تو اچھا ہے۔ ورنہ مجھے انتہائی قدم اٹھانا ہی ہوگا۔ مجھے تو زندگی بھر کراچی میں رہنا ہے اور تمہارے ساتھ رہنا ہے۔''

اس حتمی وضاحت نے تابندہ کے تمام اندیشے اور خدشات رفع کر دیئے۔ وسیم کی سنجیدگی اور پُرعزم گفتگو کو دیکھ اور سن کر وہ مطمئن ہوگئی کہ وسیم صرف اور صرف اسی کا ہے۔ اس پختہ اور خوش آئند احساس نے اسے ہر غم اور ہر فکر سے بے نیاز کر دیا۔

آفتاب حسین اس واہیات صورتِ حال سے آگاہ ہوا تو اس کے ہاتھ پاؤں سے جان نکل گئی، تاہم چرب زبان داماد نے جیسے اپنی بیوی کو رام کیا تھا ویسے ہی بلند و بانگ وعدے وعید سے اس نے سسر جی کو بھی شانت کر دیا۔ آفتاب حسین، تابندہ کی طرح وسیم کی محبت میں اندھا نہیں ہوا تھا کہ آنکھیں بند کر کے ایک مرتبہ پھر اس کی باتوں کا اعتبار کر لیتا۔ اس کا اطمینان ایک سمجھوتا تھا ـــــــ اس کے سوا اس کے لئے کوئی چارۂ کار بھی نہیں تھا۔ عیار داماد نے اسے ایک بند گلی میں لا کھڑا کیا تھا۔

اس تمام تر کوفت اور دل شکستگی کے باوجود بھی اس کا ذہن ایک سوال کا جواب ڈھونڈنے میں مصروف تھا اور وہ سوال تھا ـــــــ وسیم اور تابندہ کی شادی کی خبر میر پور خاص تک کیسے پہنچی؟

ذہن اس سوال کے جواب میں دو آپشن دے رہا تھا۔ نمبر ون، یہ سب وسیم کا اسٹیج کیا ہوا ایک ڈراما ہے۔ اس نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت یہ سب کیا ہے۔ وسیم پر سے اس کا اعتماد اٹھ گیا تھا لہٰذا وہ اس کے بارے میں انتہائی منفی انداز میں سوچنے پر مجبور تھا۔ نمبر ٹو، نعیم لاکھو نے یہ اطلاع وسیم کے گھر والوں تک پہنچائی ہوگی۔

اس نے دونوں امکانات پر گھنٹوں غور و فکر کیا اور اسے سیکنڈ آپشن میں زیادہ کرنٹ نظر آیا۔ لاکھو بھی اس قسم کی حرکت کر سکتا تھا۔ وسیم سے تو کچھ کہنا سننا ہی بیکار تھا لہٰذا آئندہ روز اس نے دفتر میں لاکھو کو گھیر لیا۔ جب ساری صورتِ حال اسے بتانے کے بعد آفتاب نے اس سے باز پرس کی تو وہ بڑی بڑی قسمیں کھا کر صاف مکر گیا۔ آفتاب حسین کے پاس خاموشی اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تو اس نے سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا۔

دوسری طرف مناسب موقع اور تنہائی میسر آتے ہی وسیم نے بھی لاکھو سے کڑی پوچھ تاچھ کی لیکن وہ اس کے سامنے بھی صاف مکر گیا۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ یہ آگ اسی کی لگائی ہوئی تھی۔ وہ بہت ہی کائیاں اور موقع پرست ثابت ہوا تھا۔

چند دن خیریت سے گزرے تھے کہ قادر بخش نے وسیم پر چڑھائی کے لئے کراچی کا رُخ کر لیا۔ کلیم درانی نے تو صرف اپنے بیٹے سے گرما گرمی کی تھی، تابندہ کو اس نے ایک بھی سخت لفظ نہیں کہا تھا۔ جو بھی تھا، وہ اس کی بہو بہرحال تھی۔ لیکن قادر بخش کے لئے تابندہ کی حیثیت کسی خطرناک دشمن جیسی تھی جو اگر وسیم کو اپنی مٹھی میں لے لیتی تو قادر بخش کی بیٹی نرگس کی زندگی خراب ہو سکتی تھی جبکہ وہ وسیم کے دو بچوں کی ماں بھی تھی۔ چنانچہ قادر بخش نے وسیم کے ساتھ ہی تابندہ کو بھی بہت کچھ سنا ڈالا اور جاتے ہوئے اپنے داماد کو یہ دھمکی بھی دے گیا۔

''اس عورت سے جتنی جلدی ممکن ہو، جان چھڑا لو۔ ورنہ میں وہ کچھ کروں گا کہ تمہارے لئے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔'' قادر بخش نے نہایت ہی سنگین الفاظ میں کہا۔ ''اس عورت' سے اس کی سیدھی سیدھی مراد تابندہ ہی تھی۔ ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ ''میں نے جب تمہاری شادی کی خبر سنی تو یہی سمجھا تھا کہ یہ معمول کی بات ہو گی۔ بڑے شہروں میں آباد ہمارے لوگ اس قسم کی گزارہ چلاؤ شادیاں کر لیتے ہیں لیکن جب میں تمہارے باپ سے ملا تو اس کی سنجیدگی دیکھ کر میں پریشان ہو گیا۔ کلیم نے مجھے بتایا ہے کہ تم اس عورت کے چکر میں گردن گردن تک پھنسے ہوئے ہو اور اس کی خاطر تم زمین و جائیداد اور خاندان سے ہر تعلق بھی توڑنے کو تیار ہو۔ مگر کان کھول کر سن لو! میں اپنی بیٹی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونے دوں گا۔ اگر کسی بھی حوالے سے تم نے نرگس اور اس کے بچوں کی حق تلفی کی تو پھر تمہاری خیر نہیں ہو گی۔''

قادر بخش جو کچھ کہنے آیا تھا، کہہ کر چلا گیا اور اس کے جاتے ہی وسیم تفکرات میں گھر گیا۔ قادر بخش اپنے گاؤں کا وڈیرا بھی تھا۔ اگرچہ وہ ایک چھوٹا وڈیرا تھا، تاہم وہ اثر و رسوخ میں ہر طرح کلیم درانی سے زیادہ طاقتور تھا۔ اس کی پہنچ گاؤں اور میرپور خاص کی طرح کراچی میں بھی تھی۔ اگر وہ اپنی بیٹی کے حقوق کی حفاظت کے لئے خم ٹھونک کر کھڑا ہو جاتا تو وسیم کے لئے واقعی

بڑی مشکلات کھڑی کرسکتا تھا۔ قادر بخش کی باتوں نے اگرچہ تابندہ کا دل خون کر دیا تھا لیکن ایک بات ہے اس نے بڑی تقویت اور طمانیت محسوس کی کہ وسیم اس کی خاطر ہر مراعات سے دستبردار ہونے کو تیار تھا۔ اس احساس نے گویا اسے پھر سے زندہ کر دیا۔

انسان بڑا خوش فہم ہے۔ عارضی راحت کو پا کر یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ اب ساری زندگی چین اور سکون سے گزرے گی۔ مگر عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ لہٰذا تابندہ کے ساتھ بھی ایسا نہ ہو سکا۔ قادر بخش کی دھمکی کو چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک نئی اُفتاد تابندہ پر آن ٹوٹی۔

ایک روز وسیم دفتر کے لئے گھر سے نکلنے ہی والا تھا کہ قادر بخش کلیم درانی، نرگس اور اس کے دو بچوں سمیت آ دھمکا۔ اس بے ہودہ صورتِ حال نے تابندہ اور وسیم کو حد درجہ پریشان کر دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کلیم درانی اور قادر بخش ایک خاص پلاننگ کے تحت آئے ہیں۔ پھر انہوں نے اپنے مشترکہ فیصلے سے وسیم کو آگاہ کر دیا۔

''ٹھیک ہے ـــــ ہم تمہاری دوسری شادی کو تسلیم کرتے ہیں اب تمہیں بھی ہماری ایک شرط ماننا ہوگی۔''

وسیم اور تابندہ نے بیک وقت چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ وسیم نے پوچھا۔ ''کون سی شرط؟''

قادر بخش اور کلیم درانی کے بیچ معنی خیز نگاہوں کا تبادلہ ہوا پھر قادر بخش نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں اپنی دوسری بیوی کو بھی گاؤں میں رکھنا ہوگا جس طرح میری بیٹی نرگس وہاں رہ رہی ہے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' وسیم ٹپٹا کر رہ گیا۔ ''میری ملازمت کراچی میں ہے۔ میں زیادہ تر یہاں رہتا ہوں۔ اس لئے تابندہ بھی میرے ساتھ یہیں رہے گی۔''

''اگر تمہاری دوسری بیوی گاؤں جا کر نہیں رہ سکتی تو پھر نرگس بھی ادھر ہی رہے گی۔'' قادر بخش نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''میں اسی لئے اسے اور اس کے دونوں بچوں کو ساتھ لے کر آیا ہوں۔''

وسیم شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس کے باپ کلیم درانی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''قادر بخش اصول کی بات کر رہا ہے۔ دونوں بیویوں کے ساتھ مساوی سلوک ہونا چاہئے۔ یا تو تم تابندہ کو بھی ہمارے ساتھ گاؤں بھیج دو اور یا پھر نرگس اور اس کے بچوں کی رہائش کا یہیں بندوبست کرو۔ ہم دونوں نے بہت سوچ کر یہ متفقہ فیصلہ کیا ہے۔''

ان دونوں بڑوں کا یہ فیصلہ روایت اور معمول سے بہت ہٹ کر تھا لہٰذا وسیم نے احتجاجی

لہجے میں کہا۔ ''ایسا ـــــ کیسا کہاں ہوتا ہے بابا سائیں!''
کلیم کی بجائے قادر بخش نے جواب دیا۔ ''ایسا کہیں ہوتا ہے یا نہیں، اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ـــــ لیکن یہ بات طے ہے کہ نرگس کے سلسلے میں ایسا ہی ہوگا۔''

بالآخر وسیم کو اس یکطرفہ فیصلے کے آگے سر جھکانا پڑا۔ چند روز تک نرگس اور دونوں بچے بھی طارق روڈ والے اس فلیٹ میں ان کے ساتھ رہے پھر اس نے پہلی بیوی اور دو بچوں کی رہائش کے لئے محمود آباد میں بندوبست کر دیا۔ یہ ایک دو منزلہ مکان کا پورشن تھا۔ بالائی منزل پر مالک مکان خود رہائش پذیر تھا۔ زیریں منزل کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر کے اس نے کرائے پر اٹھا دیا تھا۔ انہی دو حصوں میں سے ایک وسیم نے نرگس اور بچوں کے لئے کرائے پر حاصل کر لیا۔

جب دونوں بیویاں ایک ہی شہر میں آباد ہو گئیں اور دونوں کی رہائش میں کوئی زیادہ فاصلہ بھی نہیں تھا تو اس پیچیدہ مسئلے نے سر اٹھایا کہ وسیم کب، کس بیوی کے ساتھ رہے گا۔ ایک مرتبہ پھر سوچ بچار کی گئی اور باہمی مشاورت سے یہ طے پایا کہ وسیم ہفتہ، اتوار، منگل اور جمعرات تابندہ کے ساتھ طارق روڈ والے فلیٹ میں گزارے گا جبکہ پیر، بدھ اور جمعہ سے نرگس کے ساتھ محمود آباد والے گھر میں گزارنا ہوگا۔ اس پروگرام پر دونوں بیویوں نے اتفاق کیا اور زندگی آگے بڑھنے لگی۔

نرگس اس پروگرام پر زیادہ تکلیف میں نہیں تھی۔ وہ پہلے بھی مہینے، دو مہینے میں ایک بار شوہر کی شکل دیکھتی تھی اس لئے شوہر کے بغیر رہنے کی عادی ہو چکی تھی۔ ویسے بھی گاؤں اور شہر کے ماحول میں اس حوالے سے بڑا فرق دیکھنے میں آتا ہے۔ اسی لئے یہ فیصلہ تابندہ کو ایک اذیت، ایک کوفت میں مبتلا کر گیا تھا۔ پہلے ہفتے کے ساتوں دن وسیم پر اس کا قبضہ تھا، اب وہ محض چار دن کے لئے اسے حاصل تھا۔ یہ محرومی اسے جذباتی کشمکش میں اُلجھا رہی تھی۔ تاہم وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتی کہ وہ وسیم کو کھونے سے محفوظ رہی ہے اور یہ کہ ـــــ نرگس کے یہاں آ جانے کے باوجود بھی وہ زیادہ محبت اسی سے کرتا ہے۔ یہ وسیم کی اداکاری کا کمال تھا کہ اس نے اب تک تابندہ کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔

تابندہ اگرچہ وسیم کی طرف سے مطمئن ہو گئی تھی لیکن کبھی کبھی اس کے ذہن میں یہ سوچ بھی بھر جاتی کہ کہیں وسیم اسے کسی نئے انداز سے دھوکا دینے کی کوشش تو نہیں کر رہا۔ وہ ایک مرتبہ اس سے دھوکا کھا چکی تھی۔ وسیم نے اپنی دروغ گوئی کی مصلحت کی ریشمیں پوشاک سے ڈھانپ کر تابندہ کو اطمینان دلانے کی کوشش تو کی تھی اور وہ کسی حد تک مطمئن بھی ہو گئی تھی لیکن احساس کے کسی گوشے میں اب بھی بے اطمینانی جاگزیں تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا زخم کو منافقت

کے کھنڈر نے چھپا دیا ہو۔ سب ٹھیک نظر آنے کے باوجود بھی کچھ ٹھیک نہ ہوا۔ وہ اس زاویے سے جتنا بھی سوچتی، اس کا ذہن اُلجھنے لگتا۔ وہ اسی اُلجھن میں شب و روز گزار رہی تھی کہ ایک نئی مصیبت وارد ہوئی۔

ہفتے کے دنوں کی جو تقسیم طے کی گئی تھی، وسیم نے اس میں گڑبڑ شروع کر دی۔ وہ ہفتہ، اتوار اور منگل تو تابندہ کے ساتھ گزارتا، پھر جمعرات ہی سے گول ہو جاتا۔ اس نے تابندہ کا ایک دن کم کر کے نرگس کا بڑھا دیا تھا۔ نرگس کی جانب اس کا جھکاؤ سمجھ میں آتا تھا کہ وہاں وسیم کے دو بچے بھی موجود تھے۔ تابندہ نے جب اس خلاف ورزی کی شکایت کی تو وہ بے پروائی سے بولا۔

''پہلے چار دن تمہارے تھے اور تین اس کے۔ اب چار اس کے اور تین تمہارے ہو گئے ہیں۔''

''مسئلہ تین اور چار کا نہیں بلکہ وعدہ خلافی کا ہے۔'' تابندہ نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ''اور وسیم! میں پچھلے چند دنوں سے تمہارے رویے میں بھی نمایاں تبدیلی محسوس کر رہی ہوں۔''

''کیسی تبدیلی؟'' وسیم نے پوچھا۔

وہ شکایتی انداز میں بولی۔ ''تم مجھ سے کچھ بیزار سے رہنے لگے ہو۔ کیا اُس طرف تمہارا دل زیادہ لگ رہا ہے؟''

''اُس طرف'' سے تابندہ کی مراد ''نرگس'' تھی۔ وسیم نے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ حالانکہ میں تو انصاف کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم دونوں سے مجھے ایک جیسا لگاؤ ہے۔''

''وسیم!'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ''یا تو تم اب جھوٹ بول رہے ہو اور یا پھر تم نے پہلے مجھ سے غلط بیانی کی تھی۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ اُلجھن زدہ نظر سے اسے تکنے لگا۔

تابندہ نے اس کے اظہارِ محبت کا حوالہ دینے کے بعد کہا۔ ''تم مجھے بتا چکے ہو، نرگس خاندانی جبر کے نتیجے میں تم پر مسلط کی گئی ہے۔ تمہیں اس سے کوئی محبت ہے اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی دلچسپی۔ تم صرف اور صرف مجھے چاہتے ہو۔ میرے سوا کوئی دوسرا تمہیں نظر نہیں آتا۔ مجھے حاصل کرنے کے بعد تمہاری بے چین روح کو قرار آ گیا ہے۔ میں نے بہار بن کر تمہاری ویران زندگی کو مہکا دیا ہے اور میرے وجود سے تمہاری ذات مکمل ہوئی ہے لیکن ———'' وہ جذبات کو قابو میں لانے کے لئے تھوڑا متوقف ہوئی پھر بات کو پورا کرتے ہوئے بولی۔

''لیکن تمہارا موجودہ عمل ان دعوؤں کی نفی کرتا ہے وسیم!''

وہ جز بز ہو کر رہ گیا۔ تابندہ نے جو سوالات اٹھائے تھے ان کا اس کے پاس کوئی بھی معقول جواب نہیں تھا لہٰذا اپنی شکست پر وہ جھنجلا کر بولا۔ ”تو ـــــ تو کیا چاہتی ہو، میں نرگس اور دونوں بچوں کا گلا گھونٹ دوں؟ آخر کو وہ بھی انسان ہیں اور تمہارے برابر ـــــ بلکہ تم سے کچھ زیادہ ہی مجھ پر حق رکھتے ہیں۔“

تابندہ کو یوں محسوس ہوا، کوئی نازک سی شے ایک چھناکے سے اس کے اندر ٹوٹ کر کرچی کرچی بکھر گئی ہو۔ وسیم کا اصل چہرہ اُبھر کر اس کے سامنے آ رہا تھا۔ اب تک وہ اپنے پلڑے کو جھکا ہوا محسوس کر رہی تھی لیکن وسیم کے ان الفاظ نے اس پر واضح کر دیا کہ نرگس کے پلڑے میں جھکاؤ زیادہ ہے ـــــ اور کیوں نہ ہوتا؟ وہاں نرگس کے ساتھ دو بچے بیٹھے ہوئے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ایک طرف ایک باٹ اور دوسری جانب تین باٹ! ظاہر ہے تین باٹ والے پلڑے ہی کو جھکنا تھا۔ علم ریاضی تو یہی بتاتا ہے۔

اس روز ان کے درمیان جس کشیدگی نے جنم لیا تھا وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی چلی گئی۔ تابندہ کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے وسیم نے باقاعدہ اس کے خلاف محاذ بنا لیا ہو۔ اب وہ صرف ہفتہ اور منگل کو اس کے پاس رُکتا اور وہ بھی پھولے ہوئے منہ اور چڑھی ہوئی تیوری کے ساتھ۔ ہفتے کے باقی پانچ دن وہ اپنی زوجۂ اول اور بچوں کے ساتھ محمود آباد والے گھر میں گزارتا۔ یہ صورتِ حال آفتاب حسین سے پوشیدہ نہیں تھی لیکن وہ بھی اس قدر بے دست و پا ہو چکا تھا کہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تابندہ سے بے اندازہ محبت کرتا تھا اور اس کی محبت کی خاطر مجبور تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سب کچھ ختم ہو جائے ـــــ اور اب ایسا ہی ہونے کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔

اسی کشیدہ اور دل گرفتہ صورتِ حال میں دن ایک ایک کر کے آگے کھسک رہے تھے کہ ایک روز پتہ چلا وسیم کو محمود آباد والے گھر میں قتل کر دیا گیا ہے۔ اس نے دو کشتیوں کو اوپر نیچے رکھنے کی بجائے اس کے درمیان فاصلہ بڑھا کر سوار ہونے کی کوشش کی تھی لہٰذا ٹانگیں چِروا بیٹھا تھا۔

❁ ❁ ❁

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے عدالت میں چالان پیش کر دیا۔

میں نے اس پیشی پر اپنی مؤکل کی ضمانت کرانے کی پوری کوشش کی مگر اس کوشش میں مجھے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ قتل کے ملزم کی ضمانت ناممکن حد تک مشکل ہوتی ہے، تاہم میں اس جزوی ناکامی سے قطعاً دلبرداشتہ نہیں تھا۔ اس دوران میں نے آفتاب حسین کی مدد سے اتنی دوڑ دھوپ کر لی تھی کہ میں اپنی سائیڈ کے حوالے سے کلی طور پر مطمئن تھا۔ عدالت نے درخواست

ضمانت کو نامنظور کرتے ہوئے ملزمہ تابندہ کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا۔

آئندہ دو تین پیشیاں عدالت کی تکنیکی کارروائی کی نذر ہو گئیں۔ میں اس سست اور سپاٹ کارروائی کی تفصیل بیان کر کے آپ کو بور نہیں کروں گا اس لئے ہم خاموشی سے آگے بڑھتے ہیں۔ اس دوران ملزمہ کا باپ آفتاب حسین مسلسل میرے رابطے میں رہا اور اس نے میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے تمام اہم اور ضروری معلومات مجھے فراہم کر دیں۔ آفتاب حسین بے حد متعاون شخص ثابت ہوا۔ وہ ایک بڑے سرکاری آفیسر کا پی اے تھا اور اس کے تعلقات بھی وسیع تھے لہٰذا مطلوبہ معلومات حاصل کرنے میں اسے کسی دقت یا دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

باقاعدہ ساعت کا آغاز کوئی تین ماہ بعد ہوا۔ عدالتی کارروائی کا احوال بیان کرنے سے پہلے میں چند اہم باتیں آپ کے علم میں لانا ضروری سمجھتا ہوں جن میں سرفہرست تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہے۔ علاوہ ازیں تابندہ کی گرفتاری اور دیگر معاملات بھی اہم ہیں۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول وسیم درانی کی موت پچیس فروری بروز پیر، صبح نو اور دس بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اس کی موت کا سبب سینے میں گھسنے والی اعشاریہ تین دو کیلی برکی وہ دو گولیاں تھیں جو کسی ریوالور سے فائر کی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک گولی نے مقتول کے دل کو چھید ڈالا تھا اور دوسری پھیپھڑے کو پھاڑتے ہوئے نکل گئی تھی۔ رپورٹ کی رو سے مذکورہ ریوالور پر سائلنسر بھی لگا ہوا تھا۔ یہ خاموش فائرنگ اتنی مؤثر ثابت ہوئی کہ مقتول نے موقع پر ہی جان دے دی تھی۔

میری مؤکل کو اس کے میکے واقع ایف سی ایریا سے گرفتار کیا گیا تھا۔ یہ گرفتاری مقتولہ کی پہلی بیوی نرگس کی نشاندہی پر لگ بھگ دوپہر ایک بجے عمل میں آئی تھی۔ وہ اس وقت گھر کے کچن میں دوپہر کا کھانا پکا رہی تھی اور اس روز ملزمہ کا باپ آفتاب حسین بھی گھر میں موجود تھا۔ آفتاب حسین نے اس دن خاص طور پر دفتر سے چھٹی کی تھی۔ ان دنوں وہ شدید قسم کے ذہنی دباؤ میں تھا۔ تابندہ کے تیزی سے تاریک ہوتے مستقبل نے اسے پچھتاوؤں اور پریشانیوں کے گرداب میں لا پھینکا تھا جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ اسے دکھائی نہیں دیتا تھا۔

عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزمہ نے صحت جرم سے صاف انکار کر دیا۔

تابندہ نے معزز عدالت کے روبرو جو بیانِ حلفیہ ریکارڈ کرایا وہ اس بیان سے قطعی مختلف تھا جو وہ اس سے پہلے ریمانڈ کی مدت کے دوران پولیس کو دے چکی تھی۔ جس طرح پولیس کی

کسٹڈی میں کیے گئے اقرارِ جرم کی عدالت میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی بالکل ایسے ہی پولیس کے ریکارڈ شدہ بیان کو بھی اہم نہیں سمجھا جاتا۔ ملزم جب عدالت میں پہنچ جاتا ہے اور باقاعدہ کارروائی شروع ہوتی ہے تو اصل کام کا آغاز ہوتا ہے۔ عدالت اسی روشنی میں سماعت کو آگے بڑھاتی ہے اور حالات و واقعات، حقائق و ثبوت کے تناظر میں وہ کسی کیس کا فیصلہ صادر فرماتی ہے۔ عدالت میں مضبوط دلائل اور ٹھوس ثبوت کی بناء پر اپنے موٴقف کو منوانا پڑتا ہے۔

میری موٴکل نے معزز عدالت کے سامنے جو بیان دیا، میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ استغاثہ کے گواہوں کی شہادت سے پہلے آپ کے ذہن میں صورتِ حال مزید واضح ہو جائے۔

تابندہ نے مقتول کے حالیہ رویے اور سابق سلوک کی تفصیلات سے عدالت کو آگاہ کرنے کے بعد بیان دیا کہ ان حالات میں وہ سخت مصیبت میں مبتلا ہو کر رہ گئی تھی۔ جن راتوں کو وسیم نے واپس نہیں آنا ہوتا تھا، وہ اپنے ابو کے گھر چلی جاتی کیونکہ وہ طارق روڈ والے جس فلیٹ میں رہتے تھے وہاں ان کے علاوہ اور کوئی فیملی آباد نہیں تھی۔ ہر فلیٹ میں چھڑے چھانٹ مل کر رہ رہے تھے۔ وسیم کی موجودگی کی تو بات الگ تھی لیکن اس کے غیاب میں وہاں تن تنہا رات گزارتے ہوئے بے پناہ ڈر لگتا تھا لہٰذا وہ فلیٹ پر تالا ڈال کر اپنے میکے چلی جاتی اور آئندہ روز وسیم کی آمد سے قبل واپس آ جاتی ــــــ لیکن جب وسیم نے خلافِ عہد زیادہ دن نرگس کے پاس رکنا شروع کر دیا تو اس کے لئے ایک نئی مصیبت کھڑی ہوگئی ــــــ اس صورتِ حال نے ملزمہ کے باپ آفتاب حسین کو بھی پریشان کر دیا اور آخری دنوں میں جب وسیم پیچھے کی راہ بھول گیا تو ملزمہ کو دو دو، تین تین دن اپنے والد کے گھر میں گزارنا پڑتے۔ واقعہ سے دو روز قبل یعنی تیئس فروری بروز ہفتہ بھی وہ ایف سی ایریا والے گھر آ گئی تھی۔ اب منگل کو وسیم نے اس کے پاس آنا تھا۔ یہ دو تین روز اسے اپنے میکے میں گزارنا تھے۔ مگر پیر پچیس فروری کی صبح ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ اسے گھر سے نکلنے پر مجبور ہونا پڑا۔

وہ روزانہ صبح جلدی اٹھنے کی عادی تھی۔ اسے بیدار ہوئے تھوڑی دیر گزری تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ یہ ایک خلافِ معمول اور خلافِ توقع فون کال تھی۔ آفتاب حسین اس وقت سو رہا تھا۔ ملزمہ نے فون کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور ماؤتھ پیس میں ''ہیلو'' کہا۔

اس ''ہیلو'' کے جواب میں دوسری طرف کسی اجنبی مرد کی نامانوس آواز اُبھری۔ اس شخص نے بڑے پراسرار انداز میں ملزمہ سے کہا کہ وہ اس کا ایک خیر خواہ بول رہا ہے اور اسے یہ اطلاع فراہم کر رہا ہے کہ آج دوپہر میں کسی وقت اس کا شوہر اپنی پہلی بیوی اور دو بچوں کے

ساتھ میر پور خاص جا رہا ہے اور اس کی واپسی کی کوئی امید نہیں۔ اگر وہ اپنے شوہر کو ہمیشہ کے لئے کھونا نہیں چاہتی تو جتنی جلدی ممکن ہو، محمود آباد والے گھر میں پہنچ کر اسے روک لے۔

ملزمہ نے اطلاع فراہم کرنے والے خیر خواہ کا نام پوچھا تو اس نے بڑی عجلت میں یہ کہتے ہوئے فون بند کر دیا کہ ملزمہ اس کے بارے میں تحقیق و تفتیش کے چکر میں پڑ کر وقت ضائع کرے گی۔ بہ الفاظ دیگر وہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارے گی۔ اگر وہ اپنے شوہر کو روکنا چاہتی ہے تو فی الفور اپنی سوتن نرگس کے گھر پہنچ جائے۔ ورنہ ہاتھ ملتی رہ جائے گی۔

ملزمہ نے ریسیور کریڈل کیا اور گہری پریشانی میں مبتلا ہو گئی۔ انسان پریشانی میں اپنوں کو پکارتا ہے۔ اسے ان حالات میں اپنا صرف ایک ہی شخص نظر آ رہا تھا اور وہ تھا اس کا باپ آفتاب حسین۔ اس نے جلدی جلدی اپنے باپ کو اٹھایا اور نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

یہ سنتے ہی آفتاب کی پریشانی دوچند ہو گئی۔ تھوڑی بلکہ لمحاتی سوچ بچار کے بعد وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ اس نے ملزمہ سے کہا کہ وہ ابھی اس کے ساتھ محمود آباد جائے گا۔ آج اس بات کا فیصلہ ہو ہی جائے کہ آخر وہ مردود چاہتا کیا ہے۔ قطرہ قطرہ زہر پی کر اذیت میں مبتلا ہونے سے بہتر ہے انسان پیالہ بھر نوش کر کے ایک ساتھ موت کو گلے لگا لے۔

ملزمہ نے اپنے باپ کی دل شکستگی اور کسمپرسی دیکھی تو اس کا جگر خون ہو گیا۔ ایک فوری فیصلے کے تحت اس نے باپ سے کہہ دیا کہ وہ اکیلی ہی محمود آباد جائے گی۔ باپ نے حتیٰ الامکان ضد کی کہ وہ بھی اس کے ساتھ جائے گا لیکن اس کے ذہن پر ایک ضد سی سوار ہو گئی تھی کہ اپنے مسئلے کو وہ خود اپنے ہاتھوں سے حل کرے گی لہٰذا وہ باپ کی ضد کے سامنے ڈٹ گئی۔ بالآخر آفتاب حسین کو بپھری ہوئی بیٹی کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے اور ملزمہ اکیلی ہی محمود آباد کی طرف روانہ ہو گئی۔

پراسرار کال لگ بھگ صبح ساڑھے سات بجے موصول ہوئی تھی۔ ملزمہ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے مقتول کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ دروازہ مقتول ہی نے کھولا اور اپنے سامنے ملزمہ کو کھڑے دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ ملزمہ نے اس کی مبہوتیت کو توڑتے ہوئے کہا کہ وہ اسے گھر کے اندر آنے دے کیونکہ وہ اس سے جو کچھ کہنے آئی ہے، گلی میں کھڑے کھڑے نہیں کہا جا سکتا۔ پتہ نہیں، مقتول کے جی میں کیا آئی کہ اس نے ملزمہ کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے دی۔

گھر کے اندر آنے کے بعد پتہ چلا کہ نرگس اور دونوں بچے موجود نہیں ہیں۔ مقتول نے ملزمہ کی آنکھوں میں اُبھرنے والے سوال کو فوراً بھانپ لیا اور فوری طور پر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''نرگس بچوں کو سکول چھوڑنے گئی ہے۔ ابھی دس منٹ میں واپس آ جائے گی لیکن ______ تم اس وقت یہاں؟''

ملزمہ نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں ''اس وقت یہاں'' کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مقتول کو پراسرار ٹیلی فون کال کے بارے میں بتا دیا۔ پوری بات سننے کے بعد مقتول نے اپنے کسی ایسے پروگرام سے صاف انکار کر دیا اور ملزمہ سے کہا کہ کسی نے اسے مس گائیڈ کیا ہے۔ اگر اسے مقتول کی باتوں کا یقین نہیں آ رہا تو وہ نرگس سے تصدیق کر لے۔ وہ بس آنے ہی والی ہے۔

وہ اپنی سوتن کا انتظار کرتے ہوئے مقتول سے باتیں کرنے لگی۔ یہ گفتگو شکوہ شکایت اور برہمی پر مشتمل تھی۔ ملزمہ کی گرما گرمی کے جواب میں مقتول نے اپنی پوزیشن واضح کرتے ہوئے اسے بتایا کہ وہ اپنی پہلی بیوی سے سخت ناراض ہے۔ گزشتہ روز ان کے بیچ بڑی شدید جھڑپ ہو چکی ہے اور بات چیت ابھی تک بند ہے اور یہ کہ وہ بہت جلد نرگس کو نظر انداز کر کے ساری توجہ اسی پر مبذول کرنے والا ہے۔

مقتول کی یہ چکنی چپڑی باتیں ملزمہ کو ایک خوبصورت دھوکے سے زیادہ کچھ نہ لگیں۔ وہ اس کے رویے اور سلوک سے برگشتہ ہو چکی تھی لہٰذا اس پر اعتبار کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جب اپنے احساسات کو اس نے مقتول تک پہنچایا تو وہ بڑی بڑی قسمیں کھا کر اسے یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ اب بھی سچی محبت صرف اور صرف اسی سے کرتا ہے۔

ملزمہ اس قسم کی کہانیاں بہت سن چکی تھی لہٰذا وہ اپنے مؤقف پر ڈٹی رہی۔ اسی بحثا بحثی میں نو بج گئے۔ اسے یہاں آئے ہوئے لگ بھگ آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا لیکن ابھی تک نرگس کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ مقتول ہی کی زبانی اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اس کے دونوں بچے دو گلی چھوڑ کر ایک سکول میں پڑھتے تھے۔ رخسانہ کلاس ون میں اور سلطان کلاس ٹو میں تھا۔ دوسری گلی کے فاصلے سے واپس آتے ہوئے اتنی دیر نہیں لگ سکتی تھی۔ ملزمہ نے اس کے مبینہ ''میر پور خاص پروگرام'' کا حوالہ دیتے ہوئے ایک مرتبہ پھر مقتول پر جرح شروع کر دی اور ساتھ ہی نرگس کے ابھی تک واپس نہ آنے کے موضوع کو بھی چھیڑ دیا۔ ملزمہ کے پیہم استفسار کو کٹ حجتی پر محمول کرتے ہوئے مقتول نے غصیلے انداز میں کہا۔

''میں پراسرار فون کال کرنے والے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور نہ ہی ہمارا ایسا کوئی

پروگرام ہے۔ میں اس سلسلے میں اب کوئی قسم نہیں کھاؤں گا۔تم خود سوچو، اگر ہمیں خاموشی سے میر پور خاص روانہ ہونا ہوتا تو بچوں کو سکول کیوں بھیجتے؟ تم سکول جا کر معلوم کرسکتی ہو، ہم نے بچوں کے لئے چھٹی کی کوئی درخواست بھی نہیں دی۔ اب تو چند روز بعد ویسے بھی امتحانات ہونے والے ہیں۔ میں ان کی تعلیم کو متاثر کرنے والا قدم کیسے اٹھا سکتا ہوں؟'' وہ لمحہ بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا پھر نہایت ہی سنجیدگی سے اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اور جہاں تک نرگس کے واپس نہ آنے کا تعلق ہے تو ہوسکتا ہے وہ سبزی، گوشت اور دیگر سودا سلف کی خریداری کے لئے دکان کی طرف چلی گئی ہو۔ میں بھی اسی کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔ وہ آئے تو میں دفتر کے لئے نکلوں۔''

مقتول نے بڑے مدلل اور معقول انداز میں وضاحت پیش کی تو ملزمہ تذبذب کا شکار ہو گئی۔ ذہن میں ایک خیال یہ آرہا تھا کہ مقتول کے دل اور نیت میں کوئی کھوٹ نہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی گردش کر رہا تھا کہ یہ شخص بھروسے کے لائق نہیں۔ اس پر اعتماد کرنا سراسر حماقت ہوگی۔ یہ متعدد بار دھوکا دے چکا ہے۔ اس سے کچھ بھی بعید نہیں۔ انہی متضاد سوچوں اور پراگندہ ذہن و دل کے ساتھ وہ سوا نو بجے مقتول سے یہ کہتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوگئی ——— ''وسیم! میں تم پر آخری مرتبہ بھروسہ کر رہی ہوں۔ اگر اس بار بھی تم نے میرے اعتماد کا خون کیا تو مجھے اپنی زندگی سے خارج ہی سمجھنا۔ میں زندہ رہوں یا خود کو ختم کرلوں لیکن آج کے بعد تم میری صورت دیکھنے کو ترس جاؤ گے۔''

مقتول نے وقت رخصت ایک دفعہ پھر اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ آج رات دفتر سے سیدھا اس کے پاس آئے گا اور آنے والے تین دن وہ مسلسل اسی کے ساتھ قیام کرے گا۔

ملزمہ سوا نو بجے محمود آباد والے گھر سے نکلی اور کم و بیش دس بجے وہ ایف سی ایریا پہنچ گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مقتول نے واقعی آج آخری مرتبہ اس کی صورت دیکھی تھی۔ جب دوپہر ایک بجے اس الزام کے ساتھ اسے گرفتار کیا گیا کہ اس نے اپنے شوہر وسیم درانی کا خون کر دیا ہے تو وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس نے اپنی صفائی اور بے گناہی میں بہت کچھ کہنا چاہا لیکن پولیس والوں نے اس کی ایک نہ سنتے ہوئے درشت لہجے میں صرف اتنا کہا ——— ''بی بی! تمہیں جو کچھ بھی کہنا ہے، اُدھر عدالت میں جا کر کہنا۔''

اور اب ملزمہ تابندہ نے پولیس والوں کی ''ہدایت'' کے عین مطابق معزز عدالت کے روبرو سب کچھ صاف صاف کہہ ڈالا تھا۔ اس کا حلفیہ بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل استغاثہ نے اس پر

لمبی چوڑی جرح کی۔ بہ الفاظ دیگر اس نے میری مؤکل کو جرح کی چکی میں پیس ڈالا لیکن اس کڑے وقت کا مقابلہ کرنے کے لئے میں نے چند اہم نکات اسے ذہن نشین کرا رکھے تھے۔ وہ اپنی سمجھ داری، لیاقت اور میرے ٹپس کو بڑے مناسب اور مؤثر انداز میں استعمال کرتے ہوئے استغاثہ کے سامنے ڈٹی رہی۔

وکیل استغاثہ متعدد تیکھے اور نکیلے سوالات کے نتیجہ میں کوئی ایسا ٹھوس پوائنٹ سامنے نہ لا سکا جس کی بنا پر معزز عدالت میری مؤکل کو سزا سنا کر جیل کی سلاخوں کے پیچھے پھینک دیتی۔ اس بحث و جرح میں چند فروعی اور بے ضرر باتیں نمایاں ہوئیں اور مجھے ان کی پرواہ نہیں تھی۔ متذکرہ باتوں کی تفصیل میں دھکیل کر میں آپ کی طبیعت کو مکدر نہیں کروں گا۔

ملزمہ کے بیان کے بعد استغاثہ کے گواہوں کے بیانات کی باری تھی۔ استغاثہ کی طرف سے کوئی نصف درجن گواہوں کی فہرست عدالت میں پیش کی گئی تھی لیکن عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں چونکہ چند منٹ باقی رہ گئے تھے لہٰذا مزید کارروائی ممکن نہ تھی۔ جج نے ایک ہفتہ بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ اِز ایڈ جرنڈ ــــــــــ!''

❁ ❁ ❁

وہ ماہِ مئی کے وسطی ایام تھے۔ اس کیس کو عدالت میں لگے ہوئے تین ماہ ہونے کو آ رہے تھے۔ جج سمیت جب تمام متعلقہ افراد عدالت میں جمع ہو گئے تو جج کی اجازت سے کارروائی کا آغاز ہوا۔ اس سے قبل کہ وکیل استغاثہ اپنے کسی گواہ کو شہادت کے لئے پیش کرتا، میں نے جج سے خصوصی درخواست کر کے اس کیس کے تفتیشی افسر کو تھوڑی دیر کے لئے کٹہرے میں بلا لیا۔ کسی بھی کیس کا انکوائری آفیسر ہر پیشی پر عدالت میں موجود ہوتا ہے اور اس کی حیثیت استغاثہ کے گواہ جیسی ہی ہوتی ہے۔ اس کی ضرورت کسی بھی مرحلے پر پیش آ سکتی ہے۔

اس کیس کا تفتیشی افسر عہدے کے اعتبار سے ایک سب انسپکٹر تھا۔ اس کا نام دلشاد مرزا معلوم ہوا۔ مذکورہ ایس آئی نے کنگ سائز مونچھیں پال رکھی تھیں۔ وہ وِٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہوا تو میں نے بڑی گہری نگاہ سے اس کا تنقیدی جائزہ لیا پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آئی۔ او صاحب! آپ نے یہ کیس تقریباً حل کر لیا تھا۔ مگر ملزمہ نے معزز عدالت کے روبرو صحت جرم سے انکار کر دیا ہے۔ گویا آپ کی محنت کے پہاڑ کو جہہِ آب میں پہنچا دیا جسے عرف عام میں ''محنت پر پانی پھیرنا'' بھی کہا جاتا ہے۔'' ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے

تیکھے لہجے میں استفسار کیا۔

''کیا خیال ہے ــــــ کوئی ایسا قانون بھی پاس نہیں ہونا چاہئے کہ ملزم ایک جملہ بول کر پولیس والوں کی محنت کا کباڑا کرنے کے حق سے محروم ہو جائے؟''

''کیوں نہیں؟'' وہ بڑے سنجیدہ انداز میں میرے طنز کا جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''یقیناً ایسا ہونا چاہئے۔ ہم بڑی جانفشانی سے ملزم پر محنت کرتے ہیں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ بیک جنبش زبان کوئی ہماری محنت کا سوا ستیاناس مار دے۔ میں آپ جیسے قابل وکیل ہی سے درخواست کر سکتا ہوں کہ وہ ایسے بل کی منظوری کے لئے قانونی چارہ جوئی کا بیڑا اٹھائے۔ کیا میں اس سلسلے میں آپ سے کوئی اُمید رکھوں؟''

میں نے ایک بھرپور شارٹ سے جو گیند آئی۔ او کی کورٹ میں پھینکی تھی اس نے جوابی حملے کے طور پر اس گیند کو واپس میری کورٹ میں پہنچا دیا تھا۔ اس سے اس کی تکلیف کا مجھے اندازہ ہو گیا۔ وہ ''نو نقد نہ تیرہ اُدھار'' کے موڈ میں دکھائی دیتا تھا اور میں چاہتا بھی یہی تھا۔ میں نے باقاعدہ جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''آئی۔ او صاحب! آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب اور کس نے دی تھی؟''

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ ''ہمارے روزنامچے کے مطابق اس واردات کی اطلاع پچیس فروری کو صبح دس بجے دی گئی تھی اور اطلاع فراہم کرنے والے شخص کا نام ہے داؤد!''

''آپ کہیں انہی داؤد صاحب کا ذکر تو نہیں کر رہے جو مقتول کے مالک مکان بھی ہیں اور بالائی منزل پر ان کی اپنی رہائش بھی ہے؟'' میں نے بالکل ایک انجان شخص کے انداز میں دریافت کیا۔

''جی ہاں، جی ہاں ــــــ'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں اُسی داؤد کی بات کر رہا ہوں۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا مذکورہ داؤد صاحب بہ نفس نفیس یہ اطلاع لے کر تھانے پہنچے تھے یا ــــــ؟'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے بولا۔

''اس نے فون پر ہمیں یہ اطلاع دی تھی۔''

''آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''گیارہ، سوا گیارہ بجے۔'' اس نے جواب دیا۔

''کمال ہے!'' میں نے حیرت بھرے اور بلند آہنگ لہجے میں کہا۔ ''آپ کو جائے واردات

پر پہنچنے میں گھنٹہ، سوا گھنٹہ لگ گیا جبکہ میری معلومات کے مطابق متعلقہ تھانہ چند قدموں کے فاصلے پڑا ہے۔''

وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے، ہم تھانے میں ریس کی پوزیشن سنبھالے بیٹھے ہوتے ہیں؟ اِدھر کسی نے اطلاع دی، اُدھر ہم دوڑ پڑے۔'' وہ خاصا برہم دکھائی دے رہا تھا۔ غصیلے انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں تھانے میں اور بھی بہت سے کام ہوتے ہیں۔''

''یقیناً ہوتے ہوں گے۔'' میں نے سہلانے والے انداز میں اس کی بات کی تائید کر دی۔ ''تھانہ بہت سارے کام کرنے کے لئے ہی قائم کیا جاتا ہے۔ لیکن قتل جیسے سنگین واقعے کی اطلاع پاتے ہی آپ کو واقعی ریس کے کسی گھوڑے کی مانند دوڑ لگا دینا چاہیے۔ بہرحال ـــــ'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے اپنی بات مکمل کر دی۔

''آپ جائے وقوعہ پر پہنچے، اس وقت تک مقتول کی زندگی کا چراغ گل ہو چکا تھا۔ موقع واردات پر آپ کو سائلنسر لگا ہوا وہ ریوالور بھی مل گیا جس سے چلنے والی دو خاموش گولیوں نے مقتول کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا تھا۔ بعد ازاں آپ کو معلوم ہوا، آلۂ قتل مقتول کی ملکیت ہے۔ یہ ایک لائسنس یافتہ بتیس بور ریوالور تھا جو مقتول نے اپنی حفاظت کے لئے رکھا ہوا تھا۔ پولیس رپورٹ بتاتی ہے، آلۂ قتل کی ملکیت کے بارے میں مقتول کی بیوہ نے آپ کو بتایا تھا۔ آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ کیا آپ نے آلۂ قتل پر سے ملزمہ کے فنگر پرنٹس اٹھانے کی کوشش کی تھی؟ پولیس رپورٹ میں مجھے ایسا کوئی ذکر دیکھنے سننے کو نہیں ملا۔''

اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''جی، ہم نے ایسی کوشش ضرور کی تھی لیکن آلۂ قتل پر سے ملزمہ کی انگلیوں کے نشانات حاصل نہیں ہو سکے۔ ممکن ہے فائرنگ کے وقت اس نے دستانے وغیرہ پہن رکھے ہوں یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے، اس نے آلۂ قتل کو کسی کپڑے سے صاف کرنے کے بعد جائے وقوعہ پر پھینک دیا ہو۔'' وہ سانس لینے کے لئے تھوڑا متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ہم نے مقتول کے گھر میں مختلف اہم مقامات سے بھی فنگر پرنٹس اٹھائے ہیں اور الحمدللہ! ہمیں ملزمہ کی انگلیوں کے نشانات بھی ملے ہیں۔''

اس نے ''الحمدللہ'' کے الفاظ کچھ اس انداز میں ادا کئے تھے جیسے ابھی ابھی عمرہ یا حج کی سعادت حاصل کر کے آ رہا ہو۔ میں نے خاصے سخت لہجے میں کہا۔

''ملزمہ وقوعہ کے روز جائے واردات پر گئی تھی تو ظاہر ہے وہاں اس کے فنگر پرنٹس تو ملیں

گے ہی۔آپ کے حالیہ بیان سے تو یہ ثابت ہو رہا ہے کہ جب ملزمہ مقتول کے گھر میں داخل ہوئی تو اس نے دستانے نہیں پہن رکھے تھے۔صرف فائرنگ کرتے وقت اس نے ہاتھوں پر دستانے چڑھا لئے تھے؟''

وہ ناگواری سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔''دستانوں کے حوالے سے میں نے ایک امکانی بات کی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے اس روز ملزمہ نے دستانوں کو ہاتھ بھی نہ لگایا ہو بلکہ مقتول کی زندگی سے کھیلنے کے بعد اس نے کسی کپڑے وغیرہ سے ریوالور صاف کر کے جائے وقوعہ پر پھینک دیا ہو۔''

''اوکے ـــــ آل رائٹ!'' میں نے یہ الفاظ کچھ اس انداز میں دہرائے جس سے تاثر اُبھرتا تھا، میں نے انکوائری آفیسر کے مؤقف سے اتفاق کرلیا ہے جبکہ درحقیقت ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے سوالات کے زاویے کوتھوڑا سا تبدیل کرتے ہوئے مزید کہا۔اس کہنے میں گہرا استفسار تھا۔

''آئی۔او صاحب! پولیس رپورٹ اور استغاثہ کے مطابق ملزمہ کو وقوعہ کے روز دو بجے ایک بجے اس کے میکے واقع ایف سی ایریا سے گرفتار کر لیا گیا تھا ـــــ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''اس نے اثبات میں جواب دیا۔''گرفتاری کا عمل یونہی پیش آیا تھا۔''

''کیا گرفتاری کے بعد آپ نے ملزمہ کا پیرافن ٹیسٹ کروایا تھا؟''

''نہیں۔''اس نے گردن کونفی میں جھٹکا دیا۔

میں نے استفسار کیا۔''کیوں؟''

''ہم نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی ـــــ'' اس نے جواب دیا۔''اور اس کی دو وجوہ ہیں۔''

وہ دونوں وجوہ بھی بیان فرمادیں؟''

''نمبر ایک۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔''جب ملزمہ کو گرفتار کیا گیا اس وقت تک وقوعہ کو تین سے زیادہ گھنٹے گزر چکے تھے۔گرفتاری کے وقت وہ کچن میں کھانا تیار کر رہی تھی لہٰذا اس بات کے قوی امکانات تھے کہ اس نے اپنے ہاتھ اچھی طرح صاف کر لئے ہوں گے۔نمبر دو ـــــ'' اتنا کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لئے رکا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔

'' ـــــ نمبر دو، حالات و واقعات اس امر کی جانب بڑے واضح اشارے کر رہے ہیں

کہ یہ قتل ملزمہ ہی نے کیا ہے۔"

میں چند لمحات تک بڑی گہری نگاہ سے اسے گھورتا رہا، پھر ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

"آئی۔ او صاحب! یہ عدالت حالات و واقعات کی جانچ پڑتال کے لئے ہی منعقد کی گئی ہے۔ آپ نے جن واضح اشاروں کا ذکر کیا ہے اس کا پول کھلنے میں زیادہ دیر نہیں۔ بہرحال، آپ کے تعاون کا بہت شکریہ۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے جرح کا سلسلہ موقوف کر دیا۔

اگلا گواہ مقتول کا مالک مکان داؤد تھا۔ داؤد سانولے رنگ اور درمیانے قد کا مالک ایک صحت مند شخص تھا۔ اس کی عمر پچاس اور پچپن کے درمیان رہی ہو گی۔ اس نے سلیٹی رنگ کا بے داغ شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ داؤد نے منظور کالونی میں لیدر جیکٹس بنانے کی ایک کاٹیج انڈسٹری قائم کر رکھی تھی۔ وہ اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کروا چکا تو وکیل استغاثہ جرح کے لئے اس کے کٹہرے کے نزدیک پہنچ گیا۔

وکیل مخالف نے دو چار سوالات پوچھ کر جرح ختم کر دی تو جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد میں گواہ داؤد کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"داؤد صاحب!" میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "آج کل آپ کا بزنس تو ڈاؤن ہی جا رہا ہو گا۔ موسم گرما اپنے جوبن پر ہے۔"

اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ اسے توقع نہیں رہی ہو گی کہ میں زیر سماعت کیس سے ہٹ کر اس سے ذاتی نوعیت کا کوئی سوال بھی کر سکتا ہوں۔ بہرحال ایک لمحے کی حیرت کے بعد اس نے جواب دیا۔

"وکیل صاحب! ہمارے ساتھ بالکل اُلٹا معاملہ ہے۔ موسم گرما میں ہمیں زیادہ پروڈکشن دینا ہوتی ہے اور موسم سرما میں ہمارا کام بہت کم رہ جاتا ہے۔ دراصل ہم جن پارٹیوں کے آرڈرز پر مال تیار کرتے ہیں وہ زیادہ تر مال ایکسپورٹ کرتے ہیں۔"

"اوہ ــــــ!" میں نے ایک طویل سانس خارج کی۔ "اس کا مطلب ہے آج کل آپ کی مصروفیت زیادہ ہو گی۔"

"جی ہاں۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہے۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "حالات و واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ جس وقت وقوعہ پیش آیا آپ اپنے گھر کے اندر موجود تھے اور آپ ہی نے تھانے میں فون کر کے پولیس کو بلایا تھا۔ آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا، آپ کے کرائے دار کو میری مؤکل نے قتل کر دیا

ہے؟''

''یہ بات مجھے مقتول کی بیوی نرگس کی زبانی پتہ چلی تھی۔'' اس نے بڑی رسانیت سے جواب دیا۔ ''میں اس وقت فیکٹری جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ میری بیوی نے بتایا کہ نیچے والی کرائے دارنی روتی ہوئی آئی ہے، اپنے شوہر کے قتل کے بارے میں بتا رہی ہے۔ اس کے بعد ہی میں نے تھانے فون کر کے اس سنگین واقعے کی اطلاع دی۔ یہ قتل میرے گھر کی چار دیواری کے اندر ہوا تھا لیکن میں گہری تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔''

''داؤد صاحب!'' میں نے اسے پکا اور اپنے کیس کو مضبوطی فراہم کرنے کی غرض سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا مقتول کی بیوہ نرگس نے بہ عین یہ الفاظ ادا کئے تھے کہ ـــــ ملزمہ تابندہ نے اس کے شوہر کو قتل کر دیا ہے ـــــ یا آپ نے اس کے بیان سے ایسا مفہوم اخذ کر لیا تھا؟''

''اس نے بہ عین یہی الفاظ ادا کئے تھے۔'' گواہ نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ''میں نے از خود کسی قسم کا مفہوم اخذ نہیں کیا تھا۔''

''کیا آپ کو اس وقت یہ بات معلوم تھی کہ مقتول کی بیوہ جس عورت کو اپنے شوہر کا قاتل ٹھہرا رہی ہے وہ مقتول کی دوسری بیوی ہے؟''

''نہیں جناب! مجھے مقتول کی دوسری شادی کا کوئی علم نہیں تھا۔''

''کیا آپ نے اس واقعے کی اطلاع تھانے تک پہنچانے سے پہلے مقتول کی بیوہ سے یہ سوال کیا تھا کہ اسے کیسے معلوم ہوا، میری مؤکل نے اس کے شوہر کو قتل کر دیا ہے؟''

''جی ہاں ـــــ میں نے مقتول کی بیوہ سے یہ پوچھا تھا۔''

''پھر اس نے کیا جواب دیا؟''

میرے اس سوال کے جواب میں گواہ داؤد نے بتایا کہ مقتول کی بیوہ کی زبانی اسے پتہ چلا تھا کہ ملزمہ تابندہ کو وہ گھر میں چھوڑ کر بچوں کو سکول پہنچانے گئی تھی۔ واپسی میں اسے تھوڑی دیر ہو گئی۔ وہ روزمرہ کی خریداری کے لئے دکان کی طرف چلی گئی تھی۔ پھر جب وہ گھر کے اندر داخل ہوئی تو مقتول کو خون میں لت پت پڑے دیکھا۔ مقتول کا ریوالور بھی اسی کمرے میں تھوڑے فاصلے پر پڑا ہوا تھا۔ وہ فوراً سمجھ گئی کہ ملزمہ اس کے شوہر کو قتل کر کے فرار ہو گئی ہے۔ اس کے بعد ہی وہ روتی دھوتی ہوئی گواہ کے گھر پہنچی تھی ـــــ بات کے اختتام پر داؤد نے کہا۔

''اپنے شوہر کی قتل کی روداد بیان کرتے ہوئے مقتول کی بیوہ نے ہرگز یہ نہیں بتایا تھا کہ

ملزمہ اس کی سوتن ہے۔ مقتول نے دو شادیاں کر رکھی تھیں، یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا تھا۔''

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ ''داؤد صاحب! کیا مقتول سے آپ کی کوئی پرانی جان پہچان تھی؟''

استغاثہ کے گواہ نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''اس کا مطلب ہے جب آپ اپنے گھر کا ایک زیریں پورشن کرائے پر اٹھا رہے تھے تو آپ کی مقتول سے پہلی ملاقات ہوئی؟''

''جی ہاں ——— یہی حقیقت ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''داؤد صاحب! آپ نے ایک اجنبی، انجان شخص کو اپنے گھر کا ایک حصہ کیسے کرائے پر دے دیا؟''

''میرے گھر کا وہ پورشن ایک اسٹیٹ ایجنٹ کی معرفت کرائے پر اٹھا تھا۔'' اس نے بڑا معقول جواب دیا۔ ''اور میں نے اس سلسلے میں مقتول سے بھاری ڈیپازٹ بھی لیا تھا۔ ویسے بھی جو گھر پراپرٹی ایجنٹ کے توسط سے کرائے پر اٹھتے ہیں ان کے ذیل میں کسی اونچ نیچ کا ذمہ دار بھی وہی پراپرٹی ڈیلر ہی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے درمیان باقاعدہ لیگل ایگریمنٹ بھی ہوا تھا۔ اس لئے بھی میں نے مقتول کے بارے میں کسی چھان بین کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مقتول طے شدہ تاریخ پر بن مانگے مجھے کرایہ ادا کر رہا تھا لہٰذا مجھے اس سے کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں تھی۔''

''داؤد صاحب! مقتول اور اس کی فیملی آپ کے گھر کے ایک زیریں پورشن میں رہائش پذیر تھے۔ یعنی آپ اور آپ کے دونوں کرائے دار ایک ہی چار دیواری میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ ایک گھر میں آنے والے مہمانوں کے بارے میں دوسروں کو مطلق خبر نہ ہو۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتائیں گے کہ مقتول کے گھر میں کس قسم کے لوگ آیا کرتے تھے؟''

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد گویا ہوا۔ ''میں نے مقتول کے گھر میں مہمانوں کی آمد و شد دیکھی اور نہ ہی مجھے ایسی کوئی خبر ملی تھی۔ شاید ایک آدھ مرتبہ اندرونِ سندھ سے کوئی ان سے ملنے آیا تھا۔''

''یعنی آپ نے کبھی ملزمہ تابندہ کو مقتول کے گھر آتے جاتے نہیں دیکھا؟''

''جی ——— بالکل نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولا۔

''وقوعہ کے روز بھی نہیں؟''

''نہیں!'' اس کا جواب دوٹوک تھا۔

اس کے ساتھ ہی میں نے استغاثہ کے گواہ داؤد پر جرح ختم کر دی۔

اس کے بعد مقتول کے انتہائی پڑوسی کی بیوی کو گواہی کے لئے کٹہرے میں بلایا گیا۔ استغاثہ کی اس گواہ کا نام ہما تھا۔ یہ ایک کرسچین فیملی تھی۔ ہما اپنے شوہر ساؤل اور تین بچوں کے ساتھ زیریں منزل والے دوسرے پورشن میں رہتی تھی۔ دونوں پورشنز کے داخلی دروازے ایک دوسرے کے سامنے کھلتے تھے۔ ہما مائل بہ فربہی جسم کی مالک ایک خوبصورت عورت تھی۔ اس نے حلفیہ بیان ریکارڈ کرا دیا تو وکیل استغاثہ جرح کے لئے اس کے پاس چلا گیا۔

ہما جائے وقوعہ پر ملزمہ کی آمد کی چشم دید گواہ تھی۔ وکیل استغاثہ نے سرکاری مؤقف کو مضبوط کرنے کی کوشش میں گواہ سے پوچھا۔

''ہما صاحبہ! آپ نے وقوعہ کے روز ملزمہ کو مقتول کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ آپ کو اس کی آمد سے کیا اندازہ ہوا؟''

''اُس عورت نے انتہائی بد اخلاقی کا مظاہرہ کیا تھا'' ہما نے ناگواری سے ملزمہ کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں اس وقت لائن کا پانی چیک کر رہی تھی۔ مین گیٹ پر دستک کی آواز سن کر جب میں نے گیٹ کھولا تو ملزمہ سے نظریں چار ہوئیں۔ اس نے کسی سلام دعا کے بغیر اُکھڑے ہوئے لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔ وسیم درانی کا گھر کون سا ہے؟ میں نے اس کے مطلوبہ گھر کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا، کیا آپ وسیم صاحب کی کوئی رشتے دار ہیں؟ آپ خاصی پریشان نظر آ رہی ہیں، خیریت تو ہے؟ اس موقع پر ملزمہ کا فرض بنتا تھا وہ مجھے کوئی بھی جواب دیتی ——— اچھا یا برا! مگر اس نے تو پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا اور وسیم کے دروازے کی جانب بڑھ گئی۔'' ہما لمحہ بھر کو متوقف ہوئی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے یہ عورت ذرا سا بھی نہیں بھائی تھی۔ اس کے تیور سے اندازہ ہوتا تھا یہ کوئی بڑا ہی خطرناک ارادہ لے کر وہاں پہنچی تھی۔''

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''کیا آپ نے ملزمہ کو واپس جاتے ہوئے بھی دیکھا تھا؟''

''جی نہیں ——— میں اپنا کام کر کے گھر کے اندر چلی گئی تھی۔''

''اس کے بعد کیا ہوا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے سوال کیا۔

''میں گھر کے کام کاج میں لگ گئی تھی۔'' ہما نے جواب دیا۔ ''کچھ دیر کے بعد میں نے مقتول والے پورشن کا دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھلتا ہوا سنا۔ آمنے سامنے داخلی دروازہ ہونے کے باعث جب زور سے ایک دروازہ کھولا جائے تو ہوا کا دباؤ دوسرے دروازے پر ہلکی

سی ''دستک'' دیتا ہے۔ ہمارا دروازہ مخصوص انداز میں لرزا پھر تیز قدموں کی آواز نمودار ہوئی۔ اس کے بعد یہ آواز سیڑھیوں کے توسط سے اوپر کو جانے لگی۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ کوئی مقتول کے گھر سے نکل کر افراتفری کے عالم میں بالائی منزل کی طرف گیا ہے۔ میں سن گن لینے کے لئے باہر نکلی اور پھر سب کچھ واضح ہو گیا۔ مقتول کا دروازہ پوری طرح کھلا ہوا تھا۔ میں سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔ اسی لمحے بالائی منزل کی طرف سے مقتول کی بیوی نرگس کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ اسی رونے کے دوران وہ مالک مکان اور اس کی بیوی کو اپنے شوہر کے قتل کے بارے میں بتا رہی تھی۔ میں چونکہ سیڑھیوں کے راستے کافی اوپر جا چکی تھی لہٰذا نرگس کی باتیں سننے اور سمجھنے میں مجھے کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔''

وکیل استغاثہ نے اسی قسم کے ایک دو مزید سوالات کے بعد جرح موقوف کر دی۔

اپنی باری پر میں گواہوں والے کٹہرے کے پاس پہنچا اور استغاثہ کی گواہ ہما ساؤل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہما صاحبہ! اپنی یادداشت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ ''میں سمجھی نہیں، آپ کیا پوچھنا چاہ رہے ہیں؟''

''میں یہ پوچھنا چاہ رہا ہوں۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی یادداشت اچھی ہے، بہت اچھی ہے یا بس گزارہ ہی ہے؟''

''جناب! میری یادداشت بہت اچھی سے بھی زیادہ اچھی ہے۔'' وہ فخریہ لہجے میں بولی۔ ''مجھے برسوں پرانی باتیں پوری تفصیل کے ساتھ یاد ہیں۔ ساؤل بھی اس بات کو مانتا ہے کہ میرا مشاہدہ اور حافظہ بہت قوی ہے۔''

''آپ کی یہ صلاحیتیں میرے لئے کسی خوش خبری سے کم نہیں ہیں ہما بی بی!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا پھر اکیوزڈ باکس میں کھڑی اس کیس کی ملزمہ اور میری مؤکل تابندہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے استغاثہ کی گواہ ہما سے پوچھا۔ ''کیا آپ اسے جانتی ہیں؟''

''میں اس عورت کو کیسے بھول سکتی ہوں؟'' وہ قدرے سخت انداز میں بولی۔ ''وقوعہ کے روز یہی تو بد اخلاقی سے میرے ساتھ پیش آئی تھی۔ یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا، یہ نرگس کی سوتن ہے۔''

آخری جملہ اس نے اس انداز میں ادا کیا تھا جیسے کہنا چاہ رہی ہو اگر اسے پہلے پتہ چل جاتا کہ ملزمہ، نرگس کی سوتن ہے تو شاید وہ اسے کچا ہی چبا ڈالتی۔ میں نے سوتن کے حوالے سے عورت کی مخصوص نفسیات کو زیر بحث لانے سے احتراز برتا اور استغاثہ کی گواہ ہما سے پوچھا۔

"مسز ساؤل! اگر میں یہ کہوں کہ اس وقت ملزموں والے کٹہرے میں جو عورت کھڑی ہے یہ وہ نہیں ہے جسے وقوعہ کے روز آپ نے مقتول کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا تھا تو آپ کیا کہیں گی؟"

اس نے اُلجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولی۔ "پھر تو میں یہی کہوں گی، آپ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔"

"یعنی آپ کو یقین ہے، مذکورہ عورت یہی ہے؟"

"ایک سو ایک فیصد یقین ہے۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ "اگر آپ کہیں تو میں یہ بھی بتا سکتی ہوں کہ اس روز ملزمہ نے کون سا لباس پہن رکھا تھا۔ لگتا ہے آپ میری یادداشت کو آزمانے کے موڈ میں ہیں۔"

اس اللہ کی بندی نے میرا کام نہایت ہی آسان کر دیا۔ واقعی میں اس سے اگلا سوال ملزمہ کے لباس کے بارے ہی میں کرنے والا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ "ہما صاحبہ! آپ کی یادداشت کا امتحان تو مقصود نہیں۔ ہاں، اگر آپ ملزمہ کے لباس کے حوالے سے کوئی حتمی اور پُر یقین بات بتا سکتی ہیں تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔"

"یہ کون سا مشکل کام ہے۔" وہ سرسری انداز میں بولی۔ پھر لباس کی تفصیل بتانے لگی۔ "وقوعہ کے روز جب میں نے ملزمہ کو زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تو اس نے پھول دار گلابی قمیض، گلابی پلین شلوار اور سیاہ دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس کے پاؤں میں بلیک سینڈل تھی اور لباس کے اوپر اس نے نیلی جرسی بھی پہن رکھی تھی ـــــ"

"بس، بس ـــــ اتنا ہی کافی ہے۔" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔

وہ خاموش ہو کر سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "ہما صاحبہ! آپ نے وکیل استغاثہ کی جرح کے جواب میں بتایا ہے کہ جب وقوعہ کے روز آپ نے ملزمہ کے لئے اس کی دستک کے جواب میں گیٹ کھولا تو آپ اس وقت لائن کا پانی چیک کر رہی تھیں ـــــ یہ لائن اور پانی کا کیا چکر ہے، ذرا وضاحت فرمائیں گی؟"

یہ ایک غیر اہم اور غیر متعلق سا سوال تھا لیکن میں استغاثہ کی گواہ کو ایک خاص زاویے سے گھس کر اس کی اور وکیل مخالف کی بے خبری میں نہایت ہی اہم باتیں اُگلوانا چاہتا تھا۔ میرا تیر نشانے پر لگا اور ہما نے میری مرضی کے عین مطابق بولنا شروع کر دیا۔ اب یہ میری مہارت ہوتی کہ میں کس مرحلے پر اسے کیسے ہینڈل کرتا۔ میں بہر حال اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ استغاثہ کی گواہ نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔

''وکیل صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ گھر کے زیریں حصے میں پانی والا زیرزمین ٹینک بنا ہوا ہے۔ اس چار دیواری میں بسنے والے تینوں خاندانوں نے باہمی مشاورت سے یہ طے کر رکھا ہے کہ جب بھی جس کو موقع ملے، وہ موٹر آن کر کے لائن کا پانی چیک کر لے۔ اگر صاف ستھرا پانی آ رہا ہو تو پانی والے پائپ کو ٹینک میں ڈال دیا جائے ورنہ موٹر بند کر دی جائے۔ میں اس وقت پانی ہی کو چیک کر رہی تھی۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

میں نے اگلا سوال کیا۔ ''عموماً آپ کی لائن میں کتنے بجے پانی آتا ہے؟''

''کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔ اس کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔'' وہ سادگی سے بولی۔ ''اسی لئے گھنٹے، دو گھنٹے بعد جس کو بھی موقع ملے وہ لائن کا میٹھا پانی چیک کر لیتا ہے۔''

''ہما صاحبہ! آپ یادداشت کے امتحان کا سیمی فائنل تو جیت چکی ہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''اب آپ کے سامنے فائنل ہے۔ اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور یاد کر کے بتائیں، جب وقوعہ کے روز آپ لائن کا پانی چیک کر رہی تھیں یعنی جس لمحے ملزمہ اس گھر میں داخل ہوئی تو تب صبح کے کتنے بجے تھے؟ آپ سمجھ گئی ہوں گی، میں وقت کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور جواب دیا۔ ''اس وقت کم و بیش صبح کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔''

''آپ کو ساڑھے آٹھ ہی کا یقین کیوں ہے؟'' میں نے اصراری لہجے میں کہا۔ ''آٹھ ــــــ یا پھر نو کیوں نہیں؟''

''آٹھ بجے ساؤل دفتر جانے کے لئے نکلتا ہے۔'' وہ پُر اعتماد لہجے میں بولی۔ ''اس کے جانے کے بعد میں ناشتے کے برتن دھو کر کچن سمیٹتی ہوں۔ اس کام میں لگ بھگ آدھا گھنٹہ صرف ہوتا ہے۔ اس کے بعد میں باہر نکل کر پانی چیک کرتی ہوں۔'' وہ لحہ بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''وقوعہ کے روز بھی میں نے اسی معمول پر عمل کیا تھا اس لئے مجھے یقین ہے، اس وقت صبح کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔''

''اوکے!'' میں نے سرسری انداز میں کہا اور زاویۂ سوالات کو ایک مرتبہ پھر تبدیل کر دیا۔

''ہما صاحبہ! آپ کے کتنے بچے ہیں؟'' میں نے استغاثہ کی گواہ سے پوچھا۔

''تین ــــــ'' اس نے جواب دیا۔ ''دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ بیٹا دونوں بہنوں سے چھوٹا ہے۔''

''کیا آپ کے یہ تینوں بچے سکول جاتے ہیں؟''
''جی ہاں!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔
''کس سکول میں؟''
اس نے ایک پرائیویٹ سکول کا نام بتایا۔ میں نے تصدیقی انداز میں استفسار کیا۔
''یہ وہی سکول تو نہیں جہاں مقتول کے دو بچے بھی پڑھتے ہیں؟''
''جی ہاں ـــــ جی ہاں، وہی۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''یہ سکول دو گلی چھوڑ کر قریب ہی میں ہے۔''
''بچوں کو سکول کون پہنچاتا ہے ـــــ آپ یا آپ کے شوہر؟''
وکیل استغاثہ کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ جج سے مخاطب ہوتے ہوئے احتجاجی انداز میں بولا۔ ''آبجیکشن یور آنر! وکیل صفائی انتہائی غیر متعلق سوالات کر کے معزز گواہ کو ہراساں کر رہے ہیں اور ـــــ اور عدالت کا قیمتی وقت بھی برباد ہو رہا ہے۔''
میں نے وکیل مخالف کے پُر تکلیف اعتراض پر حیرت سے استغاثہ کی گواہ کی طرف دیکھا اور دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے سادگی سے کہا۔ ''مجھے تو استغاثہ کی گواہ بڑی ہشاش بشاش دکھائی دے رہی ہیں۔'' پھر میں نے وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے کڑوے لہجے میں استفسار کیا۔
''کیا ہراساں ہونا اسے کہتے ہیں؟''
جج سمجھ گیا کہ اب ہمارے درمیان ایک نئی بحث کا دروازہ کھلنے والا ہے جس سے واقعتاً عدالت کا قیمتی وقت برباد ہونے کے قوی امکانات تھے۔ اس نے سپاٹ لہجے میں مجھ سے پوچھ لیا۔
''بیگ صاحب! آپ اپنے ان سوالات کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟''
''میں تو یہی کہوں گا جنابِ عالی!'' میں نے تعظیم سے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔ ''کہ میرے یہ سوالات خالی از علّت نہیں ـــــ زیر سماعت کیس سے ان کا گہرا تعلق ہے۔ اور یہ تعلق میں بہت جلد معزز عدالت کے سامنے واضح کرنے والا ہوں۔'' میں لحہ بھر کے لئے متوقف ہوا پھر نہایت ہی سنجیدہ انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یور آنر! معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ مجھے میری بات مکمل کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ وکیل سرکار کی بے جا مداخلت درحقیقت عدالت کا قیمتی وقت برباد ہونے کا موجب بن سکتی ہے۔''
جج نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بیگ صاحب! پلیز

پروسیڈ۔"

میں استغاثہ کی گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔"جی ہما صاحبہ! بچوں کو سکول پہنچانے کی ذمہ داری آپ کی ہے یا ساؤل کی؟"

"بچوں کا سکول آٹھ بجے شروع ہوتا ہے۔" ہما نے بڑی رسانیت سے جواب دیا۔"ساؤل بھی ڈیوٹی پر جانے کے لئے اتنے بجے ہی گھر سے نکلتا ہے۔لہٰذا یہ ذمہ داری ساؤل نے اپنے حصے میں لے رکھی ہے۔"

"تھینک یو ہما ساؤل!" میں نے گواہ کو فارغ کرتے ہوئے کہا پھر روئے سخن جج کی طرف موڑتے ہوئے اضافہ کیا۔"جنابِ عالی! میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے ایک چھوٹا سا سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔"

عدالت کا وقت ختم ہونے میں محض پندرہ منٹ باقی تھے۔اس قلیل مدت میں کسی گواہ کو شہادت کے لئے پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔میں نے اسی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جج سے درخواست کی۔جج نے فوراً ہی میری "فرمائش" پوری کر دی۔

انکوائری آفیسر گواہوں والے کٹہرے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔عدالت میں ایک وقت میں صرف ایک گواہ ہی کو پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس کا بیان دوسرے گواہ کی شہادت کو متاثر نہ کر سکے۔تھوڑی دیر پہلے اسی کٹہرے میں ہما کھڑی میری جرح کا سامنا کر رہی تھی جہاں اب انکوائری آفیسر نظر آ رہا تھا ـــــ ہما گواہی مکمل ہونے کے بعد عدالت کے کمرے سے باہر جا چکی تھی۔

میں آئی۔او کے پاس پہنچا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔"مرزا صاحب! جب آپ نے ملزمہ کو اس کے میکے واقع ایف سی ایریا سے گرفتار کیا تو اس نے کس قسم کا لباس پہن رکھا تھا؟"

وہ بے ساختہ بول اٹھا۔"ابھی استغاثہ کی گواہ ہما ساؤل نے معزز عدالت کے روبرو ملزمہ کے لباس کی تفصیل بیان تو کی ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے گلابی پلین شلوار، گلابی پھول دار قمیض، نیلی جرسی، کالی سینڈل اور کالا دوپٹہ ـــــ"

"جی جی ـــــ میرا یہی مطلب ہے۔" وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی تصدیقی انداز میں بول اٹھا۔

"آئی۔او صاحب!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''کیا کسی ستم رسیدہ اور دُکھوں کی ماری ہوئی مصیبت زدہ عورت کے اعصاب اتنے مضبوط ہو سکتے ہیں کہ وہ ایک خاص پلاننگ کے تحت اپنے گھر سے آٹھ دس میل دور پہنچے، ایک شخص کو بڑی دیدہ دلیری سے قتل کرے، آٹھ دس میل کا فاصلہ طے کر کے واپس بڑے اطمینان سے گھر پہنچے اور معمول کے مطابق گھریلو کام کاج میں مصروف ہو جائے۔ حتیٰ کہ جب آپ اس کی گرفتاری کے لئے پہنچیں تو وہ نہایت سکون سے کچن میں کھانا پکانے میں مگن ہو ــــــ اور تو اور، اس نے لباس تبدیل کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی ہو؟ یہ بڑی غیر فطری سی اور ہضم نہ ہونے والی بات نہیں؟''

وہ چند لحات تک معاندانہ نظر سے مجھے گھورتا رہا جیسے میں نے اس کے کسی دُکھتے ہوئے مسّے کو چھیڑنے کی غلطی کر دی ہو۔ اس کے بعد بپھرے ہوئے لہجے میں اس نے جواب دیا۔

''وکیل صاحب! یہ سوال تو آپ کو اپنی مؤکل سے پوچھنا چاہئے کہ وہ اعصاب کی مضبوطی کے لئے کون سا کشتہ یا ٹانک استعمال کرتی ہے اور ــــــ اور جہاں تک کسی شے کے ہضم نہ ہونے کا تعلق ہے، یہ آپ اپنے بارے میں زیادہ جانتے ہوں گے۔''

''تھینک یو آئی۔ او دلشاد مرزا صاحب!'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اپنے اور اپنی مؤکل کے بارے میں تو مجھے مکمل معلومات ہیں ــــــ باقی جو باتیں اُلجھن پیدا کرنے کا سبب بن رہی ہیں ان کی سلجھن کے لئے میں استغاثہ کی سب سے بڑی اور اہم گواہ، اس کیس کی مدعی، میری مؤکل کی سوتن نرگس کو ضرور زحمت دوں گا۔''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت اختتام کو پہنچا۔ جج نے آئندہ پیشی کے لئے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخواست کر دی۔

میں عدالت کے کمرے سے نکلا تو ملزمہ کا باپ آفتاب حسین میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ برآمدے سے گزرتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔

''بیگ صاحب! یہ کیس کچھ زیادہ ہی طویل نہیں ہوتا جا رہا؟''

''ہرگز نہیں۔'' میں نے قطعیت سے کہا۔ ''آفتاب صاحب! قتل کے مقدمات تو برسوں چلتے ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' وہ گہرے تذبذب میں دکھائی دیتا تھا۔ ''مگر میں محسوس کر رہا ہوں، عدالتی کارروائی خاصی سست جا رہی ہے۔''

''آپ کا خیال بالکل غلط ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اب تک ہونے والی عدالتی کارروائی سے پوری طرح مطمئن ہوں۔ اس دوران میں نے جن

چن کر بارود کے ذرّات جمع کر لئے ہیں۔ ان ذرّات نے اجتماعی طور پر ایک ہلاکت خیز بم کی صورت اختیار کر لی ہے جو انشاء اللہ عنقریب عدالت میں تابندہ کے دشمنوں کے سر پر پھٹے گا۔ آپ کو کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے سانس درست کرنے کے لئے تھوڑا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ نے اب تک بڑا تعاون کیا ہے آفتاب صاحب! اور میں نے بھی کوشش کر کے بہت کچھ حاصل کر لیا ہے ـــــــ ان سب کو مناسب موقع پر استعمال کیا جائے گا اور ایسا مناسب موقع ہاتھ آنے میں اب زیادہ دیر باقی نہیں ہے بس ایک دو پیشیوں کی بات ہے۔ پھر میں عدالت میں ایسا دھما کا کروں گا کہ آپ کی صاحبزادی اس کیس سے باعزت بری ہو جائے گی۔''

میری اس تسلی تشفی سے وہ پُرسکون ہو گیا۔۔ اس نے مجھ سے پُرجوش مصافحہ کیا اور میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہو گیا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنی گاڑی کی سمت بڑھ گیا۔

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے دو گواہ پیش کئے گئے۔ ان کا حلفیہ بیان ریکارڈ ہونے کے بعد پہلے وکیل استغاثہ نے ان پر جرح کی پھر میں نے اپنی ڈیوٹی نبھائی۔ ان دونوں گواہوں کے بیانات میں کوئی ایسی خاص اور اہم بات موجود نہیں جسے میں یہاں تحریر کر کے قیمتی صفحات کو ضائع کروں۔ معمول کی عدالتی کارروائی مکمل ہونے پر جج نے اگلی پیشی کی تاریخ دے دی۔

مگر اگلی پیشی پر بھی کوئی قابل ذکر کارروائی عمل میں نہ آئی۔ وکیل استغاثہ میڈیکل لیو سرٹیفکیٹ دے کر غائب ہو گیا۔ اس سے اگلی پیشی پندرہ روز بعد کی تھی اور یہ اس کیس کی سب سے اہم پیشی تھی۔ کیونکہ اس پیشی پر استغاثہ کی آخری گواہ اور مقتول کی بیوہ نمبر ایک نرگس کو گواہی کے لئے عدالت میں آنا تھا۔

میں ان پندرہ دنوں کا ایک ایک دن گن گن کر گزارنے لگا۔

❀ ❀ ❀

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں نرگس موجود تھی۔

نرگس دراز قد کی مالک ایک گوری چٹی اور صحت مند عورت تھی۔ اس کے خال و خط میں دیہاتی خوبصورتی کے تمام رنگ شامل تھے۔ وہ خاصی ہشاش بشاش اور تر و تازہ دکھائی دیتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا اسے میدان میں اُتارنے سے قبل اچھی خاصی تیاری کروائی گئی ہو۔

میں نے اب تک استغاثہ کے گواہوں پر جو انتھک ''محنت'' کی تھی اس کا ثمر حاصل کرنے کا وقت سر پر آن پہنچا تھا۔

نرگس نے معزز عدالت کے روبرو خاصا لمبا چوڑا بیان دیا۔ اس روز میر پور خاص سے آئے ہوئے چند افراد بھی عدالت کے کمرے میں موجود تھے جن میں مقتول کا باپ کلیم درانی اور نرگس کا باپ قادر بخش نمایاں تھے۔ پچھلی ایک آدھ کارروائی میں بھی قادر بخش دکھائی دیا تھا۔ کلیم درانی تو ہر پیشی پر موجود ہوتا تھا۔ کلیم درانی اور نرگس اس کیس میں مدعی کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کیس کے پس منظر میں جھانکنے سے نظر آتا تھا کہ قادر بخش اور کلیم درانی اندر سے جڑ گئے ہیں اور انہوں نے میری مؤکل کو اپنے نشانے پر رکھ لیا تھا لیکن میں اس صورتِ حال سے بے خبر نہیں تھا۔ اس سلسلے میں، میں نے اپنی مؤکل اور اس کیس کی ملزمہ تابندہ کو اندر اور باہر سے خاصا مضبوط کر دیا لہٰذا پریشانی یا فکرمندی والی کوئی بات نہیں تھی۔

نرگس نے ابتداء میں پولیس کو جو بیان دیا تھا، عدالتی بیان ایک طرح سے اس کی ترقی یافتہ صورت تھی۔ اس نے خود کو مظلوم اور میری مؤکل کو ظالم گردانتے ہوئے حق تلف، چڑیل، ڈائن ـــــ اور جانے کون کون سے القابات سے نواز ڈالا تھا۔ کسی بھی کیس کی عدالتی کارروائی کے دوران ملزم سب سے زیادہ بے چارہ اور بے سہارا دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنے خلاف ہر قسم کے تیز و تند، تلخ و ترش اور کڑوی کسیلی بات سن کر خاموش رہنے پر مجبور ہوتا ہے۔

وکیل استغاثہ نے گواہ نرگس پر اپنی جرح موقوف کی تو میں اپنی باری بھگتانے کے لئے جج سے اجازت حاصل کر کے وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''نرگس صاحبہ! مجھے آپ کے شوہر کی موت کا دکھ ہے۔ پتہ نہیں، آپ کو میری بات کا یقین آئے یا نہ آئے مگر میں نے اپنے دلی جذبات کو آپ تک پہنچا دیا ہے۔''

وہ خفگی آمیز لہجے میں بولی۔ ''مجھے آپ کی بات کا قطعاً یقین نہیں ہے۔''

میں نے حیرت سے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ یہ حیرت دو رُخی تھی۔ ایک تو مجھے اس کے رُوکھے پھیکے جواب پر تعجب تھا اور دوسرے اس بات کی حیرانی کہ گاؤں دیہات کی پروردہ وہ عورت عدالت کے کمرے میں خاصی تیزی و طراری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ مجھے متذبذب دیکھتے ہوئے اس نے رڈا چڑھانے میں ذرا تاخیر نہ کی اور اسی رُکھائی سے بولی۔

''اگر آپ کو واقعی میرے شوہر کی موت کا افسوس ہوتا یا مجھ سے ہمدردی ہوتی تو آپ اس وقت وسیم کی قاتل کی وکالت کرتے نظر نہ آتے۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس بات سے بحث نہیں ہے کہ آپ کو میری نیت پر شبہ کیوں ہے۔ بہرحال، یہ بات طے ہے کہ جب تک عدالت میری مؤکل کے قاتل ہونے کا فیصلہ نہیں سنا دیتی، میری نگاہ میں اس کی حیثیت ایک مظلوم اور بے گناہ انسان جیسی ہے اور ـــــ مجھے وکالت کا ہتھیار استعمال کر کے ہر حال میں اپنی مؤکل کو بچانا ہے۔''

اس نے ایسی معنی خیز نگاہوں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو ـــــ اونہہ! دیکھتی ہوں، کیسے بچاتے ہیں؟

میں نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے نہایت ہی معتدل انداز میں سوال کیا۔ ''نرگس صاحبہ! آپ مقتول کی پہلی بیوی تھیں اور میر پور خاص میں رہتی تھیں۔ مقتول نے آپ کو بے خبر رکھتے ہوئے ملزمہ سے شادی کر لی۔ کچھ عرصے بعد آپ اپنے دونوں بچوں کو لے کر کراچی آ گئیں اور مستقل یہیں رہائش اختیار کر لی۔ ذرا سوچ کر جواب دیں، آپ کو کب اور کیسے پتہ چلا کہ مقتول نے کراچی میں دوسری شادی کر لی ہے؟''

''مجھے یہ خبر میرے بابا نے دی تھی۔'' اس نے قادر بخش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بابا کو اس شادی کے بارے میں وسیم کے باپ کلیم درانی نے بتایا تھا۔ میرا سسر خود یہاں میری سوتن سے مل کر گیا تھا۔''

بات ختم کرتے ہی نرگس نے نفرت آمیز انداز میں تابندہ کی طرف دیکھا۔ دونوں سوتنیں اس وقت ایک دوسرے کے روبرو کھڑی تھیں۔ بس کٹہرے کا فرق تھا۔ ان میں سے ایک گواہ اور دوسری ملزمہ تھی۔ مقتول وسیم درانی اپنی زندگی میں تو انہیں ایک چھت کے نیچے آباد نہیں کر سکا تھا لیکن حالات کی ایک بے رحم کروٹ نے آج انہیں عدالت کی چھت کے نیچے اکٹھا کر دیا تھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نرگس صاحبہ! میرا سوال ابھی تک جواب طلب ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں مقتول کی دوسری شادی کی خبر کراچی سے میر پور خاص کیسے پہنچی؟''

''یہ تو آپ میرے سسر صاحب سے پوچھیں۔'' وہ اُکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

میری درخواست پر جج نے مقتول کے والد کلیم درانی کو گواہی کے لئے کٹہرے میں بلا لیا۔

میں نے اپنا سوال دہرایا جس کے جواب میں کلیم درانی نے بتایا کہ اسے مقتول کی دوسری شادی کے بارے میں نعیم لاکھو نامی ایک آدمی نے بتایا تھا۔ یہ وہی نعیم لاکھو تھا جو ملزمہ کے باپ آفتاب حسین کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ گویا اس فتنے کی جڑ کو دریافت کرنے میں مجھے کامیابی حاصل ہو گئی۔ میں نے اب تک لاکھو کے کردار کا جس حد تک جائزہ لیا تھا اس کی روشنی میں وہ

ایک مفاد پرست، خودغرض، فتنہ انگیز اور شیطان صفت شخص کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آیا تھا۔
میں دوبارہ نرگس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''نرگس صاحبہ! کیا یہ صحیح ہے کہ وقوعہ سے پہلے والی رات آپ دونوں میاں بیوی میں اچھی خاصی تلخ کلامی ہوگئی تھی؟''

یہ معلومات تابندہ کی زبانی مجھے پتہ چلی تھیں۔ جب وقوعہ کے روز وہ مقتول کے گھر میں پہنچی تو وہ گھر میں اکیلا ہی تھا۔ اس نے تابندہ کو اپنی محبت کا یقین دلانے کے لئے نرگس سے ہونے والے جھگڑے کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ بہت جلد نرگس کو چھوڑ دے گا۔

نرگس نے میری توقع کے خلاف جواب دیا۔''ایسی کوئی بات نہیں وکیل صاحب! ہم میاں بیوی بڑے امن وسکون سے زندگی بسر کر رہے تھے۔''

میں نے ایک دوسرے زاویے سے گھسنے کی کوشش کی۔''اس کیس کی ملزمہ اور میری مؤکل تابندہ نے مجھے بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز اسے کسی اجنبی نے فون کر کے بتایا کہ مقتول آپ کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میر پور خاص جانے والا ہے۔ وہ تشویش میں مبتلا ہوگئی اور فوراً آپ لوگوں کے گھر واقع محمود آباد پہنچ گئی۔ وہاں پہنچ کر مقتول کی زبانی اُسے پتہ چلا کہ آپ لوگوں کا ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ کیا آپ اس پراسرار فون کرنے والے شخص کے بارے میں کچھ جانتی ہیں؟''

''جی نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولی۔''میں ایسے کسی شخص سے واقف نہیں ہوں۔''

میں نے فوکس کو تھوڑا تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔''نرگس صاحبہ! وقوعہ کے روز آپ دونوں بچوں کو سکول چھوڑنے گئی تھیں اور واپسی میں آپ کو خاصی دیر ہوگئی۔ کیا روزانہ آپ ہی بچوں کو سکول پہنچاتی تھیں؟''

''نہیں ـــــــ میں صرف اسی دن چھوڑنے گئی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔''کیونکہ وسیم کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔''

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔''نرگس صاحبہ! ملزمہ تابندہ کو آپ کی نشاندہی پر اس کے میکے سے گرفتار کیا گیا تھا۔ آپ نے پولیس کو بتایا تھا کہ آپ کی سوتن یعنی ملزمہ تابندہ نے آپ کے شوہر وسیم درانی کو قتل کر دیا ہے۔ اسی طرح کا بیان آپ نے اپنے مالک مکان اور استغاثہ کے گواہ مسٹر داؤد کو بھی دیا تھا۔ آپ روتی ہوئی اوپر اس کے گھر پہنچی تھیں اور اسے بتایا تھا کہ آپ ملزمہ تابندہ کو گھر میں چھوڑ کر بچوں کو سکول پہنچانے گئی تھیں اور واپسی پر

جب آپ گھر کے اندر داخل ہوئیں تو مقتول کو خون میں لت پت پڑے دیکھا۔ آلۂ قتل یعنی مقتول کا لائسنس یافتہ ریوالور بھی لاش کے قریب ہی پڑا ہوا تھا۔"

میں لمحہ بھر کو سانس لینے کے لئے ٹھہرا پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "آپ نے کس بات سے یہ اندازہ قائم کیا کہ مقتول کو ملزمہ ہی نے قتل کیا ہے۔ یہ خودکشی کا واقعہ بھی تو ہوسکتا تھا؟"

"نہیں ــــــ کبھی نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "وسیم خودکشی کے بارے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی زندگی میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا کہ اسے خودکشی کے لئے مجبور ہونا پڑتا۔"

"ٹھیک ہے ــــــ میں نہ چاہتے ہوئے بھی تھوڑی دیر کے لئے آپ کی بات کا یقین کر لیتا ہوں کہ وسیم نے خودکشی نہیں کی تھی۔ اب ذرا معزز عدالت کو یہ بھی بتا دیں کہ ملزمہ آپ کو کہاں مل گئی تھی جو آپ اسے گھر میں بٹھا کر بچوں کو سکول پہنچانے چلی گئی تھیں؟"

"ملنا کہاں تھا ــــــ" وہ گڑبڑاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ "یہ ہمارے گھر پر آئی تھی۔ میں اس وقت بچوں کو لے کر نکل ہی رہی تھی۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ یہ وسیم سے دو باتیں کرنے آئی ہے۔ میں نے اس کی لجاجت بھری صورت دیکھی تو مجھے اس پر ترس آ گیا۔ بہرحال، میری سوتن سہی لیکن یہ وسیم کی بیوی بھی تھی۔ اگر یہ وسیم سے دو باتیں کر لیتی تو اس میں میرا کیا بگڑ جاتا۔"

بات ختم کر کے وہ ایسی نظر سے مجھے اور وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگی جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہو کہ کہیں اس نے کوئی احمقانہ بات تو نہیں کر دی۔ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

"واہ، واہ ــــــ آپ تو بڑی فراخ دل اور ہمدرد خاتون ہیں۔ کاش! دنیا کی ساری بیویاں آپ جیسی سوتن نواز ہو جائیں تو بہت سارے گھریلو جھگڑے خود بخود ہی دم توڑ جائیں ــــــ بھئی واہ! آپ اپنی سوتن کو بیمار شوہر کے پاس گھر میں تنہا چھوڑ کر چلی گئیں اور خریداری میں آپ کا دل اس قدر لگا رہا کہ آپ کو واپسی میں اچھی خاصی دیر بھی ہو گئی ــــــ یہ اس صدی کی سب سے بڑی خبر ہے۔"

وہ برہمی سے بولی۔ "وکیل صاحب! میں آپ کو یقین دلانے کے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔"

میں نے اس کے بے جان تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے اگلا سوال کیا۔ "نرگس صاحبہ! وقوعہ کے روز بقول آپ کے ــــــ آپ ملزمہ کو اپنے گھر میں چھوڑ کر بچوں کو سکول پہنچانے گئی تھیں۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گی کہ آپ کتنے بجے گھر سے نکلی تھیں؟"

''یہی کوئی آٹھ بجے صبح۔'' اس نے متاملانہ انداز میں جواب دیا۔
''اور آپ کی واپسی کتنے بجے ہوئی تھی؟'' میں نے کڑے لہجے میں دریافت کیا۔
''لگ بھگ دس بجے۔''
''یعنی دو گھنٹے تک آپ گھر سے باہر رہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''میں بار بار اس بحث کو زیر بحث نہیں لاؤں گا کہ آپ اپنی سوتن کو گھر میں بٹھا کر اتنی بے فکر کیوں ہوگئی تھیں۔ ہم آپ کے بیان کو فوکس کرتے ہیں۔ آپ نے پہلے پولیس کو اور بعد ازاں معزز عدالت کے روبرو یہ بیان دیا ہے کہ آپ بچوں کو سکول پہنچانے کے بعد روزمرہ کی خریداری میں مصروف ہوگئی تھیں۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ دو گھنٹے تک آپ کیا کیا خرید فرماتی رہیں؟''

وہ بڑی مشکل میں گرفتار نظر آنے لگی۔ وکیل استغاثہ فوراً اس کی مدد کو لپکا۔ ''مجھے سخت اعتراض ہے جنابِ عالی! وکیل صفائی معزز گواہ کو غیر ضروری سوالات میں اُلجھا کر پریشان کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ انہیں ایسے حربوں سے باز رہنے کی تاکید کی جائے۔''

جج نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ وہ میرے سوالات کے زا یے اور اس کے نتیجے میں برآمد ہونے والے انکشافات کو سمجھ رہا تھا لہٰذا اس نے گمبھیر لہجے میں مجھ سے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ جرح جاری رکھیں۔''

جج کو میری حمایت میں بولتے دیکھ کر نرگس نروس ہوگئی۔ دونوں ہاتھوں کو ہوا میں لہراتے ہوئے اس نے کہا۔ ''میرے تو ذہن ہی سے سب کچھ نکل گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ـــــ'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر بے بسی سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھنے لگی۔

اس سے پہلے کہ وکیل استغاثہ کچھ بولتا، میں نے جلدی سے کہا۔ ''نرگس صاحبہ! آپ اپنے ذہن پر زیادہ زور نہ ڈالیں۔'' میرا اندازہ مارنے کے بعد سہلانے والا تھا۔ ''کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کا ذہن کام کرنے سے بالکل ہی انکار کردے۔ ابھی مجھے آپ سے بڑے اہم سوال کرنا ہیں۔ خریداری کے آئٹمز آپ کو یاد نہیں آ رہے، انہیں جہنم میں ڈالیں اور پورے ہوش و حواس سے میرے اگلے سوال کا جواب دیں۔''

وہ میرے نفسیاتی جھانسے میں آ گئی۔ اس نے ایک اطمینان بخش گہری سانس لی جیسے جان میں جان آ گئی ہو۔ اضطراری لہجے میں اس نے کہا۔ ''پوچھیں، کیا پوچھنا ہے؟''

میں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''نرگس صاحبہ! وقوعہ کے روز آپ ملزمہ کو اپنے گھر میں بٹھا کر باہر نکلی تھیں۔ اتنا تو آپ کو یاد ہی ہوگا کہ اس دن ملزمہ نے کون سا لباس پہنا ہوا

تھا؟''

وہ جواب دینے سے پہلے لحہ بھر کو ٹھٹکی پھر بولی۔ ''میرا خیال ہے اس نے گہرے نیلے رنگ کا شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا اور گرم شال بھی اوڑھ رکھی تھی۔''

صاف نظر آ رہا تھا کہ لباس کے بیان میں اس نے سراسر تک بندی سے کام لیا ہے۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا، اس نے وقوعہ کے روز ملزمہ کو اچھی طرح نہیں دیکھا یا پھر سرے سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر وقوعہ کے روز اس نے ملزمہ کو نہیں دیکھا تھا تو پھر ملزمہ کو گھر میں بٹھا کر جانے کے حوالے سے اس نے اتنا سنگین جھوٹ کیوں بولا تھا؟ اس سے جھوٹ اور جھوٹ کے مقاصد کی ایک ایک پرت اتارتے ہوئے میں نے کہا۔

''نرگس صاحبہ! آپ کے سامنے والی پڑوسن ہما نے استغاثہ کے ایک گواہ کی حیثیت سے معزز عدالت کو ملزمہ کے لباس کے بارے میں تفصیلاً بتایا ہے اور اس کیس کے انکوائری آفیسر نے گواہ کے بیان کی تصدیق بھی کی ہے لیکن آپ کے لئے ایک بری خبر یہ ہے کہ آپ کا بیان کردہ لباس ملزمہ کے لباس سے لگا نہیں کھاتا۔'' پھر میں نے اسے ملزمہ کے لباس کے بارے میں بتانے کے بعد پوچھا۔ ''آپ نے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا نرگس صاحبہ؟''

''میں ـــــ میں نے کوئی جھوٹ ـــــ نہیں بولا ـــــ'' وہ پھنکار سے مشابہ آواز میں بولی۔ گویا اس کے اعصاب میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل چل نکلا تھا۔ ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے ـــــ ہو سکتا ہے، لباس کا رنگ میرے ذہن سے نکل گیا ہو ـــــ میں نے ملزمہ کو سرسری نظر سے دیکھا تھا، باریک بینی سے اس کے لباس کا ایکسرے نہیں کیا تھا۔''

میں نے وار پر وار جاری رکھتے ہوئے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''نرگس صاحبہ! ایک لباس پر ہی موقوف نہیں، اور بھی بہت سی باتیں آپ کے خلاف جا رہی ہیں۔ آپ کے لئے بہتر یہی ہے کہ حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے معزز عدالت کو سب کچھ سچ سچ بتا دیں۔''

میرے اس شوگر کوٹیڈ دھیمے سے انداز نے اسے سلگا کر رکھ دیا۔ خاصے مشتعل انداز میں اس نے مجھ سے استفسار کیا۔ ''کون سی حقیقت ـــــ کیسا اعتراف ـــــ میں نے کیا، کیا ہے ـــــ میں نے کچھ نہیں کیا ـــــ'' وہ خود ہی سوال، خود ہی جواب دیئے جا رہی تھی۔ ''کون سی باتیں میرے خلاف جا رہی ہیں؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے بتایا۔ ''مثلاً یہ کہ ـــــ آپ نے ابھی معزز عدالت کے روبرو بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز آپ بچوں کو لے کر آٹھ بجے گھر سے نکلی تھیں اور آپ کے بیان ہی کے مطابق اسی وقت ملزمہ آپ کے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ لیکن ہما ساؤل کا

دعویٰ ہے کہ اس نے ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے دستک کے جواب میں ملزمہ کے لئے گیٹ کھولا تھا۔ اس آدھے گھنٹے کے فرق کو آپ کہاں کھپائیں گی؟''

اُسے جہاں خلا نظر آیا، کھپا ڈالا۔ بکھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''وقت تو پندرہ بیس منٹ آگے پیچھے ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے میں نے سوا آٹھ کو آٹھ سمجھ لیا ہو اور ہما سوا آٹھ کو ساڑھے آٹھ سمجھ بیٹھی ہو ــــــ ایسا ہو جاتا ہے بعض اوقات ــــــ کیا نہیں ہوتا؟''

ابتداء میں مجھے نرگس کے اندر جو اعتماد دکھائی دیا، اب اس کی کوئی جھلک نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا میری کڑی جرح نے اسے بنیاد سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ صرف ہلانا میرا مقصد نہیں تھا، میں تو اسے زمین بوس ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا لہٰذا جرح کی چکی کو اور رفتار دیتے ہوئے کہا۔

''نرگس صاحبہ! بعض اوقات اتفاقاً ایسا ہو جاتا ہوگا مگر آپ کے ساتھ معاملہ ذرا دوسری نوعیت کا ہے۔ آپ نے آدھے گھنٹے کے تفاوت کو بڑے بے ڈھنگے انداز میں کھپانے کی کوشش کی ہے۔ آدھا گھنٹہ ایسے نہیں کھپے گا کیونکہ ہما ساؤل کے علاوہ میڈم صبیحہ کا بیان بھی آپ کی مخالفت میں جاتا ہے۔''

''میڈم صبیحہ ــــــ!'' اس نے اُلجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ''وہ کیا کہتی ہیں؟''

میڈم صبیحہ اس پرائیویٹ سکول کی پرنسپل تھیں جہاں ہما اور نرگس کے بچے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ میں نے پچھلے دنوں اس سے ایک بھرپور ملاقات کی تھی اور اسے اس بات کے لئے تیار کر لیا تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو میں گواہی کے لئے اس کو عدالت میں پیش بھی کروں گا۔ اس بھلی مانس عورت نے مجھے اپنے تعاون کا یقین دلایا تھا۔

''میں میڈم صبیحہ کو اس بات کی تصدیق کے لئے یہاں بلا سکتا ہوں کہ وقوعہ کے روز آپ ٹھیک آٹھ بجے اپنے بچوں کو لے کر سکول پہنچی تھیں۔ سکول کا حاضری رجسٹر بھی اس بات کی گواہی دے گا۔ میڈم نے تمام ٹیچرز سے کہہ رکھا ہے کہ تاخیر سے آنے والے بچوں کی حاضری کے ساتھ پنسل کی مدد سے ایک مخصوص نشان بنا دیا کریں تاکہ ''عادی مجرم'' بچوں کے والدین کو سکول بلا کر تنبیہ کی جائے۔ میڈم کا یہ اصول مناسب ہے یا نامناسب، اس سے بحث نہیں، تاہم پچیس فروری کی حاضری سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے بچے بروقت سکول پہنچے تھے۔ اب آپ کیا فرمائیں گی؟''

''مم ــــــ میں سمجھ ــــــ گئی ہوں ــــــ'' وہ غصے کی شدت کے باعث لکنت زدہ انداز میں بولی۔ ''آ ــــــ آپ مجھے گھیرنے کی کوشش کر ــــــ رہے ہیں ــــــ!''

''میں نہیں نرگس صاحبہ!'' میں نے متانت سے کہا۔ ''حالات و واقعات اور حقائق آپ کو گھیرنے کے لئے بے تاب دکھائی دے رہے ہیں۔ آپ کی قسمت دغا دے رہی ہے۔ میں تو محض اپنی مؤکل کو بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

وہ یکدم آپے سے باہر نکل آئی۔ نہایت ہی غصیلے انداز میں اس نے مجھے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔ ''بیگ کے بچے! میں تمہیں دیکھ لوں گی اور تمہاری اس حرافہ مؤکل کو بھی۔ تمہیں پتہ نہیں، میرا ابا اپنے گاؤں کا وڈیرا ہے۔ وہ تم لوگوں کو چٹکیوں میں مسل کر رکھ دے گا۔''

نرگس کے جارحانہ، نامعقول اور دھمکی بھرے انداز نے جج کو معاملے کی تہہ تک پہنچا دیا۔ میں نے ضبط کے بندھن کو ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیا کیونکہ اسی میں میری کامیابی لکھی ہوئی تھی۔ میرے لئے اطمینان کی بات یہ تھی کہ جج نرگس کی طرف سے کھٹک گیا تھا۔ میں نرگس کو دھیرے دھیرے سہلاتے ہوئے اس حد تک گرم کر چکا تھا کہ بس اب صرف ایک ہی کاری ضرب کی ضرورت تھی ـــــــ اور میں نے وہ کاری ضرب لگا دی۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں مرنے سے نہیں ڈرتا لیکن مجھے تم اپنے باپ کی چٹکیوں میں مسلوانے سے پہلے یہ تو بتا دو، وقوعہ کے روز صبح ہی صبح میری مؤکل کو وہ پراسرار فون کال کس نے کی تھی؟''

وہ غصے کی شدت سے دہاڑی۔ ''میں نے بتایا ہے نا، میں کسی لاکھو یا کھو کو نہیں جانتی ـــــــ''

بولتے بولتے وہ اچانک یوں رک گئی جیسے دانتوں نے زبان کو بھینچ کر وارننگ دی ہو کہ بس، آگے مت بولنا ورنہ ـــــــ! خاموش ہوتے ہی وہ وحشت زدہ نظر سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا، لفظ زبان سے اور تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

''تھینک یو نرگس! تم نے تو بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے حالانکہ پہلے میرے ایک ایسے ہی سوال کے جواب میں تم اس پراسرار فون کرنے والے کے بارے میں اپنی لاعلمی اور ناواقفیت کا اظہار کر چکی ہو۔ میں نے پہلے بھی اور اب بھی کہیں لاکھو کا نام کوٹ نہیں کیا۔ محض ''پراسرار فون کرنے والا'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ لیکن اب بے ساختہ تمہاری زبان سے لاکھو کا نام نکلا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ پراسرار فون کال میری مؤکل کو پھنسانے کے لئے لاکھو نے کی تھی۔ کیوں اور کس کے اشارے پر؟ اس حقیقت کا پتہ چلانا پولیس کا کام ہے ـــــــ اور تم اچھی طرح جانتی ہو نرگس بی بی! پولیس کس طرح حقیقت کو بے نقاب کرتی ہے۔''

نرگس کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ دہشت بھری نظر سے عدالت میں موجود ایک ایک شخص کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ انہی چہروں میں ایک چہرہ اس کے مددگار یعنی وکیل استغاثہ کا بھی تھا مگر

اس کی صورت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا، بے ساختہ نرگس کی زبان سے پھسلنے والی سچائی نے اس کے تعزیے ٹھنڈے ٹھار کر دیئے تھے۔

میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ''جنابِ عالی! اب تک اس کیس کے سلسلے میں جو کارروائی ہوئی ہے اس کی روشنی میں میری مؤکل تابندہ کہیں بھی قصوروار دکھائی نہیں دیتی۔ استغاثہ کی سب سے اہم گواہ نرگس نے معزز عدالت کے سامنے جو سچ اُگلا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اپنے شوہر کے قاتل سے بخوبی آگاہ ہے۔ لاکھو نامی ایک فتنہ پرور شخص کا کردار عدالت کے سامنے واضح ہو چکا ہے اور یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ نرگس اور لاکھو کے درمیان کوئی گہرا تعلق ہے لہٰذا میں عدالت سے پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ وہ پولیس کو اس بات کی پابند کرے کہ وہ نرگس اور لاکھو کو شامل تفتیش کر کے ان کی زبان سے مزید سچ اُگلوانے کی کوشش کریں۔'' میں لمحہ بھر کے لئے متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''یور آنر! اس کے ساتھ ہی میں عدالت سے یہ درخواست بھی کروں گا کہ وہ میری مؤکل کو باعزت بری کرنے کے احکام صادر فرمائے۔ دیٹس آل یور آنر!''

جج نے میری مؤکل کو تو رہا نہیں کیا، تاہم نرگس اور لاکھو کی گرفتاری کے احکام صادر کر دیئے۔ اس کے ساتھ ہی پولیس کو تاکید کر دی کہ وہ جلد از جلد اس معاملے کی تفتیش کر کے رپورٹ پیش کرے۔

❀ ❀ ❀

پولیس نے اس سلسلے میں کچھ زیادہ ہی سرگرمی دکھائی۔ انہیں بڑے واضح اشارے مل چکے تھے لہٰذا لاکھو اور نرگس کی زبان کھلوانے کے لئے انہیں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ نرگس نے اپنے شوہر کے قتل کا اعتراف کرتے ہوئے جو بیان دیا، میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

مفاد پرست لاکھو نے وسیم اور آفتاب حسین کو ''نچوڑنے'' کے بعد کلیم درانی کا رُخ کیا۔ جب یہ فتنہ تھوڑا جوان ہوا اور کلیم درانی سے اسے مزید کوئی اُمید نہ رہی تو وہ بڑی ہوشیاری سے قادر بخش کی گود میں جا بیٹھا۔ اس وقت تک نرگس اپنے دونوں بچوں کے ساتھ کراچی شفٹ ہو چکی تھی۔ لاکھو کی نوکری بھی چونکہ کراچی ہی میں تھی لہٰذا قادر بخش نے اسے مستقل یہ ڈیوٹی سونپ دی کہ وہ نرگس کی خیر خبر رکھنے کے ساتھ ساتھ وسیم پر بھی گہری نگاہ رکھے۔ قادر بخش وسیم اور تابندہ کی طرف سے مطمئن نہیں تھا۔ لاکھو پہلے اپنے فائدے کی خاطر وسیم کے لئے کام کر رہا تھا اور اب اس کے خلاف سرگرمِ عمل تھا۔ دراصل لاکھو جیسے لوگ کسی کے وفادار نہیں ہوتے۔ یہ

صرف اور صرف اپنے مفاد پر نظر رکھتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر اپنے قریب ترین رشتے کو بھی کٹوا ڈالتے ہیں۔

لاکھو اکثر و بیشتر مناسب موقع دیکھ کر نرگس سے ملنے کے لئے بھی آ جاتا تھا۔ وسیم اور بچوں کو اس کی آمد کی خبر نہیں تھی۔ نرگس کو لاکھو کے دم سے بڑا اطمینان تھا اور وہ اس پر بہت زیادہ انحصار کرنے لگی تھی۔ چنانچہ وہ اسے اپنے اور وسیم کے درمیان ہونے والے جھگڑوں کے بارے میں بھی بتاتی رہتی تھی۔ نرگس نے اقرار کیا کہ آخری دنوں میں ان کے درمیان کشیدگی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی بلکہ ایک روز تو وسیم نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ نرگس کو طلاق دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تابندہ کے پاس چلا جائے گا۔

اس موقع پر نرگس سے ایک سنگین غلطی ہو گئی۔ اسے خوش اسلوبی سے اس معاملے کو ٹیکل کرنا چاہئے تھا یا پھر فوری طور پر اپنے باپ کو وسیم کی ''دھمکی'' سے آگاہ کر دیتی۔ لیکن اس نے اپنے ''غمگسار'' لاکھو کے ذہن اور دل کا بوجھ ہلکا کر لیا۔ لاکھو کے شیطانی ذہن میں ایک فتنہ پروری جاگ اٹھی اور نرگس کو اس نے یہ کہتے ہوئے اپنے سنگین خیالات سے آگاہ کر دیا کہ ادی! اس طرح سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی سلامت رہے گی۔''

نرگس نے جلاپے اور جوشِ انتقام میں مزید حماقت کا ثبوت یہ دیا کہ لاکھو کی پلاننگ پر عمل کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا۔ اس خطرناک منصوبے کے مطابق لاکھو نے فون کر کے تابندہ کو ایف سی ایریا سے محمود آباد پہنچانا تھا۔ اس وقت نرگس گھر پر موجود نہ ہوتی۔ لاکھو کو جائے واردات کے آس پاس ہی موجود رہنا تھا۔ جب تابندہ مطمئن یا غیر مطمئن ہو کر واپس چلی جاتی تو لاکھو نرگس کو اس کے بارے میں بتا دیتا۔ وہ گھر آتی اور خاموشی سے اپنے شوہر کا کام تمام کر دیتی۔ فائرنگ کو بے آواز بنانے کے لئے لاکھو ہی نے اسے سائلنسر بھی مہیا کیا تھا۔ وہ گھر میں رکھے ہوئے وسیم کے ریوالور سے واقف تھا۔

پھر سب کچھ لاکھو کے شیطانی منصوبے کے عین مطابق ہوا۔ نرگس وسیم کو مرا ہوا تو دیکھ سکتی تھی مگر یہ اسے گوارا نہیں تھا کہ وہ اسے طلاق دے کر اس کی سوتن کا ہو جائے۔ جذبۂ انتقام دراصل احساسِ محرومی سے جنم لیتا ہے اور اگر انسان کے آس پاس لاکھو جیسے شیطان صفت افراد موجود ہوں تو پھر اس جذبے کو وہ ہوا ملتی کہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ نرگس بری طرح تباہ بھی ہوئی تھی اور برباد بھی۔

نرگس سزا سننے کے بعد جب جیل کی گاڑی کی طرف جا رہی تھی تو میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے پوچھ لیا۔

''اے نادان اور بے وقوف عورت! تم نے اپنے شوہر کو کیوں قتل کیا؟''
اس نے ایک جھٹکے سے گردن گھما کر میری جانب دیکھا اور مزید حماقت کا ثبوت دیتے ہوئے بڑے فخریہ لہجے میں بولی۔ ''تمہاری مؤکل نے عارضی طور پر مجھ سے میرا شوہر چھین لیا تھا۔ دیکھ لو، میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسے شوہر سے محروم کر دیا ــــــ حساب برابر ہو گیا۔''

بات ختم کرتے ہی وہ جیل کی گاڑی کی سمت بڑھ گئی۔ لاکھو کو اس سے پہلے ہی گاڑی کے اندر بٹھایا جا چکا تھا۔ میں کافی دیر تک نرگس کے الفاظ پر غور کرتا رہا لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ حساب کیسے برابر ہو گیا۔

وہ آتشِ انتقام کو سرد کر کے جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلی گئی تھی لیکن ان دو معصوم جانوں کا کیا قصور تھا جنہیں زندگی بھر کے لئے باپ کے سائے سے محروم ہونا پڑا؟

میں حساب میں خاصا کمزور ہوں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ نرگس کے فلسفے پر غور فرمائیں اور اگر ان کی سمجھ میں آ جائے کہ حساب برابر کیسے ہو گیا تو ازراہِ مہربانی مجھے بھی بتا دیں۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آخری پیشی پر عدالت نے میری مؤکل تابندہ کو بے گناہ اور بے قصور جانتے ہوئے باعزت بری کر دیا تھا۔ وہ اپنی بریت پر دھواں دھار روئی تھی۔ عدالت میں موجود افراد اس کے اس ردِعمل پر حیرت زدہ تھے۔ وہ مسکرانے اور خوش ہونے کی بجائے زار و قطار رو رہی تھی۔ ایسا نظارہ کسی نے کاہے کو دیکھا ہوگا۔

وہ خوشی کے نہیں، دکھ کے آنسو تھے۔ پچھتاوے اور محرومی کے آنسو تھے۔ یہ جان کر اس کا دل پھٹ گیا تھا کہ وسیم اس سے سچی محبت کرتا تھا اور زندگی کے آخری لمحات میں وہ واقعی سچ بول رہا تھا۔ اس نے نرگس کو چھوڑ کر صدا کے لئے اس کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

لوگ سمجھ رہے تھے شاید وہ شادیٔ مرگ جیسی کیفیت سے گزر رہی ہے۔ کوئی اس کے دل میں جھانک کر وہاں پھیلنے والی تباہ کاری کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔

یہ آنسو بڑے ظالم اور بے زبان ہوتے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا، خونِ جگر کس کے لئے آنکھوں سے بہہ گیا!

(ختم شد)